

منٹھی میں سمندر



اسماء قادری

مٹھی میں سمندر ہے

حضور ایسا کوئی انتظام ہو جائے
سلام کے لئے حاضر غلام ہو جائے

لان میں ست رفتاری سے جاگنگ کرتا حاشر حسن دادا ابو کے کمرے کے
قریب سے گزرا تو کھلی کھڑکی سے آتی ان کی آواز نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا۔
میں صرف دیکھ لوں ایک بار صبح طیبہ کو
بلا سے بھر میری دُنیا میں شام ہو جائے
الفاظ اور انداز دونوں میں ہی اتنی تڑپ تھی کہ اسے اپنے دل کی دُنیا میں ایک
گونا گوسی تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ کیا واقعی صبح طیبہ کو دیکھنے کی خواہش اتنی شدید ہو سکتی
تھی کہ اس کے حصول کے بعد انسان دُنیا کی ہر خواہش سے دستبردار ہونے کو راضی ہو
جائے۔

ایک سحر زدہ سی کیفیت میں وہ اپنا جاگنگ کا پروگرام اُھورا چھوڑ کر گھر کے اندر
کی طرف جانے کے لئے پلٹا وہ صبح خیز تھا اور روزانہ بڑی پابندی سے جاگنگ کے لئے
قریبی پارک جایا کرتا تھا لیکن آج اسے اپنی طبیعت میں کچھ کسلندی سی محسوس ہوئی، شاید
رات دیر تک جاگ کر منووی دیکھنے کا اثر تھا کہ وہ پارک تک جانے کی ہمت نہ کر سکا،

کافی دیر یونہی بستر پر لیٹ کر کروٹیں لیتے لیتے گزارنے کے بعد وہ گھر کے لان میں ہی جا لنگ کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اب دادا ابو کے کمرے کی کھڑی سے آتی آواز نے اسے اپنا یہ پروگرام بھی اُدھورا چھوڑنے پر مجبور کر کے اپنی طرف پوری طرح متوجہ کر لیا تھا۔

حضورؐ آپ جو سن لیں تو بات بن جائے

حضورؐ آپ جو چاہیں تو کام ہو جائے

حاشر حسن کی اپنے کمرے کے دروازے پر موجودگی سے بے خبر وہ جائے نماز پر بیٹھے بڑے خشوع و خضوع سے اپنی درخواست اس دربارِ رحمت میں درج کروانے میں مصروف تھے۔

حاشر حسن کو ان کے اس درجہ استغراق پر جہاں حیرت ہوئی وہاں ایسے کئی لمحے اس کی یادداشت میں جا گئے لگے جب اس نے دادا ابو کو ڈیڈی کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے دیکھا تھا کہ وہ زندگی میں ایک بار حج بیت اللہ کے لئے جانا چاہتے ہیں۔ ڈیڈی ان کی اس خواہش کو ماننے سے کبھی صاف انکار تو نہ کرتے تھے لیکن ان کے پاس نہ جانے کے لئے بھی کئی عذر تھے، کبھی بزنس کی مصروفیات، تو کبھی فیملی میں ہونے والا کوئی اہم فنکشن دادا ابو کی اس واحد خواہش کے آگے دیوار بن جاتا تھا۔ اکیلے دادا ابو کا بھی سفر حج پر جانا ممکن نہ تھا۔ برسوں پہلے ہونے والے فالج کے ایک نے ان کے دائیں بازو کو بالکل ناکارہ کر دیا تھا۔ دائیں ٹانگ میں بھی کافی لنگڑاہٹ آگئی تھی۔ پھر پچھلے دو سال سے وہ انجانا کی تکلیف میں بھی مبتلا تھے۔ کسی حد تک معذور دادا ابو کے لئے اکیلے مناسب حج ادا کرنا ممکن نہ تھا سو وہ ہر سال انتظار کرتے تھے کہ شاید ان کا بیٹا اس بار ان کی خواہش پوری کر دے، اپنی مصروفیات کے دائرے سے نکل کر کچھ دن ان کی نذر کر دے لیکن اب تک یہ خواب خواب ہی تھا۔

حضورؐ آپ جو چاہیں تو کچھ نہیں مشکل

سمٹ کے فاصلہ یہ چند گام ہو جائے

ان کے لہجے میں یقین تھا اور چہرے پر انکسوں کی روانی، آنسو بہہ بہہ کر ان کی سفید براق داڑھی میں جذب ہو رہے تھے، وجود پر لرزہ سا طاری تھا۔ ان کی انتہائی کیفیت کو محسوس کرتا حاشر حسن خود کو ان کی طرف بڑھنے سے نہ روک سکا۔ وہ اپنے شانوں پر اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے پلٹے تھے۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں حیرانی اور خوشی کے تاثرات بیک وقت جھلکے تھے۔

”حاشر بیٹا! تم یہاں میرے کمرے میں...؟“ جذبات کی شدت نے انہیں آگے کچھ نہ کہنے دیا تھا۔

ان کے قریب ہی گھٹنوں کے بل بیٹھتا حاشر حسن، ان کی حیرت کو محسوس کرتا اپنی جگہ شرمندگی سے کٹنے لگا، اپر کلاس کے بہت سے گھروں کی طرح ان کے گھر میں بھی بزرگوں کو الگ تھلک رکھنے کا رواج رائج تھا۔ نہ وہ لوگ اپنی محفلوں میں دادا ابو کو شریک کرتے تھے اور نہ کبھی خود ان کے پاس بیٹھ کر چند گھنٹیاں گزارنے کے روادار تھے۔ اپنی محفلوں میں انہیں شامل کرنے کا مطلب تھا کہ ارد گرد کے لوگوں سے اپنا منہ اڑوایا جائے۔ ایسے ہر موقع پر دادا ابو اپنے پند و نصائح کی پٹاری کھول کر بیٹھ جاتے تھے، عورتوں اور مردوں کا بے حجاب ملنا، روپے کا بے دریغ استعمال اور سب سے بڑھ کر کھلے عام کی جانے والی سہ نوشی انہیں مشتعل کر دیا کرتی تھی۔ ارد گرد کے لوگوں کا خیال کئے بغیر وہ اپنی تقریر شروع کر دیتے تھے۔ ان کی باتوں کو سن کر کچھ لوگ تو ان کا مذاق اڑانے لگتے اور کچھ آئینہ دکھائے جانے پر برہم ہو کر محفل سے واک آؤٹ کر جاتے۔ دونوں ہی صورتیں ان کے بیٹے اور بہو کے لئے نہایت ناخوشگوار تھیں۔ چنانچہ آہستہ آہستہ انہیں ایسی محفلوں سے دُور رکھا جانے لگا۔ نوکروں کو سخت ہدایت تھی کہ وہ ایسے کسی موقع پر اپنے کمرے سے باہر نہ نکلنے پائیں۔ مالکان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ملازمین ایسے مواقع پر ان کے کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر دیتے تھے۔ شروع شروع میں وہ خود پر عائد کی جانے والی اس پابندی پر بہت برہم ہوئے لیکن پھر اپنی برہمی کا کوئی فائدہ نہ ہوتے دیکھ کر مصالحت اختیار کر لی۔

اب وہ مکمل طور پر گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اپنے ارد گرد ہونے والے تماشاؤں سے انہیں کوئی سروکار نہ رہا تھا۔ دل میں اگر کوئی تنہا زندگی تھی تو بس یہی کہ ایک بار درحسب پر حاضری دے دیں۔ وہاں برستی رحمتوں کی برسات سے اپنے وجود پر لگے گناہوں کے داغ دھولیں پھر چاہے زندگی روٹھ جائے۔

اپنی جوانی کے دنوں میں وہ ایک ٹھیک ٹھاک سوشل شخص تھے، جدی پشتی بزنس کو سنبھالنے، گھر، بیوی اور پھر اولاد کی مصروفیات نے انہیں کبھی اللہ کو خود سے اتنا قریب محسوس ہونے کا موقع فراہم نہ کیا تھا جتنا بیوی کی موت اور پھر خود پر ہونے والے فالج کے حملے نے فراہم کیا۔

ایک عضو معطل کی طرح اپنے کمرے کی تنہائی میں پڑے پڑے انہوں نے قرآن پاک کا ترجمہ بمعہ تفسیر کئی بار پڑھا، اسلامی زندگی اور اسلام کے رہنما اصولوں پر مبنی بے شمار کتب ان کے زیر مطالعہ آئیں۔ اپنی عمر بھر کی غفلت اور دین سے دوری پر نادم وہ اب پوری طرح اللہ کے ساتھ مشغول ہو گئے تھے۔ لیکن بار بار یہ وہم پریشان کرتا کہ ”نہ جانے عمر بھر کے گناہوں کی معافی مل بھی سکتی ہے کہ نہیں۔“ اور انہیں گناہوں کو بخشوانے ایک بار وہ اس کے دربار میں حاضر ہونا چاہتے تھے۔

”دادا ابو.....! اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے ساتھ حج پر چل سکتا ہوں۔“
حاشر حسن کی بات نے ایک ہل کو ان کے چہرے پر استعجاب کی کیفیت پیدا کی تھی اور پھر ان کا چہرہ فرط مسرت سے چمکنے لگا تھا۔ ابھی اس دربار میں درخواست دائر کئے انہیں دیر ہی کتنی ہوئی تھی کہ وہاں سے انتظامات کی منظوری بھی ملنی شروع ہو گئی تھی۔ وہ حاشر حسن کے وجود کو یکسر فراموش کئے بے اختیار ہی اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو گئے تھے۔

☆☆☆

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا حاشر.....! یہ کوئی عمر ہے ایسے کاموں کی.....؟ جب ساٹھ ستر برس کے ہو جاؤ تو پھر اس قسم کے شوق پالنا شروع کر دیتا۔ فی الحال تو تمہیں صرف اپنے کیرئیر پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ پہلے دنیا میں کوئی مقام بنا

لو پھر یہ سب سوچنا۔“ بیگم حسن ریاض حاشر حسن کی بات سن کر یکدم ہی مشتعل ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا توس واپس پلیٹ میں بیٹھتے ہوئے اسے بے نقط باتیں سنانا شروع کر دی تھیں۔

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی مگر آپ مجھے طعنہ دیں۔ میں صرف دادا ابو کو اپنے ساتھ حج پر لے جانے کی بات کر رہا ہوں۔ اتنے سالوں سے وہ ڈیڈی سے یہ فرمائش کر رہے ہیں۔ ڈیڈی اپنی مصروفیت کی وجہ سے ان کی خواہش پوری کرنے کی پوزیشن میں نہیں لیکن میں تو ابھی کچھ عرصے میں فائنل ایئر کے ایگزیکٹو دے کر فارغ ہو جاؤں گا۔ اگر میری فراغت کے یہ دن دادا ابو کے کام آجائیں تو اس میں کیا حرج ہے.....؟“ ان کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر حاشر حسن نے اپنی چائے میں چینی ملائے ہوئے نہایت اطمینان سے جواب دیا تھا۔ ٹیبل پر موجود دیگر لوگ بھی ماں بیٹے کی بحث سے بے نیاز اپنے اپنے ناشتے کی طرف متوجہ تھے۔

”ایگزیکٹو کے بعد کی فراغت اس لئے نہیں ہوتی کہ اسے تم اپنے کسی ایڈونچر میں ضائع کرنے کے بارے میں سوچو۔ ایک لاکھ ایسے کام ہیں جو تم اپنی فراغت کے اس عرصے میں کر سکتے ہو۔ سب سے بڑھ کر تو تمہارے ڈیڈی کا بزنس ہے جسے وقت دے کر تم کچھ نہیں تو تھوڑا سا تجربہ بھی حاصل کر لو گے۔ یوں بھی ایک نہ ایک دن تم ہی لوگوں نے اس بزنس کو سنبھالنا ہے۔ اگر آج اس کے بارے میں کچھ جان لو گے تو کل کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔“ وہ ہر ممکن طریقے سے اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”بزنس کی بات تو آپ مجھ سے کیا ہی نہ کریں، میں نے میڈیکل کی ہف تعلیم میں اتنے سال اس لئے نہیں کھپائے کہ بیٹھ کر اسٹاک ایکسچینج کی بدلتی صورت حال پر تبادلہ خیال کروں یا کریڈٹ اور ڈیبٹ کے مسائل کو سمجھوں۔ بزنس ڈیڈی کا ہیڈک ہے اسے ان ہی تک محدود رہنے دیں۔ اگلے چند سالوں میں عاشر اپنی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہیں سپورٹ کر لے گا۔“ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وہ بزنس کے تذکرے پر ہتھے

سے اکٹھا کیا تھا نہ جانے کیوں ایک بزنس مین کا بیٹا ہونے کے باوجود اسے اس کام میں کوئی چارم نظر نہ آتا تھا۔

”اوکے اوکے.....! مت لو تم بزنس میں انٹرنسٹ لیکن یوں بے جا مشقت میں اپنا وقت ضائع کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہو.....؟ تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کہ سعودی عرب کا موسم کیسا ہے.....؟ مجلس کر رہ جاؤ گے وہاں کی گرمی میں۔ پچھلے سال میری ایک فریڈ کے ہر جیٹج کر کے آئے تھے۔ آنے کے بعد گھر والے ہی ان کی شکل نہیں پہچان پا رہے تھے۔ کالی سیاہ رنگت اور ڈبلا پتلا سراپا، اس پر سے سر منڈھا ہوا اور چہرے پر داڑھی۔ کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کبھی ایک خوبصورت اور خوش لباس شخص رہے ہوں گے۔ کم از کم جھیں تو میں اس حلیے میں ہرگز بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ تمہاری جوانی کے دن ہیں یہ کھیلو کو دو عیش کرو۔ ابھی تم نے ایسے کون سے گناہ کر ڈالے ہیں جنہیں بخشوانے کے لئے جارہے ہو.....؟“

”بات گناہوں کو بخشوانے کی نہیں ہے می.....! ایک طرح سے اسے آپ میرا شوق سمجھ لیں۔ میں اپنی چھٹیاں پاکستان سے باہر کسی دوسرے ملک میں گزارنا چاہتا ہوں۔“ ان کی مسلسل بحث نے اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا لیکن پھر بھی وہ انہیں کسی نہ کسی طرح قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اگر بات شوق اور تفریح کی ہے تو اس کے لئے اور بھی دوسری جگہوں کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ، کینیڈا، آسٹریلیا کئی ملکوں میں ہمارے رشتے دار موجود ہیں۔ تم ان میں سے کسی جگہ چلے جاؤ۔“ مزاح بن بھی اتنی آسانی سے قائل ہونے والوں میں سے نہیں تھیں۔ ان کے ساتھ بحث کرنا اور بحث میں جیتنا دونوں ہی ایک طرح سے ناممکن تھے۔ حاشر حسن نے اس بار مدد طلب کرتی نگاہوں سے خاموشی سے چائے کے سپ لیتے حسن ریاض صاحب کی طرف دیکھا۔

”اوکے.....! ٹھیک ہے۔ تم اپنے دادا ابو کے ساتھ جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اپنے اور اپنے دادا کے کاغذات اور جج پر جانے کی درخواستیں آج

میرے پی اے کو دے دینا وہ تمام بندوبست کر دے گا۔“ چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھ کر وہ ٹھوس لہجے میں اس سے کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ قریب کھڑے ملازم نے لپک کر ان کا جریف کیس تھام لیا تھا۔ وہ بڑے بچے تلے قدم اٹھاتے ڈائمنگ روم سے باہر کی طرف جارہے تھے۔ ملازم ان کے پیچھے مؤدبانہ انداز میں چل رہا تھا۔

☆☆☆

”تم مسلمان اس عمارت کے گرد چکر کاٹنے کیوں جاتے ہو.....؟“ انگریزی میں پوچھتے گئے اس سوال پر گاڑی کا لاک کھولتے حاشر حسن نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بلیو جینز اور وائٹ ٹی شرٹ میں ملبوس وہ کوئی سفید فام تھا جو حاشر حسن سے دو قدم پیچھے چھڑی کا سہارا لئے کھڑے دادا ابو سے مخاطب تھا۔ گاڑی کا دروازہ ان لاک کرتے حاشر حسن کی پوری توجہ اس سفید فام اور دادا ابو کی طرف ہو گئی۔

”دیکھیں دادا ابو اس سوال کا کیا جواب دیتے ہیں۔“
”وہ عمارت میرے خدا کا گھر ہے اس لئے۔“ دادا ابو نے بڑی سادگی سے جواب دیا تھا۔

”تمہارا خدا کیا صرف اس عمارت میں ہی رہتا ہے.....؟“ سفید فام کے انداز میں ایک واضح چھین تھی۔

”نہیں.....! وہ تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔“ دادا ابو اس کے لہجے کی چھین سے بے نیاز تھے۔

”تو پھر تم اس عمارت کا چکر کاٹنے کے لئے اتنا روپیہ اور وقت ضائع کر کے اتنی دُور کیوں جاتے ہو.....؟“ وہ شاید کسی غیر مسلم اخبار کا نمائندہ تھا جس نے انہیں اپنے سوالات کی زد پر لے رکھا تھا۔ دراصل اس وقت وہ لوگ سفر جج کے متعلق ایک معلوماتی کلاس لے کر واپس گھر جانے کے لئے گاڑی کی طرف آئے تھے لیکن اب اس آفت ناگہانی سے واسطہ پڑ گیا تھا۔

”اس کا حکم ہے صرف اس لئے۔“ شہادت کی انگلی بلند کرتے، آنکھیں عقیدت سے بند کر کے جس عالم جذب میں دادا ابو نے اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔ جواب کے منظر حاشر حسن اور وہ سفید قام دونوں ساکت کھڑے رہ گئے۔ عقیدت و ایمان کی اس شدت کے آگے کوئی سوال ٹھہر ہی نہیں سکتا تھا۔

”چلو بیٹا.....! اب گھر چلتے ہیں۔“ دادا ابو کی آواز نے اس کا سکتہ توڑا تھا اور اس نے ان کے لئے اگلی نشست کا دروازہ کھولتے ہوئے خود ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کا رخ کیا تھا۔ سفید فارم بھی اس دوران وہاں سے مخالف سمت حرکت کر چکا تھا۔

”آپ نے اس کی بات کے جواب میں کوئی مضبوط دلیل کیوں نہیں دادا ابو.....!“ گاڑی کو ہموار چمکیلی سڑک پر دوڑاتے اس نے ان سے پوچھا تھا۔

”عقیدے کے معاملے میں دلیل سے لوگوں کو خاموش تو کروایا جاسکتا ہے قائل نہیں، اس لئے میں نے اس شخص سے بحث کو فضول جانا اور یوں بھی میں نے اس کے سامنے جو وجہ بیان کی بالکل درست تھی۔ ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے لئے ہی تو وہاں جاتے ہیں پھر جس بات کو اس کا حکم مان لیا جائے، بھلا اسے ادا کرنے کے لئے لوگوں کو وضاحت دینے اور اس کی عقلی توجیہ پیش کرنے کی کیا ضرورت.....؟ وہ مالک ہے اس نے جو چاہا حکم دے دیا ہمارا کام تو صرف اس حکم کو بجالانا ہے فائدہ، عقل، دلیل کی طو مار باندھ کر اسے درست ثابت کرنا نہیں۔ ایمان تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ بندے کے اندر یہ یقین ہو کہ جو کہہ دیا گیا ہے وہی درست ہے۔ کیوں اور کیسے؟ اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔“ ان کے مدغم سے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ حاشر حسن انہیں یہ نہ بتا سکا کہ وہ تو خود حج کو ایک Ritual (رسم) سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتا۔

☆☆☆

”ارے ارے.....! یہ آپ کیا کر رہے ہیں دادا ابو.....!“ انہیں دونوں پیروں

سے جوتے اتار کر بغل میں دباتے دیکھ کر وہ حیرت سے چٹا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے گروپ کے لوگوں پر بھی ایک نظر ڈالی تھی کہ کہیں ان میں سے کسی نے دادا ابو کی یہ عجیب و غریب حرکت تو نہیں دیکھ لی۔ لیکن وہ سب سر زمین مکہ پر قدم رکھتے ہی ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے کٹ گئے تھے۔

”زمین بری طرح تپ رہی ہے دادا ابو.....! آپ کے پاؤں جھلس جائیں گے۔ پلیز جوتے پہن لیں۔“ دبے دبے الفاظ میں اس نے ان سے التجا کی۔ اس کے خیال کے مطابق دادا ابو کی ذہنی رو بہک چکی تھی۔

”تم جانتے ہو حاشر بیٹا.....! کہ مکہ شریف کو کیا اعزاز حاصل ہے.....؟“ اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے بجائے انہوں نے عجیب سی کیفیت میں پوچھا اور پھر اس کی طرف سے جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگے۔

”اس سر زمین مقدس پر پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پاک ہوئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیدائش سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی تک کئی سال اس سر زمین پر گزارے تھے۔ یہاں کی خاک کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش پا چومنے کا شرف حاصل ہے۔ تمہارے خیال میں کیا مجھ جیسا گناہگار شخص اس خاک پاک کو اپنے جوتوں سے روندنے کا حق رکھتا ہے، ہرگز نہیں۔ مجھے تو اپنے قدم بھی اس زمین پر نہیں رکھنے چاہئیں، مجھ جیسے عاصی کو تو سر کے بل یہاں کی گلیوں میں چلنا چاہئے لیکن کیا کروں جسم اور ایمان دونوں ہی اتنے مضبوط نہیں کہ محبت کا حق ادا کر سکیں۔ میری حقیر سی محبت کا یہی حقیر سا عملی مظاہرہ ہے۔ تم مجھے اس سے روکنے کی کوشش مت کرنا۔“ اشک بڑی روانی سے ان کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ حج کو صرف ایک رسم سمجھنے والا حاشر حسن بے بسی سے ان کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ ان کے یہی اشک تو تھے جن کا اسیر ہو کر وہ محی کی بے انتہا مخالفت کے باوجود انہیں حج کروانے لے آیا تھا۔ لیکن اس کے لئے یہ امر بھی انتہائی حیران کن تھا کہ جب سے اس نے انہیں حج پر چلنے کی خوشخبری سنائی تھی ان کے گریہ وزاری میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

”اپنی کسی دیرینہ خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچنے دیکھ کر بھی کوئی شخص اتنا آزرده کیسے ہو سکتا ہے.....؟“ حاشر حسن کو اس سوال کا جواب نہ ملا تھا۔ اس نے اپنے گروپ میں شامل کچھ اور لوگوں کو بھی اس سفر کے دوران بار بار ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن خود اس کے اپنے اندر ایک جامد سناٹا تھا۔ اتنے سارے لوگوں پر چھائی اس سحر انگیز کیفیت کا اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان سب لوگوں کے ساتھ موجود ہوتے ہوئے بھی ان سے بالکل مختلف تھا۔ اسے کسی کی محبت کھینچ کر یہاں نہیں لائی تھی اور نہ ہی اس کے دل میں اپنے کسی گناہ کو بخشوانے کا خیال تھا۔ وہ تو صرف ایک لمحے کی قید میں آ کر دادا ابو سے کیا جانے والا وعدہ نبھانے کی خاطر یہاں آیا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق ٹائٹ کلیمز کی راتیں گزارنے، بے تحاشا ڈرک کرنے، گرل فرینڈز سے ہر طرح کے تعلقات استوار کرنے، بات بے بات جھوٹ بولنے اور ایسے ہی ہزاروں زندگی بھر کے گناہوں کو کعبہ کے گرد چند چکر کاٹ کر اور حرم شریف میں چار سجدے کر کے بخشوانے کا خیال نہایت احمقانہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ سارے لوگ ایک مسور کن فریب کا شکار ہیں اور خدا آسمان کی بلندیوں پر مسند افروز ان کی اس سادہ لوحی پر مسکرا رہا ہے۔

☆☆☆

دھڑ دھڑ دھڑ۔ بیرونی دروازہ پوری شدت سے پیٹا جا رہا تھا۔ بستر پر محو خواب عبادہ بری طرح ہڑبڑا کر اٹھی۔ سر ہانے پڑا دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر پھیلایا اور ابا جی کے کمرے کی طرف رُخ کیا۔ وہ جائے نماز پر قعدہ کی حالت میں بیٹھے تھے۔ ان کے تیزی سے حرکت کرتے ہونٹوں کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ دروازے پر دی جانے والی مسلسل دستک نے انہیں بھی مضطرب کر دیا ہے۔ وہ خود بھی نہایت ہراساں تھی۔ خوف و ہراس کی یہ دولت تو یوں بھی اس کے اکلوتے بھائی نے گزشتہ دو برسوں سے انہیں عطا کی ہوئی تھی۔ پورے دو برس سے ان لوگوں کا یہ حال تھا کہ کہیں پتہ بھی کھڑک جاتا تو وہ سہم کر رہ جاتے۔ لہذا رات کے اس پہر دروازے پر نہایت غیر شریفانہ انداز میں دی جانے والی اس دستک نے تو ان کے دلوں کو سینے کے اندر لرز جانے پر مجبور کر ہی دینا

تھا۔

”دھڑکی زوردار آواز پر مسلسل دی جانے والی دستکوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور گھر کے در و دیوار بھاری بوٹوں کی آواز سے گونج اُٹھے۔“

”السلام علیکم ورحمۃ اللہ.....!“ عبدالمبین صاحب نے بڑی عجلت میں دائیں بائیں سلام پھیر کر نماز ختم کی۔

”اباجی.....! پولیس۔“ عبادہ نے خاکی پنٹ اور سیاہ شرٹ میں ملبوس خوفناک مونچھوں والے اس شخص کو دیکھ کر چیخ ماری اور دوڑ کر ان سے جا ملی۔

”اسلم ٹی ٹی کہاں ہے.....؟“ آنے والے شخص نے عبدالمبین کو گھورتے ہوئے نہایت درشت لہجے میں پوچھا تھا۔

”ہمیں نہیں معلوم۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔“ سہمی ہوئی عبادہ کے گرد اپنا دایاں بازو لپیٹتے انہوں نے جواب دیا تھا۔ عبادہ کے دل کی غیر معمولی دھڑکن اور مکان کے مختلف حصوں میں چیزوں کے اٹھانے پٹھنے کی آوازیں ان کی سماعتوں کو آری کی طرح چیر رہی تھیں۔

”جھوٹ بولتا ہے بڑھا۔“ وہ شخص جو اپنے سینے پر لگے بیج سے علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او ظاہر ہو رہا تھا، حلق کے بل دھاڑا اور ایک زنانے دار تھپڑان کے منہ پر رسید کیا۔

عبادہ کے حلق سے بے ساختہ ہی ایک سسکاری نکلی۔ ہیڈ ماسٹر عبدالمبین جن کو راہ چلتے لوگ سلام کیا کرتے تھے، ان کی اس قدر ذلت کا کبھی وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”اسلم جیسے گندے کیڑوں کو پیدا کر ڈالتے ہو تم لوگ اور پتہ پوچھنے پر صاف انکاری ہو جاتے ہو کہ کوئی تعلق نہیں۔ تمہارا تعلق نہیں اس سے تو کیا.....؟“ وہ اپنی مخصوص پولیس والوں کی زبان میں بات کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو سپاہی راقل تانے مستعد کھڑے تھے۔

جوان بیٹی کے سامنے اتنی گندی گالی سن کر عبدالمبین صاحب کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ ان کی اکلوتی اولاد نرینہ نے انہیں بڑی مشکل میں ڈال رکھا تھا۔ برسوں سے بنائی گئی عزت کی دیوار میں اس کے حوالے سے ملنے والے طعنوں نے بڑے بڑے شکاف ڈال دیئے تھے۔

”چاہے تم یقین کرو یا نہیں، لیکن سچ یہی ہے کہ ہم لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ پچھلے چار ماہ سے میں نے اور میری بیٹی نے اس کی شکل تک نہیں دیکھی۔ اگر تمہیں یقین نہ آتا ہو تو ارد گرد والوں سے پوچھ سکتے ہو۔ کسی نے بھی اسے اتنے عرصے سے یہاں آتے جاتے نہیں دیکھا ہوگا۔“ شریانوں میں خون کے ساتھ دوڑتے غصے کے باوجود بھی ان کا لہجہ مدہم ہی تھا۔

”چلو یقین کر لیتے ہیں تمہاری بات کا۔ لیکن اسلم تو ہمیں ہر حال میں چاہئے۔“ دائیں ہاتھ میں پکڑی چھڑی کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ہولے ہولے مارتا وہ عین عبدالمبین کے مقابل کھڑا تھا لیکن اس کی نگاہیں عبادہ کے صبح چہرے کے گرد طواف کر رہی تھیں۔

”تمہیں اس کی تلاش ہے۔ جیسے چاہے اسے ڈھونڈ نکالو۔ ہمارے لئے تو یوں بھی وہ مر ہی چکا ہے۔“ اس کی نگاہوں سے چھلکتی خباثت نے انہیں بے چین کر دیا تھا۔

”ہر بندے کو ڈھونڈنے کا ہمارا اپنا طریقہ ہے۔ تمہارے بیٹے کو ہم جگہ جگہ چھاپے مار کر نہیں ڈھونڈیں گے بلکہ وہ خود ٹپ کر اپنے بل سے باہر آئے گا۔“ اس کے ارادوں کی خوفناکی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ عبادہ کو اپنے پورے وجود میں سنسناہٹ دوڑتی محسوس ہوئی۔

”خادم حسین.....!“ وہ بغیر پلٹے اپنے پیچھے کھڑے سپاہی سے مخاطب ہوا۔

”نور محمد اور خیر دین سے کہو مکان کی تلاشی ختم کر دیں۔ اسلم ٹی ٹی تک پہنچنے کا راستہ ہم نے تلاش کر لیا ہے۔“

”یس سر.....!“ خادم حسین نامی سپاہی تابعداری سے کہتے ہوئے پلٹا۔ اپنے

اسفر کے لہجے میں پائی جانے والی معنی خیزی اس سے چھپی نہیں رہی تھی۔

”سرفراز.....! بڈھے کو کمرے سے اکیلے نکال کر لے جانے کا دم ہے تیرے بازوؤں میں یا کسی کو تیری مدد کے لئے بلواؤں۔“ اب وہ اپنے پیچھے رہ جانے والے دوسرے سپاہی سے مخاطب تھا۔

”اس چڑی مار کے لئے بھی اگر سرفراز کو کسی کی مدد کی ضرورت پڑے تو بہتر ہے کہ وہ پولیس کی وردی اُتار کر کسی ناچنے والی کے ساتھ کام کرنا شروع کر دے۔“ نہایت رعوت سے جواب دیتا وہ ماسٹر عبدالمبین کی طرف بڑھتا تھا۔

”چل بڈھے نکل کمرے سے۔“ اس نے ماسٹر عبدالمبین کو گدی سے پکڑ کر کھینچا تھا۔

”نن..... نہ نہیں.....!“ وہ بھرپور محنت کر رہے تھے۔

”چھوڑو.....! چھوڑو میرے ابا جی کو۔“ سہمی ہوئی عبادہ بری طرح ان کے ساتھ لپٹی جا رہی تھی۔

”تم بالکل فکر نہ کرو۔ ہم تمہارے ابا جی کو کچھ نہیں کہیں گے۔“ یکدم ہی ایس ایچ او نے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں جکڑا تھا۔ سپاہی سرفراز کے شکنجے میں جکڑا عبدالمبین صاحب کا لاغر وجود اس منظر کو دیکھ کر بری طرح پھڑکا۔ انہوں نے بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے خود کو اس کی گرفت سے نکالنا چاہا لیکن حرام کی کمانی پر پلے اس سائڈ کے سامنے اس مزاحمت کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ وہ بری طرح انہیں دھکیلتا کمرے سے باہر لے گیا۔

”تمہیں اللہ رسول کا واسطہ، یہ ظلم مت کرو، میری مظلوم بچی کو اسلم کی بہن ہونے کی اتنی سخت سزا نہ دو۔“ وہ کمرے کے بند دروازے سے سرکراتے بری طرح ہلکے رہے تھے۔ لیکن اندر موجود شخص سماعتیں رکھتے ہوئے بھی بہرہ تھا۔ بند دروازے کے پیچھے قانون کی وردی میں وحشت و بربریت کا رقص بری طرح جاری تھا۔ بوڑھے بے کس باپ کی فریادوں پر قہقہے لگاتے مزید چار گدھ لپٹائی نگاہوں سے اپنی باری کے

انتظار میں کھڑے تھے۔

☆☆☆

”دادا ابو.....! ہم مسلمان یہاں کیوں آتے ہیں.....؟“ خانہ کعبہ کی سیاہ عمارت پر نظر لگائے وہ کھوئے کھوئے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ دادا ابو نے ذرا سا رخ موڑ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی مختلف سی کیفیت طاری تھی جسے وہ کوئی نام نہ دے سکے۔ پاکستان سے روانہ ہونے سے لے کر مناسک حج ادا کرنے تک انہوں نے ایک بار بھی اس کے چہرے پر ایسی کیفیت نہیں دیکھی تھی۔ ان کے ساتھ مسجد الحرام میں نمازیں ادا کرتے، انہیں دھیل چیر پر خانہ کعبہ کا طواف کراتے، قربانی، حلق (سرمنڈانا) اور رمی (شیطان کو کنکریاں مارتا) کے فرائض انجام دیتے وہ بالکل سپاٹ چہرہ لئے ان کے ہمراہ رہا تھا لیکن اب وہ دیکھ رہے تھے کہ اس سپاٹ چہرے پر کچھ دراڑیں سی پڑنا شروع ہو گئی ہیں۔ ملتزم (حجر اسود اور دروازہ کعبہ کا درمیانی حصہ) سے لپٹ کر دعائیں مانگتے وقت انہوں نے سب سے زیادہ دعائیں اپنے اسی پوتے کے حق میں کی تھیں۔ انہیں اس کے جذبات سے عاری سپاٹ چہرے کو دیکھ کر خوف آتا تھا۔ وہ خوفزدہ تھے کہ کہیں وہ اس مقدس مقام سے کوئی پروانہ نجات لئے بغیر یونہی خالی ہاتھ نہ لوٹ جائے، گناہوں کی جو گھڑی وہ اپنے شانوں پر لاد کر یہاں لایا ہے اس کے بوجھ سے آزاد ہوئے بغیر ہی اپنی سابقہ زندگی میں نہ داخل ہو جائے۔

”دادا ابو.....! پلیز بتائیے ناں کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں.....؟“ انہیں خاموش پا کر پہلے سے ذرا مختلف الفاظ میں اس نے اپنا سوال دہرایا تھا۔

”کیا یہاں آنے کے لئے تمہارے پاس یہ جواز کافی نہیں کہ اللہ عزوجل اپنے بندے کو حکم دیتا ہے حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو.....؟“ اس کے سوال کے جواب میں انہوں نے اس سے سوال کیا تھا۔

”میں آپ کی طرح کا پختہ ایمان رکھنے والا مسلمان نہیں ہوں دادا ابو.....! مجھے عقیدہ کی اس گہرائی سے واسطہ نہیں، جہاں حکم کے آگے ”کیوں“ کا سوال نہ اٹھتا

ہو۔ میں سوچتا ہوں کہ جب خدا ہر پل، ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے تو پھر ہم یہاں اتنی دُور کس کی تلاش میں آتے ہیں۔ یہ سارے لوگ جو یہاں آکر اتنے غرق ہو جاتے ہیں کہ لگتا ہے خدا ان کے ہمراہ ہے وہاں اپنے اپنے دیسوں میں خدا کو حاضر و ناظر جاننے کے باوجود اسے اس طرح سے کیوں محسوس نہیں کرتے.....؟ جیسا یہاں آکر کرتے ہیں۔“ اس کا ذہن یقیناً بری طرح الجھا ہوا تھا۔ دادا ابو ایک گہرا سانس لیتے ہوئے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”تم نے کبھی مری اور نتھیا گلی کے علاقوں میں ہر فکر سے آزاد ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے جوڑوں کو دیکھا ہے حاشر بیٹا.....!“

”جی.....! دیکھا ہے۔“ اپنے سوال کے جواب میں نہایت غیر متعلقہ بات سن کر وہ حیرت زدہ تھا۔

”تمہارے خیال میں کیا وہ لوگ ان مقامات پر جا کر ہی ایک دوسرے سے ملتے ہیں جو انہیں ایک دوسرے کے سوا کسی کا ہوش نہیں رہتا.....؟“

”وہ سارے بھی تو اپنے اپنے محبوب کو اپنے ساتھ لے کر ہی وہاں جاتے ہیں ناں.....! پھر کیا بات ہوتی ہے کہ انہیں اپنے سوا وہاں کوئی اور دکھائی نہیں دیتا وہ بس ایک دوجے میں ہی کھوئے رہتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے بیٹا.....! کہ محبوب کا ہر پل ساتھ ہونا اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اس کے ساتھ کو محسوس کرنا اہمیت رکھتا ہے۔“

”دوسرے بے شمار لوگوں کی موجودگی کے باوجود بھی اپنے درمیان کسی تیسرے شخص کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ان ہی لوگوں جیسا حال یہاں بیت اللہ شریف آنے والوں کا ہوتا ہے۔ اللہ کو ہر پل اپنے ساتھ رکھنے، اس کی موجودگی سے فائدہ اٹھانے کے باوجود وہ تعلق کی اس دُور میں بندہ نہیں پاتے جس میں یہاں آکر بندہ جاتے ہیں، یہاں لاکھوں کے مجمع میں بھی ہر شخص اسے صرف اپنے ساتھ محسوس کرتا ہے، یہاں آکر چاہے وہ اس سے سرگوشی میں بات کریں یا چیخ کر فریاد، انہیں لگتا ہے کہ ان کی آواز اللہ کے سوا کسی نے نہیں سنی اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اللہ کے ساتھ راز و نیاز کرنے

والا ہر شخص صرف اسی کے ساتھ مشغول رہتا ہے۔ اسے اپنے دائیں بائیں، آگے پیچھے لاکھوں لوگوں کے موجود ہوتے ہوئے بھی ایسی تنہائی نصیب ہوتی ہے جو اس کے قلب کو طمانیت اور راحت پہنچاتی ہے۔ اسی راحت کے حصول کے لئے ہم لوگ یہاں بھی آتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہجوم میں موجود ہونے کے باوجود تنہائی میں اپنے محبوب سے ملاقات کا لطف حاصل کریں گے۔ یہاں آکر ہمارے دل کو یہ انوکھی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ وہ ہمارے سوا کہیں اور متوجہ نہیں۔ اس کی ساری عنایتوں اور توجہ کا مرکز ہماری ذات ہے۔ کیا اللہ کی اس بھرپور توجہ کا احساس حاصل کرنے کے لئے لوگوں کا دنیا بھر سے تڑپ تڑپ کر یہاں جمع ہونا تمہارے خیال میں غلط ہے.....؟ اگر ہم اپنے زندگی بھر کے ساتھی کو خود سے قریب ترین دیکھنے کے لئے ادھر ادھر کا سفر کر سکتے ہیں تو پھر اللہ جس کے ہماری ذات پر بے شمار احسانات ہیں، اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے حج جیسی عظیم Ritual کو نبھانے میں کیا حرج ہے.....؟ ان کا انداز نہایت جوشیلا تھا۔

”کیوں“ کے سمندر میں ڈوبتے حاشر حسن کو ان کی دلیل نے سہارا دیا۔

☆☆☆

”شاہ جی تمہیں یاد کر رہے ہیں اسلم.....!“ ٹی وی پر کوئی انڈین فلم دیکھنے میں مصروف اسلم نے رفیق کی آواز پر مڑ کر دیکھا۔ وہ کمرے کے دروازے سے ذرا اندر کی طرف کھڑا تھا۔

”خیریت.....؟ آج شاہ جی کو میری یاد کیسے آگئی.....؟ کہیں کوئی نیا مشن تو درپیش نہیں ہے.....؟“ اسلم نے ریموٹ کی مدد سے ٹی وی کی آواز کم کرتے رفیق سے پوچھا۔ اس کی آواز میں تشویش کی واضح جھلک تھی۔ تین دن پہلے وہ شاہ جی کے حکم پر ایک نہایت اہم کارروائی کر چکا تھا لیکن اطلاعات کے مطابق موقع پر کچھ لوگوں نے اسے شناخت کر لیا تھا اور اب پولیس ہر جگہ اس کی بوسختی پھر رہی تھی۔ ان حالات میں اس کا کچھ عرصہ روپوش رہنا ہی بہتر تھا لیکن اب شاہ جی کے بلاوے سے ظاہر تھا کہ وہ اسے پھر کوئی اہم مہم سونپنے والے تھے۔ وہ شاہ جی کے حکم کو ماننے سے انکار کی ہمت نہیں رکھتا

تھا لیکن پہلی بار وہ اپنے تحفظ کے لئے کچھ فکر مند ہو گیا تھا۔ دراصل تین دن پہلے جن تین لڑکوں کو اس نے قتل کیا تھا ان میں سے ایک کسی ایم این اے کا بیٹا بھی تھا اور اب اس ایم این اے نے شور مچا چا کر پوری حکومت کو ہلا رکھا تھا۔ ایسے حالات میں اس کا منظر عام پر آ جانا کچھ مناسب نہیں تھا۔

”تم خود جا کر شاہ جی سے معلوم کر لو مگر میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں۔“ اسے لگا کہ جواب دیتے ہوئے رفیق نے اس سے نظر چرائی ہو بہر حال مرتا کیا نہ کرتا اسے ہر حال میں شاہ جی سے ملنا تھا سو وہ ٹی وی آف کرتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”آؤ آؤ اسلم.....! یہاں ہمارے پاس بیٹھو۔ ہم تمہیں کچھ اہم لوگوں سے ملوانا چاہتے ہیں۔“ کمرے میں داخل ہوتے وقت شاہ جی کی پرتپاک آواز نے اس کا استقبال کیا۔ ان کے اس انداز پر کچھ چونک کر اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا اور وہاں سے کوئی جواب نہ پا کر کمرے میں موجود باقی دو افراد کا جائزہ لیا۔ وہ دونوں ان کی پارٹی کے نہایت سرگرم رکن تھے۔ بلکہ ان دونوں کو شاہ جی کا دایاں بایاں بازو کہا جائے تو کچھ غلط نہیں تھا۔ دو سال سے پارٹی کے لئے مختلف خدمات انجام دینے کے باوجود اسلم کی کبھی ان سے براہ راست ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اخباروں میں اور ٹیلی ویژن پر نظر آنے والی شاہ جی کی تصویروں کے ساتھ عموماً یہ دو چہرے بھی کافی نمایاں ہوتے تھے۔

”بیٹھ جاؤ اسلم.....!“ چپ چاپ کھڑے اسلم نے شاہ جی کی تحکم بھری آواز پر ایک کرسی کی طرف قدم بڑھائے۔

”اسلم ہمارا نہایت وفادار اور جاٹا کارکن ہے، پارٹی کے لئے اس کی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، کہنے کو اسے ہمارے ساتھ شامل ہوئے صرف دو سال گزرے ہیں لیکن ان دو سالوں میں ہی اس نے اس قدر کارنامے انجام دیئے ہیں کہ لوگ دس دس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود انہیں انجام نہیں دے سکے۔ ہماری تحریک میں اس کی شمولیت نے ہمارے کام کی رفتار کو بے انتہاء بڑھایا ہے۔ عوام کو

ظالموں اور کرپٹ لوگوں سے نجات دلانے کے لئے اس نے جس قدر بڑھ چڑھ کر اپنا رول ادا کیا ہے اگر میں کھل کر اس کی تعریف نہ کروں تو یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔“

اسلم کے چہرے پر چھائی ہوئی الجھن سے بے نیاز وہ ان دونوں کے سامنے اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ وہ دونوں ان کی باتوں کو سن کر بڑی فرمانبرداری سے سر ہلاتے ان کی تائید کر رہے تھے۔ البتہ اسلم ان کے چہروں پر کسی انجان سی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم جانتے ہو اسلم بیٹا.....! کہ جب پاکستان بنا تو اس کے حصول کے لئے سب سے زیادہ قربانیاں نوجوانوں ہی نے دی تھیں۔ اصل میں نوجوان ہی کسی بھی تحریک کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں۔ آج بھی تم کشمیر اور فلسطین میں اپنی کاز کی خاطر لڑنے والے نوجوانوں کو دیکھ سکتے ہو۔ انہیں اپنے مقصد کے حصول کے لئے اپنے گھریاں، ماں باپ، جان اور عزت کسی بھی شے کے لئے کی پرواہ نہیں۔ وہ ہر صدمے کو برداشت کر کے صرف اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔“ ان کے انداز مخاطب نے اسلم کو خوفزدہ کر دیا۔ اسے لگا کہ وہ کوئی نہایت اندوہناک خبر سنانے کے لئے اسے وہی طور پر تیار کر رہے ہیں۔ اس کے اس اندازے کی تصدیق بھی ان کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے اگلے جملوں نے کر دی۔

”تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا ہمیں دلی افسوس ہے اسلم.....! ہم سب تمہارے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ تم وقت کے اس کڑے امتحان میں خود کو کبھی تنہا نہ سمجھنا، پارٹی کا اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ عہدیدار بھی ان لمحوں میں تمہارے ساتھ ہے۔ لیکن آگے کیا کرنا ہے اس کا فیصلہ صرف تم کرو گے۔“ کہنے کے ساتھ شاہ جی نے کچھ اخبارات اس کی طرف بڑھا دیئے۔ کانپتے ہاتھوں سے انہیں تھامتے اس نے سب سے اوپر موجود اخبار کا نام دیکھا۔ وہ چٹ پٹی خبریں شائع کرنے والا شام کا ایک روزنامہ تھا۔ فرنٹ پیج کا جائزہ لیتی اس کی آنکھیں اگلے ہی لمحے صدمے سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ صفحے پر نمایاں طور پر لگی سرخیوں اور تصویروں نے اسے اندر تک اُدھیر

ڈالا تھا۔

☆☆☆

”آج مسجد قبلتین کی زیارت کے لئے چلتے ہیں۔“ دادا ابو کی بات سن کر حاشر حسن نے کھوجتی نگاہوں سے ان کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ اسے اپنی طرف یوں دیکھتے ہوئے پا کر بوکھلا کر ادھر ادھر نظریں گھمانے لگے۔ حاشر حسن نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے ان کے چہرے سے اپنی نظر ہٹائی۔ وہ دادا ابو کو سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔ ان کی کیفیات میں اتنی تیزی سے تبدیلی ہوتی تھی کہ وہ ان کی وجوہات ڈھونڈنے میں ہی ہلکاں ہو جاتا تھا۔

خانہ کعبہ کا الوداعی طواف کر کے وہاں سے رخصت ہوتے وقت وہ یوں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے تھے کہ جیسے کعبہ کا والی ابھی آواز دے کر انہیں روک لے گا اور وہ اس کی آواز پر دوڑتے ہوئے کبھی نہ جدا ہونے کے لئے واپس اس سے جا ملیں گے۔ وہاں سے وداع ہوتے وقت وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے لیکن پھر مدینے کے راستے پر ان کے ساتھ رواں حاشر حسن نے ان کا ٹیکس مختلف روپ دیکھا تھا۔ اسے ان کے انگ انگ میں وصل کی خواہش دیکتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بار بار اپنی نگاہوں سے راستے کے طول و عرض کو ناچتے اور پھریوں مضطرب ہو جاتے کہ جیسے پتہ نہیں یہ دوری ختم ہوگی بھی یا نہیں اور اب جبکہ انہیں مدینہ منورہ پہنچے تیسرا دن تھا وہ روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری کے لئے راضی ہی نہ ہوتے تھے۔ مدینہ پہنچنے کے بعد انہوں نے مسجد قبا، مسجد فتح، مسجد مصلی، حضرت ابو ایوب انصاری، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسن کے گھروں اور دیگر کئی مقامات کی زیارت کر ڈالی تھی۔ لیکن روضہ اقدس پر حاضری کا ذکر سنتے ہی ان کے وجود پر لرزہ طاری ہونے لگتا، وہ یوں کانپ اٹھتے کہ جیسے انہیں دربارِ رحمت میں حاضری کے بجائے کسی مقل کی طرف جانے کا مشورہ دیا جا رہا ہو۔

”کہاں تو آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کو بے تاب تھے اور اب وہاں جانے کا سن کر ہی آنا کافی شروع کر دیتے ہیں۔ آخر یہ سب کیا

ہے دادا!..... کیا چیز ہے جو آپ کو وہاں جانے سے روک رہی ہے.....؟“ حاشر حسن نے کچھ جھنجھلا کر ان سے پوچھا تھا۔

”مجھے وہاں جاتے ڈر لگتا ہے بیٹا!.....!“ انہوں نے نہایت بے بسی سے جواب دیا۔

”ڈر لگتا ہے.....؟ مگر کیوں.....؟“ حاشر حسن کے لہجے میں حیرت تھی۔

”وہ کہتے ہیں ناں بیٹا!..... کہ باخدا دیوانہ و با مصطفیٰ ہشیار باش۔ بس اسی لئے ڈر لگتا ہے۔“ انہوں نے جواب دیا لیکن حاشر حسن کے چہرے پر الجھن کے آثار ہنوز موجود تھے۔

”سمجھا کرو بیٹا!.....! اللہ کے دربار میں تو اگر کوئی بھول چوک ہو جائے تو وہ غفور و رحیم اپنی رحمت سے اسے معاف کر دے گا لیکن اپنے محبوب کی خدمت میں معمولی سی لغزش پر بھی وہ سخت گرفت کر سکتا ہے۔ بس اسی لئے ڈرتا ہوں کہ کہیں کوئی خطا کر بیٹھوں اور جکڑا جاؤں۔“ انہوں نے اپنے گریز کی وضاحت کی۔

”معمولی سی خطا پر پکڑے جانے کا اتنا خوف ہے آپ کو اور جو اس کے محبوب کے دربار میں حاضر نہ ہو کر آپ گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہیں وہ کچھ نہیں.....؟“ ان کے مسئلے کو سمجھتے ہوئے اس نے ان کی دکھتی رگ کو چھیڑا تھا۔ اس کا تیر بالکل نشانے پر لگا۔ وہ نہایت مضطرب ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”سچ کہتے ہو بیٹا!.....! یہ تو مجھ سے بہت بڑی گستاخی ہوگئی۔ میں بہت گناہگار ہوں کہ مدینہ پہنچا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش پر ہوں اور اب سیدھا ان کی خدمت میں حاضر ہونے کے بجائے ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا ہوں۔ تم اچھی طرح وہاں چلنے کی تیاری کر لو بیٹا!.....! میں بھی تیار ہوتا ہوں۔“ جلدی جلدی بولتے وہ اپنا نیا جوڑا نکال کر غسل خانے کی طرف بڑھ گئے تھے۔

اور اب حاشر حسن تیار ہو کر ان کے انتظار میں بیٹھا تھا لیکن ان کی تیاری ختم ہی ہو کر نہیں دے رہی تھی۔ خود کو بے تماشا خوشبو میں بسائے، سفید سوٹ اور خوبصورت

سی ٹوپی کے باوجود وہ اپنی تیاری سے مطمئن نہیں لگ رہے تھے۔

صرف بیس منٹ میں تیاری مکمل کر لینے والا حاشر حسن ایک بار پھر ان احساسات سے دوچار ہونے لگا جو پچھلے دو چار دن سے اس کی ذات کو گھیرے ہوئے تھے۔

☆☆☆

”بدنام زمانہ اسلام ٹی ٹی کے گھر پر رات کے آخری پہر پولیس کا ریڈ۔“

”پولیس اہلکاروں کی اسلام ٹی ٹی کی اٹھارہ سالہ بہن کے ساتھ زیادتی۔“

”اسلام ٹی ٹی کے والد صدمہ کے باعث ہارٹ اٹیک سے چل بے۔“

بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ ہی دور تکین تصویریں تھیں جن میں سے ایک میں ماسٹر عبدالمبین کی میت کا کلوز آپ تھا جبکہ دوسری تصویر میں موجود لڑکی دونوں ہاتھ چہرے کے آگے رکھے خود کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تصویر میں اس کا چہرہ واضح طور پر نظر نہ آنے کے باوجود اسلام کو اسے پہچاننے میں کوئی وقت نہیں ہوئی۔ وہ اس کی چھوٹی بہن عبادہ عبدالمبین تھیں۔ اس نے دشت زدہ اعزاز میں باقی خبر پڑھنا شروع کی۔

”تفصیلات کے مطابق تین دن پہلے قتل ہونے والے ایم این اے شاہد کاظمی کے بیٹے زاہد کاظمی اور اس کے دو ساتھیوں کے قاتل کی حیثیت سے اسلام ٹی ٹی کو موقع واردات کے قریب پائے جانے والے ایک شاپ کیپر نے شناخت کر لیا تھا۔ ایم این اے کے شدید دباؤ کے تحت پولیس نے جب ارد گرد سے معلومات حاصل کیں تو دو دن تک خاموشی اختیار کئے رکھنے والے شاپ کیپر سلطان خان نے موقع واردات کے نزدیک اپنی موجودگی کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ دو یوم قتل ہونے والی قتل کی واردات میں اسلام ٹی ٹی اور اس کے دیگر دو ساتھی ملوث تھے۔ البتہ باقی دو افراد کو وہ شناخت نہیں کر سکا۔ یعنی شاہد کے اس بیان کے بعد پولیس نے متعدد مقامات پر اسلام کی تلاش میں چھاپے مارے لیکن وہ اسے بازیاب کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تمام دن کی ناکامی کے بعد پولیس اہلکار رات کے آخری پہر اسلام ٹی ٹی کے گھر پر چڑھ دوڑے اور

دروازہ توڑ کر مکان میں داخل ہو گئے۔ جہاں انہوں نے اسلم کا پتہ معلوم کرنے کے لئے اس کے بوڑھے والد ماسٹر عبدالحمین پر تشدد اور اس کی اٹھارہ سالہ معصوم بہن جو کہ ایک مقامی کالج میں بی اے پارٹ ون کی طالبہ ہے، کے ساتھ زیادتی جیسی شرمناک کارروائیاں کیں۔ ماسٹر عبدالحمین اس شرمناک واقعہ کو برداشت نہ کر سکے اور موقع پر ہی پارٹ ایک کے باعث چل بسے۔ اہل محلہ نے پولیس کے اس وحشیانہ طرز عمل کی شدید مذمت کی اور واقعہ میں ملوث پولیس اہلکاروں کو گرفتار کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ آخری اطلاعات کے مطابق واقعہ میں ملوث ایس ایچ او سلیم لودھی اور اس کے ساتھی اس واقعہ کے بعد سے روپوش تھے۔“

”اتنی بھیاںک موت ماروں گا میں تجھے اور تیرے ساتھیوں کو سلیم لودھی! کہ تیری آنے والی سلیں تک اسے سن کا کانپ اٹھیں گی۔“ اخبار کو بری طرح دونوں مٹھیوں میں بھینچتے وہ تصور میں ایس ایچ او سلیم لودھی اور اس کے ساتھیوں سے مخاطب تھا۔ ”تم خود کو تنہا نہ سمجھو اسلم! تمہارے ساتھ ہونے والے اس ظلم پر میں اور میری پارٹی کے لوگ چپ نہیں رہیں گے۔ تمہیں انصاف دلانے کے لئے احتجاج، جلے، جلوس، ہڑتالیں، قتل و غارت جو کچھ بھی کرنا پڑا ہم ضرور کریں گے۔ تم صرف ہمارے ورکر نہیں بلکہ ہماری اولاد کی طرح ہو۔ تمہاری خاطر ہم بڑی سے بڑی قربانی بھی دینے کو تیار ہیں۔ پارٹی نے تمہاری خدمات کو نہ تو کبھی فراموش کیا ہے اور نہ ہی کبھی کرے گی۔ تم صرف ایک بار اپنی زبان سے کہو اس ایس ایچ او اور اس کے پھوٹوں کو بھوکے کتوں کے آگے نہ ڈلوا دیا تو ہمارا نام بھی سید اکبر علی شاہ نہیں۔“ شاہ جی جذبات سے بھرپور لہجے میں تقریر کر رہے تھے۔

”نہیں شاہ جی! نہیں۔ وہ اور اس کے پلے اسلم ٹی ٹی کا شکار ہیں اور اسلم انہیں کیسی لرزہ خیز موت سے ہمکنار کرتا ہے یہ آپ بھی دیکھنا اور ساری دنیا بھی دیکھے گی۔“ اس کی آنکھیں غصے اور غم کی انتہا پر پہنچ کر لہو رنگ ہو رہی تھیں۔

”معاف کیجئے گا شاہ جی! نہیں! لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ لوگ کچھ زیادہ ہی

جذباتی ہو رہے ہیں۔ حادثہ بے شک بہت بڑا ہے اور اس کا بدلہ بھی اتنے ہی بڑے پیمانے پر لیا جائے گا لیکن اس کے لئے ہمیں جوش سے نہیں بلکہ ہوش سے کام لینا ہوگا۔“ شاہ جی کے دائیں جانب بیٹھے اشفاق خان نے اچانک ہی مداخلت کی تھی۔

”میری روح کانٹوں پر گھسٹ رہی ہے خان صاحب! اور آپ ہوش کی بات کرتے ہیں!.....؟“ اسلم نے نہایت تلخی سے کہا تھا۔

”اسلم بیٹا!.....! اشفاق خان ہمارا نہایت ذہین بندہ ہے، اگر تم تھوڑا سا حوصلہ کر کے اس کی بات سن لو تو یقیناً یہ تمہیں نہایت مفید مشورہ دے گا۔“ شاہ جی نے اسے سمجھایا تو وہ لب بھینچنے خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”دیکھو اسلم!.....! یہ سچ ہے کہ تم نے پارٹی کے لئے بڑی خدمات انجام دی ہیں اور تمہارا پارٹی پر حق بھی بہت زیادہ ہے لیکن یقیناً تم خود بھی کبھی یہ نہ ہو چاہو گے کہ جس تحریک کو چلانے اور کامیاب بنانے کے لئے تم نے دن رات کوششیں کیں اس پر کوئی آنچ آئے، تم نے جو کچھ کیا وہ پارٹی کی خاطر اور اب تمہیں جو کچھ سہنا پڑ رہا ہے وہ بھی پارٹی ہی کی وجہ سے ہے لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جس پارٹی اور تحریک کی خاطر اتنی قربانیاں دی گئیں، کیا اسے صرف ایک انتقام کی خاطر تباہ کیا جاسکتا ہے!.....؟ کیا تم برداشت کر سکو گے کہ صرف تمہارے غصے کی آگ بجھانے میں پارٹی کا وجود ختم ہو جائے!.....؟“

”آخر آپ مجھ سے کہنا کیا چاہتے ہیں خان صاحب!.....! جو کچھ کہنا ہے کھل کر بتائیں۔“ اشفاق خان کی تمہید نے اسے اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

”اشفاق اور میرا خیال ہے کہ ان حالات میں جبکہ تمہارا نام تین افراد کے قتل کے سلسلے میں واضح طور پر عوام کے سامنے آچکا ہے، پارٹی وقتی طور پر تم سے اپنی لاطعلق کا اعلان کر دے ورنہ اس کے اثرات آئندہ انتخابات پر پڑیں گے، اگر ایک بار ہماری ساکھ خراب ہوگئی تو ہمارا ووٹ بنک ٹوٹ جائے گا اور اتنا بڑا نقصان اٹھانے کی پارٹی کسی بھی صورت میں متحمل نہیں ہو سکتی۔“ بڑی دیر سے خاموش بیٹھے عامر مرزا نے ان کی گفتگو میں

سرشاری کسے کہتے ہیں اس بات کو حاشر حسن نے روضہ مبارک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنہری جالی کو تھام کر کھڑے دادا ابو کو دیکھ کر جانا تھا۔ سرور، محبت، عقیدت کا نہ جانے کون سا مقام تھا کہ حاشر حسن سر جھکا کر، سنہری جالی کو تھامے ساکت کھڑے دادا ابو کی روح کو محو قفس محسوس کر رہا تھا۔ ان کے قدم مضبوطی سے زمین پر جتے تھے لیکن پھر بھی وہ اسے حال کھیلنے محسوس ہو رہے تھے۔

مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے ”ریاض الجنۃ“ کے حصہ میں نوافل ادا کئے تھے اور پھر روضے پر حاضری کے لئے بڑھے تھے۔ اس پل دادا ابو کے ساتھ چلتے حاشر حسن نے دیکھا تھا کہ ان کے پیروں میں کوئی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی، وہ ہاتھ میں پکڑی چھڑی اور ساتھ چلتے حاشر حسن دونوں ہی کے سہارے سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ ان کے قدم گویا زمین پر نہیں ہوا میں پڑ رہے تھے۔ وہ ایک سبک رفتار پرندے کی طرح گویا اپنی منزل کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ ڈر، خوف، جھجک کی ہر کیفیت سے آزاد وہ صرف محبوب سے وصال کے خوش کن خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ ایک سلام جسے کرنے کے لئے انہوں نے برسوں حاضری کی اجازت طلب کرتے حالت دُعا میں گزارے تھے، اب اسے ادا کرنے کا وقت آ گیا تھا تو پھر کیوں نہ ان پر سرور طاری ہوتا۔

حاشر حسن کو یکدم ہی اپنے آپ سے تعفن اٹھتا محسوس ہوا۔ یہاں موجود بے شمار لوگوں میں سے شاید وہی واحد تھا جس نے زندگی میں کبھی اس سعادت کو حاصل کرنے کی خواہش نہیں کی تھی جو بغیر کسی طلب اور عقیدت کے اتنے بڑے دربار میں حاضر ہو گیا تھا اور اب اپنی یہاں موجودگی پر شرمندہ تھا۔ اس کے خیال میں تو اس جیسا کردار اور اعمال رکھنے والے شخص کو تو اس چوکھٹ پر قدم دھرنے کی ہمت ہی نہیں ہونی چاہئے تھی۔ وہ جگہ جہاں حاضر ہوتے دادا ابو جیسے متقی اور عبادت گزار شخص کانپ کانپ گئے تھے، وہاں داخل ہوتے وقت حاشر حسن جیسے شخص کے دل کو تو خوف سے پھٹ ہی جانا چاہئے تھا۔ اسے یکدم ہی خود پر افسوس ہونے لگا کہ اس نے اپنے سارے گناہ کعبہ

مداخلت کی تھی۔

”کیا مطلب.....؟ کیا مجھ پر پڑنے والے اس مشکل وقت میں آپ لوگ میرا ساتھ چھوڑ دیں گے.....؟“ وہ نہایت صدمے سے بولا تھا۔

”تم نے شاید میری بات غور سے نہیں سنی۔ میں نے صرف وقتی لافلتی کا ذکر کیا ہے۔ یوں بھی یہ لافلتی صرف ظاہری ہوگی لوگوں کو یہ بتانے کے لئے کہ اس واردات سے ہماری پارٹی کا کوئی تعلق نہیں لیکن درون خانہ ہم تمہارے ساتھ ہی ہوں گے۔ سلیم لودھی کی تلاش اور اس کے انتقام کے سلسلے میں تم جس طرح چاہو پارٹی کے وسائل استعمال کر سکتے ہو لیکن یہ سب خفیہ طور پر ہوگا۔ ظاہری طور پر ہم لوگوں پر یہی ظاہر کرتے رہیں گے کہ تمہاری بے راہ روی کی وجہ سے عرصہ ہوا پارٹی تمہیں خود سے علیحدہ کر چکی ہے اور ہم تمہارے ہاتھ سے سرزد ہونے والے کسی جرم کے ذمہ دار نہیں۔ البتہ تمہاری بہن کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر پرزور احتجاج کیا جائے گا۔ اس معاملے میں ہم حکومت کو بری طرح ہلا کر رکھ دیں گے اور چونکہ یہ ایک انسانیت سوز واقعہ ہے اس لئے اس سلسلے میں کیا جانے والا ہمارا احتجاج تمہاری ہمدردی کے بجائے اخلاقیات کے زمرے میں آئے گا۔ رہ گیا تمہارا پارٹی سے تعلقات کا معاملہ تو جو کام تم ہمارے لئے پہلے برسر عام ہمارے نام پر کرتے تھے، آئندہ خاموشی سے انجام دیتے رہنا۔ بدلے میں تمہیں زندگی کی ہر سہولت ملتی رہے گی۔“ عامر مرزا نے اپنا سارا پلان ان کے سامنے رکھ دیا تھا جبکہ شاہ جی اس دوران بالکل خاموش بیٹھے تھے۔

”اور میری بہن.....؟ اس کا کیا ہوگا.....؟“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ پارٹی میں ایسے جانثار نوجوانوں کی کمی نہیں جو شاہ جی کے ذرا سے اشارے پر بخوشی اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے پر راضی ہو جائیں گے۔“ اس بار جواب اشفاق خان کی طرف سے آیا تھا۔ یقیناً اسے یہاں بلانے سے پہلے ہی وہ لوگ ہر سوال کا جواب تلاش کر چکے تھے۔ ناچار اسے بھی اثبات میں سر ہلانا پڑا۔

شریف کی حاضری میں کیوں ناں بخشوائے۔ اگر اوروں کی طرح وہ بھی وہیں اپنے کندھوں پر رکھی گناہوں کی گٹھڑی سے نجات حاصل کر لیتا تو اب اس گٹھڑی سے اٹھتی بدبو اس کے اعصاب کو مختل نہ کرتی۔ اپنے کپڑوں پر لگائے گئے عمدہ ترین عطر کے باوجود اسے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے وجود سے اٹھتا تعفن ارد گرد موجود لوگوں کی قوت شامہ محسوس کر رہی ہوگی۔ قریب تھا کہ اس احساس کی شدت سے گھبرا کر وہ وہاں سے بھاگ اٹھتا کہ اس نے دادا ابو کے وجود کو لہرا کر زمین پر گرتے دیکھا۔ ارد گرد موجود شرطوں کے لپک کر ان تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ ان پر جھک گیا تھا۔ اس کی انگلیوں نے ان کی کلائی اپنی گرفت میں لے کر زندگی کو محسوس کرنا چاہا تھا اور پھر وہاں چھائی خاموشی کو محسوس کر کے اس نے اپنی حیات ان کے دل کی دھڑکنوں کی طرف مبذول کی تھیں لیکن وہاں بھی ایک جامد سناٹا تھا۔ ان کے دل کی سرزمین عقیدت و جذبات کے طوفان سے سنسنے کے بعد اب بالکل خاموش اور پرسکون تھی۔

اور پھر وہ لوگ انہیں وہاں سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ حاشا حسن سن دماغ کے ساتھ ان لوگوں کے ساتھ قدم بڑھا رہا تھا۔ وہ ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر اچھی طرح جانتا تھا کہ دادا ابو کی اس کیفیت کا نام موت ہے۔ میڈیکل سائنس کی نظر میں وہ اس دنیا سے منہ موڑ چکے ہیں لیکن دراصل تو انہوں نے وصال کی مے چکھی تھی۔ ان کے تن من میں جو عشق کی آگ لگی تھی اسے بجھانے کو محبوب نے انہیں خود اپنے پاس بلا لیا تھا۔

میں صرف دیکھ لوں ایک بار صبح طیبہ کو

بلا سے پھر میری دنیا میں شام ہو جائے

حاشا حسن کے کانوں میں نعت کے اشعار گونج رہے تھے۔ دادا ابو نے اپنی جان کے بدلے صرف ایک بار صبح طیبہ دیکھنے کا جو سودا اللہ سے کیا تھا وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

”بھائی.....! رک جاؤ۔ پلیز بھائی.....! مت جاؤ۔“ برق رفتاری سے گھر کے

بیرونی دروازے کی طرف جاتے اسلم کی کلائی پکڑ کر عبادہ عبدالمبین نے التجا کی تھی۔ اسلم چند پل کے لئے اس کی التجا پر ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس کی موٹی موٹی غزالی آنکھوں میں ڈھیروں آنسو ٹھہرے ہوئے تھے اور آنسوؤں کے اس سمندر میں بس ایک ہی التجا ہلکورے لے رہی تھی کہ وہ اپنا ارادہ بدل لے اور گھر چھوڑ کر جانے کا خیال دل سے نکال دے لیکن اپنی چپیتی چھوٹی بہن کی یہ بات ماننا اس کے لئے ممکن نہ تھا سو وہ اس سے نظر چرا گیا اور ہولے سے اس کا سر تھپتھپاتا گھر سے باہر نکلتا چلا گیا۔

آج اس کی اباجی سے ٹھیک ٹھاک بحث ہوئی تھی۔ انہیں اس کی سرگرمیوں پر سخت اعتراض تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ اس جماعت کا ساتھ چھوڑ کر سیدھے سیدھے اپنی پڑھائی پر توجہ دے کیونکہ انہوں نے اسے یونیورسٹی ایم اے کرنے کے لئے ہی بھیجا تھا۔ وہ اسے مستقبل میں کسی سیاست دان کے روپ میں دیکھنے کے ہرگز بھی خواہاں نہیں تھے۔ جبکہ اسلم ان کے خیالات سے بالکل بھی متفق نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایم اے کی ڈگری حاصل کر کے بھی وہ اپنے لئے کوئی اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکے گا۔ اسے بھی اباجی کی طرح کسی اسکول میں ٹیچنگ یا پھر دفتر میں کلرک کرنا ہوگی۔ کیونکہ اچھی پوسٹ کے حصول کے لئے رشوت و سفارش کی ضرورت ہوتی ہے اور اباجی اسے ان دو میں سے ایک بھی شے فراہم نہیں کر سکتے تھے۔ اسلم اباجی کی طرح خالی خولی لوگوں کے ادب سے سلام کرنے پر مطمئن ہو جانے والوں میں سے نہ تھا۔ اسے اپنے لئے کوئی اونچا مقام، بڑا سا گھر اور ایسی سی گاڑی چاہئے تھی اور اس سب کے لئے تعلقات کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ جب یونیورسٹی جوائن کرنے کے کچھ عرصے بعد ہی ایک مشہور سیاسی جماعت کی طلبہ تنظیم نے اسے اپنے ساتھ شمولیت کی دعوت دی تو وہ فوراً ہی اس دعوت کو قبول کر بیٹھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس تنظیم ہی کی بنیاد پر کئی لوگوں کو ان کی قابلیت سے بھی زیادہ اچھی جائز مل چکی ہیں اور پھر وہ جو صرف اپنے مقصد کے حصول کے لئے تنظیم میں شامل ہوا تھا، تنظیم کے مقاصد کے حصول میں اپنے آپ کو استعمال کرتا چلا گیا۔ تنظیم میں شامل لوگوں کے رویوں، اخلاق، محبت بھری گفتگو، کچھ کر دکھانے کے عزم اور سسٹم کو بدل

ختم ہو جائے گی۔ دراصل وہ برسوں سے اپنے بچوں کے لئے سنگل پیرنٹ کا رول ادا کر رہے تھے۔ ان کی شریک حیات کئی سال قبل دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ بڑی بیٹی ساجدہ کی شادی بھی انہوں نے خود ہی کی تھی اور اس کی کامیاب ازدواجی زندگی نے انہیں یہ اعتماد بخش دیا تھا کہ وہ اپنی اولاد کی بہترین پرورش کر رہے ہیں۔ ان کے سب بچے نہایت باادب اور معاملہ فہم ہیں ایسے میں اسلم کے غلط راہ پر چلنے کا تو وہ گمان بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن پھر ان کا یہ مان جلد ہی ٹوٹ گیا تھا۔

اسلم پہلی بار یونیورسٹی میں ہونے والے دو طلبہ تنظیموں کے تصادم کے دوران گرفتار ہوا تھا۔ اس کے پاس اسلحے کی موجودگی نے جہاں صورت حال کو بہت نازک کر دیا تھا وہیں ماسٹر عبدالمبین کے یقین میں بھی دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ اسلم کو تو اس کے بڑوں کی سفارش پر جلد ہی رہا کر دیا گیا لیکن ماسٹر عبدالمبین کے لئے ذلت، رسوائی، پریشانی اور بے اطمینانی کے دروازے کھل گئے۔ وہ جو ہمیشہ بڑی پرسکون نیند سویا کرتے تھے، راتوں کو چونک چونک کر اٹھنے لگے۔ اسلم ہی کی فکر نے انہیں تہجد گزار بنا دیا تھا۔ لیکن ان کے طویل سجدے اور دعائیں اسے اس کی راہ سے پلٹنے پر مجبور نہ کر سکیں اور بالآخر انہوں نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے اسے اپنے گھر سے بے دخل کر دیا۔ اپنی نیک نامی کو بچانے کا ایک یہی واحد طریقہ ان کے پاس رہ گیا تھا۔

اسلم ابتداء میں جو کام انقلاب، انصاف اور مقصد کے نام پر تنظیم کے لئے کرتا تھا بعد میں پیسے کے حصول کے لئے کرنے لگا۔ اسے اپنی ہر خدمت کا تنظیم کی طرف سے ٹھیک ٹھاک معاوضہ ملتا تھا۔ وہ ان لوگوں کے درمیان رہتے رہتے جان چکا تھا کہ وہ سب اپنی اپنی تجوریاں بھرنے اور اپنی سیاست کی دکان چکانے کے لئے بڑے بڑے نعروں سے عوام کو بے وقوف بنا رہے ہیں لیکن اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا، اس کا اپنا مقصد بھی تو ابتدا سے یہی تھا۔ اسے اپنے لئے بے تحاشا دولت چاہئے تھی جو اسے کسی انقلاب کے ذریعے ملتی یا جرم کی مدد سے، اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ گھریلو باپ اور بہنوں کو چھوڑ کر اس نے اپنے لئے جو راہ منتخب کی تھی اچانک ہی

ڈالنے کی باتوں نے اسے مسحور کر دیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ واقعی یہ لوگ ہمارے حقوق کے لئے سچائی اور خلوص کے ساتھ جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ ظلم اور نا انصافی کو منہ کر حق کا بول بالا کرنے کے دعوے کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ان کا معمول بننا چلا گیا۔ وہ صرف ان کے دماغ سے سوچتا تھا اور ان کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ اس کے زبان پر ان ہی کے سکھائے کلمات کا ورد ہوتا تھا۔

”ظلم کو ختم کرنا ہے تو ظالم ہی کو ختم کر ڈالو، کسی اہل شخص کے لئے جگہ بنانی ہے تو نا اہل کو ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹا دو، اگر کوئی اپنے پیچھے آنے والے کو راستہ نہیں دیتا تو اسے روندتے ہوئے آگے نکل جاؤ۔“ یہ وہ زہریلے خیال تھے جو اس تنظیم کے سربراہوں نے اسلم اور اسلم جیسے کئی نوجوانوں کے دماغ میں بھر دیئے تھے۔ وہ لوگ افہام اور تفہیم کی راہ چھوڑ کر تشدد کو اپنا اوڑھنا پھوننا بنا چکے تھے۔

آئے دن اسلم یونیورسٹی میں کسی نہ کسی دنگا فساد میں مصروف رہتا، مخالف تنظیم کے لڑکوں کو پیٹنا، ذرا ذرا سی بات پر ہنگامہ کھڑا کر دینا اس کا معمول بننا جا رہا تھا۔ یونیورسٹی میں اسلحہ لانے پر سخت پابندی کے باوجود بھی اکثر اس کے ہاتھ میں ایک ٹی ٹی نظر آتی تھی جس کی دہشت نے اس کا دیگر اسٹوڈنٹس پر اچھا خاصا رعب قائم کر دیا تھا۔ اسی ٹی ٹی ہی کی بدولت اس کے نام کے آگے بھی ٹی ٹی کا لاحقہ لگ گیا تھا۔ اب وہ اسلم عبدالمبین کے بجائے اسلم ٹی ٹی کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

شروع شروع میں تو عبدالمبین صاحب کو اس کی سرگرمیوں کی خبر نہ ہوئی لیکن پھر اڑتی اڑتی کئی خبریں ان کے کانوں تک بھی پہنچنے لگیں۔ انہوں نے کئی بار اسے اس کی اس روش پر ٹوکا لیکن وہ ہمیشہ ہی ان کی بات اُن سنی کر دیا کرتا۔ عبدالمبین صاحب خود بھی اس کی اس سیاسی جماعت کے ساتھ وابستگی کو سرسری ہی لیا کرتے تھے۔ ان کے خیال میں جیسے اور بہت سے لڑکوں کا سیاسی تنظیموں کے لڑکوں کے ساتھ معمولی سا اٹھنا بیٹھنا ہو جاتا ہے اسی لئے اسلم بھی محض ایسے لوگوں سے دوستی کی وجہ سے افواہوں کی زد پر ہے اور یونیورسٹی لائف کے خاتمے کے ساتھ ہی اس کی سیاست کے ساتھ یہ وابستگی بھی

اس راہ پر اسے بڑی شدید ٹھوکر لگی تھی۔ اس ٹھوکر سے لگنے والی چوٹ نے اس کی زور تک کو بلبلا کر رکھ دیا تھا اور اب وہ اپنے سامنے آہنی زنجیروں سے جکڑے ایس ایچ اوسلیم لودھی سے اپنی ہر چوٹ کا حساب لینے کو تیار تھا۔ شاہ جی نے اس کی فرمائش پر چوہدر گھنٹوں کے اندر اندر سلیم لودھی کو اس کے سامنے حاضر کر دیا تھا جبکہ اس کے وہ چارور ساتھی جو اس رات اس کے ساتھ موجود تھے، پہلے ہی بڑی بے دردی سے قتل کر دیئے گئے تھے۔

”سنا ہے مرے جا رہے تھے تم اسلم ٹی ٹی سے ملاقات کے لئے۔ لہذا میں نے سوچا کہ تمہاری یہ پریشانی دور کر دوں اور تمہیں بتا دوں کہ اسلم ٹی ٹی کس شخص کا نام ہے۔“ سلیم لودھی کے سر کے بالوں کو ٹٹھی سے جکڑ کر ایک زوردار جھکا دیتے اس نے کہا۔

اس کے لہجے میں پائی جانے والی حیوانی غراہٹ اور لہورنگ آنکھوں نے ایس ایچ اوسلیم لودھی کے وجود میں سردی ایک لہر دوڑادی۔ اسے اپنا انجام بہت واضح نظر آ رہا تھا۔

”کس کی اجازت سے تم نے میرے گھر میں قدم رکھنے کی جرأت کی تھی.....؟“ ہاتھ میں پکڑے خنجر کی نوک اس کے گال پر چھوتے اسلم نے پوچھا۔

”پلیز.....! مجھے معاف کر دو۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ میں اپنی مرضی سے وہاں نہیں گیا تھا۔ مجھے وہاں جانے پر مجبور کیا گیا تھا۔ اگر میں ان کی بات ماننے سے انکار کرتا تو وہ مجھے اور میرے گھر کو تباہ کر ڈالتے۔“ اس رات دلیری سے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا سلیم لودھی بھیگی ملی بنا اسلم کے سامنے رحم کی درخواست کر رہا تھا۔

”کس نے بھیجا تھا تجھے وہاں.....؟“ اسلم نے غرا کر پوچھا۔ ساتھ ہی اس نے تیز دھار خنجر کی مدد سے سلیم لودھی کا دایاں کان کاٹ ڈالا تھا۔ سلیم لودھی کے منہ سے بے ساختہ ہی ایک دلخراش چیخ نکلی اور وہ تکلیف کی شدت سے پھڑکنے لگا۔

”تیرے نالک دیکھنے کا نام نہیں ہے میرے پاس۔ سیدھی طرح میرے سوال

کا جواب دے ورنہ دوسرا کان بھی اڑا دوں گا۔“ اسلم کے روپ میں کوئی درندہ وہاں کھڑا تھا۔

”ایم این اے شاہد کاظمی جس کے بیٹے کا قتل ہوا تھا۔ اس نے تم سے انتقام لینے کے لئے مجھے تمہارے گھر بھیجا تھا۔“ بالآخر اس نے زبان کھول ہی دی۔

”سنارفتی.....! تم نے۔ بیٹے کی جدائی میں پاگل ہو گیا ہے وہ ایم این اے۔ اسی لئے اس نے اسلم ٹی ٹی کو چھیڑا ہے۔ اب وہ وقت دور نہیں جب وہ خود بھی اپنے بیٹے کے پاس پہنچ جائے گا۔“ اسلم نے اپنے ساتھ خاموشی سے کھڑے رفیق کو مخاطب کیا تھا۔

”لیکن پہلے تو مجھے اس ایس ایچ او کو سبق سکھانا ہے۔ وہ حال کروں گا میں اس کا کہ اس کی بوٹی بوٹی میرے آگے دم کے لئے گڑگڑائے گی۔“ اسلم کے سفاک لہجے نے سلیم لودھی کے چہرے کا سارا خون نچوڑ لیا۔

”پلیز.....! پلیز مجھے معاف کر دو۔“ وہ اسلم کے آگے گھکھکیا رہا تھا۔ اسلم نے ہاتھ میں پکڑا خنجر ایک طرف ڈال کر ڈرل مشین سنبال لی تھی۔

”تمہیں اگر مجھ سے بدلہ لینا ہے تو مجھے گولی مار دو، میرے سینے میں خنجر گھونپ دو لیکن پلیز میرے ساتھ یہ سلوک مت کرو۔“ سلیم لودھی نے اس کے ارادوں کو بھانپ لیا تھا چنانچہ زندگی کی التجا کے بجائے آسان موت کی التجا کر رہا تھا لیکن انتقام کی آگ میں جلنے اسلم کی کان اب سلیم لودھی کی آواز کے بجائے اس رات کی گئی اپنے باپ کی فریادیں اور عبادہ عبدالمبین کے بین سن رہے تھے۔ اگلے ہی پل اس نے ڈرل مشین سلیم لودھی کے بازو پر رکھ کر آن کر دی۔ تہہ خانے کی فضا سلیم لودھی کی دلدوز چیخوں سے گونج اٹھی۔

☆☆☆

”دیکھ لو اپنے بھائی کے کارنامے۔ سارے شہر کو اپنے سر پر اٹھا رکھا ہے اس نے۔“ ساجدہ کے شوہر شفقت علی نے ہاتھ میں پکڑا اخبار اس کے سامنے پٹخا۔

اخبار میں ایس ایچ او سلیم لودھی کے بہیمانہ قتل کی خبر چھپی تھی۔ اس کی لاش پچھلی رات ایک کچرا کنڈی پر بوری میں بند پائی گئی تھی۔ لاش کی حالت دیکھنے والے تھرا اٹھتے تھے۔ سلیم لودھی کو کسی گولی یا خنجر کی مدد سے ہلاک نہیں کیا گیا تھا بلکہ بے انتہا تشدد نے اس کی جان لے لی تھی۔ لوگوں کا قیاس یہی تھا کہ قتل کی اس واردات میں اسلم ملوث ہے جس نے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لئے سلیم لودھی کے ساتھ یہ غیر انسانی سلوک کیا ہے۔

ساجدہ بے اختیار ہی دوپٹے کا پلو آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی۔ باپ کی موت اور بہن کے لٹ جانے کا صدمہ بھی کچھ کم نہ تھے کہ بھائی کے وحشی درندہ بن جانے کی خبر بھی دل کو تڑپانے لگی۔

”کس بات کا سوگ منا رہی ہو.....؟ تمہارے بھائی نے تو بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ڈسکے بچ رہے ہیں شہر میں اس کی بہادری کے۔ اتنا غیرت مند بھائی تمہارے سوا کہاں کسی دوسرے کو ملا ہوگا۔“ شفقت علی کے طعنے ساجدہ کے پہلے سے دکھی دل کو مزید چھلنی کئے دے رہے تھے۔ شفقت علی شروع ہی سے ایک تنگ نظر اور تنگ دل شخص تھا لیکن اس کی یہ خامیاں ساجدہ کی معاملہ فہمی اور تدبر کی وجہ سے کبھی اس کے گھروالوں پر ظاہر نہ ہو سکیں اور ماسٹر عبدالحمین ہمیشہ داماد کی طرف سے مطمئن رہے۔ ان کے اس اطمینان کو برقرار رکھنے کے لئے اسلم کی شہرت پھیلنے کے بعد سے ساجدہ نے میکے جانا چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ وہاں جاتی تو شفقت علی ابا جی کو اسلم کے حوالے سے طعنہ دینے سے باز نہ رہتا سو اس نے دل پر پتھر رکھ لیا اور ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے خود پر میکے کی دلہیز حرام کر لی۔ ابا جی خود تو بیٹی کے گھر جانے کے قائل تھے ہی نہیں اس لئے سر داماد کی ملاقات کا کوئی امکان نہ رہا۔ ساجدہ ٹیلی فون پر ہی ان کی خیر خیریت معلوم کر لیتی تھی جبکہ میکے آنے کے سوال کو اس نے گھر اور بچوں کی مصروفیت کی آڑ لے کر ٹال رکھا تھا۔ لیکن جب ایک پرانی پڑوس نے فون کر کے اسے باپ اور بہن پر گزرنے والی قیامت سے آگاہ کیا تو وہ فوراً ہی میکے جانے کے لئے تیار ہو گئی لیکن اس بار شفقت

علی اس کے آڑے آگئے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ اتنے بدنام گھرانے سے اپنا تعلق ظاہر کرنے کو ہرگز بھی تیار نہیں ہیں۔ لہذا ساجدہ کو بھی وہاں جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ بصورت دیگر وہ ساجدہ کو ہمیشہ کے لئے میکے چھوڑنے پر تیار تھے اور یہ صورت بہر حال ساجدہ منظور نہیں کر سکتی تھی۔ ایک بہن کی خاطر وہ شفقت علی جیسے بے حس بندے کے بھروسے پر اپنی تین عدد معصوم اور کم سن بیٹیوں کو چھوڑنے کا خطرہ مول نہ لے سکتی تھی۔ اسے رہ کر اپنے باپ کی بد قسمتی پر رونا آتا تھا جنہیں اللہ تعالیٰ نے تین تین اولادیں نصیب کی تھیں لیکن ان میں سے ایک بھی ان کے جنازے کے سرہانے بیٹھ کر آنسو نہ بہا سکا تھا۔ وہ خود شوہر کی لگائی پابندی میں جکڑی تھی، بھائی نہ جانے کہاں بھٹک رہا تھا اور وہ جو ایک حراماں نصیب باپ کے گھر بیٹھی تھی خود کو پریس اور فوٹو گرافرز کی پہنچ سے بچانے کی کوشش میں اس طرح بے حال تھی کہ اسے خود اپنے ساتھ گزاریے سانچے پر آنسو بہانے کا موقع بھی نہ مل رہا تھا تو باپ کی صورت کو کیا خاک ہی روتی۔ اسے تو اس بات سے بھی کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کے گھر کون سے وزیر اور گورنر افسوس کرنے اس کے پاس آئے تھے، کن کن پولیس افسران نے اسے انصاف کی یقین دہانی کروائی تھی اور کون کون سی سیاسی جماعتیں اور این جی او اس کی حمایت میں نعرے بلند کر رہی تھیں۔ جو کچھ اس سے چھینا جا چکا تھا اس کا مداوا کسی بھی مرہم سے ممکن نہ تھا۔

☆☆☆

”یہ کیا تم ابھی تک پہلا پیگ سامنے رکھے بیٹھو ہو۔ پتے کیوں نہیں اسے.....؟ تم تو اس معاملے میں ہم سب سے آگے ہوا کرتے تھے۔“ گلاس میں موجود محلول کو گھورتے حاشر حسن کو عماد کی آواز نے چونکا دیا تھا۔ آج وہ اس کے بے حد اصرار پر اس کے فلیٹ پر آیا تھا۔ جہاں مزید دو دوست فرقان اور ہارون بھی موجود تھے۔ سعودی عرب سے واپسی کے بعد یہ پہلا دن تھا جو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ یوں اکٹھا ہوا تھا۔ دادا ابو کے بغیر وہاں سے لوٹتے ہوئے اسے اپنا آپ بالکل اُدھورا لگا تھا۔ وہ جیسے اپنی کوئی قیمتی شے وہاں چھوڑ آیا تھا، گھر ماں باپ، بہن بھائی کچھ بھی اسے اٹریکٹ نہیں کر رہا

تھا۔ مئی اور ڈیڈی، دادا ابو کے سلسلے میں تعزیت کرنے آنے والوں کے ساتھ اُلجھے ہوئے تھے اس لئے ان کے پاس بھی اس کے اندر چھائے اس جامد سناٹے کو محسوس کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ پوچھتے بھی تو وہ انہیں کچھ نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اس کی بات سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور پھر وہ انہیں بتاتا بھی کیا۔ اس کے پاس تو روح پر چھائے سناٹے اور جسم سے اُٹھتے تعفن کے احساس کے سوا کچھ تھا ہی نہیں اور بہر حال وہ کسی کو اپنے وجود سے اُٹھتی بدبو کی طرف سے خود سے متوجہ کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا چاہے وہ اس کے والدین ہی ہوتے۔ اسے پتہ تھا کہ اگر وہ کسی سے اس قسم کی بات کرے گا تو اپنا مذاق اڑوانے کے سوا اسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ وہ سارے لوگ اسے نفسیاتی مریض سمجھنے لگیں گے اور بہر حال وہ اپنے بارے میں اس قسم کی باتیں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خود سے ہی اپنے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سفر جج کے دوران اسے نماز کی پابندی کی عادت پڑ چکی تھی اور واپس آکر بھی اس نے اس عمل کو ترک نہیں کیا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ نماز روح کو تازگی بخشتی ہے اسی لئے وہ اسے جاری رکھے ہوئے تھا کہ شاید اپنے وجود پر چھائی بدبو کے احساس سے نجات حاصل کر سکے لیکن اسے اب تک اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا تھا۔

آج جب عماد نے فون کر کے اسے اپنے فلیٹ پر آنے کی دعوت دی تو وہ یہ سوچ کر وہاں چلا آیا کہ شاید سابقہ روٹین دوبارہ جاری کرنے سے وہ نارمل ہو جائے۔ جس طرح پچھلی زندگی میں اسے کبھی کسی قسم کا احساس ندامت اور گناہ نہیں ہوا تھا اب پھر دوبارہ اسی زندگی کو اپنا کر وہ وجود پر چھائے بدبو کے احساس سے نجات حاصل کر سکتا ہے لیکن شراب کا گلاس ہاتھ میں آتے ہی اس کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا تھا۔ گلاس میں موجود مخلول کی ہلکی سی ناگوار بونے اس پر چھائے احساس کو دو چند کر دیا تھا۔ وہ اپنے وجود کو پہلے سے بھی زیادہ تعفن زدہ محسوس کر رہا تھا۔

”کیا ات ہے جگر.....! کیا وہاں کسی شیخ کی بیٹی کو دل دے آئے ہو جو یہاں گرم سم کھوئے کھوئے بیٹھے ہو.....؟“ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے ہارون نے بھی اسے

چھیڑا۔

”نہیں یار.....! ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن آج میرا پینے پلانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ شاید اتنے عرصے میں عادت چھوٹ گئی ہے۔“ بالآخر اس نے ہاتھ میں پکڑا جام واپس ٹرے میں رکھ دیا تھا۔

”اوے ہوئے.....! ہم تو بھول ہی گئے تھے کہ ہمارا شہزادہ نو سو چوہے کھانے کے بعد جج کر کے آیا ہے۔ وہاں رہ کر تو اسے زمزم پینے کی عادت پڑ گئی ہوگی بھلا اب یہ ہم گناہگاروں کے ساتھ بیٹھ کر ایسی حرام چیز کیسے پی سکتا ہے۔“ فرقان کے طنزیہ جملے پر سب ہی ہنس پڑے اور پھر اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ لیکن خود اس کے وجود کو اس جملے نے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

وہ شخص جو چالیس روز تک بلاناغہ زمزم پیتا رہا ہو بھلا اب اپنے اندر شراب سی ناپاک چیز اُتارنے کی جرأت کیسے کر سکتا تھا۔ کئی فٹ پر رکھے جام کی بدبو بہت تیزی سے بڑھنی شروع ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ حاشر حسن کے لئے اسے برداشت کرنا ممکن نہ رہا اور وہ اس بدبو سے نجات کے لئے تیزی سے اُٹھ کر فلیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس وقت اسے پیچھے رہ جانے والے دوستوں کی سوالیہ نظروں اور حیرت کی بھی کوئی پرواہ نہ تھی۔

☆☆☆

”ہیلو حاشر.....!“ چائے کی پیالی منہ کی طرف لے جاتے حاشر حسن کو ایک مترنم سی آواز نے چونکا دیا۔ آج بڑے عرصے کے بعد وہ اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ آیا تھا۔ اس کی ہاؤس جاب شروع ہو چکی تھی۔ سارا دن ڈاکٹر صولت جیسے سخت شخص کی نگرانی میں کام کر کے وہ تھکن سے چور ہو جاتا تھا لیکن اس جسمانی تھکن کا روح میں اتاری تھکن سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ روح کی تھکن نے اسے بے قرار کر ڈالا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی خود کو اپنے سابقہ ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر پا رہا تھا۔ گھر کے در و دیوار تک اسے اجنبی لگنے لگے تھے اور اس اجنبی در و دیوار والے گھر میں شام کے وقت واپس لوٹنا اسے عجیب سی وحشت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اسی وحشت کے ہاتھوں مجبور ہو کر آج بھی وہ شدید

ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا مڈر واقف ہو سکتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے دلکش وجود نے اس کے اندر حشر برپا کر ڈالا تھا۔ اسے سامنے دیکھ کر نہ صرف اس کے ساتھ گزاری رات اس کی یادداشت میں تازہ ہوئی تھی بلکہ اپنی زندگی کی ایسی بے شمار تاریک راتوں کو ایک ایک کر کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ سامنے بیٹھی دلکش وحسین لڑکی کا انسانی پیکر رفتہ رفتہ اس کی نگاہوں کے سامنے سے تحلیل ہونے لگا اور اس نے گناہوں سے بھرے ایک گٹر کی شکل اختیار کر لی۔ اس گٹر سے اٹھتی بدبو کے بھپکے نہایت ناقابل برداشت تھے۔ خود کو کسی نہ کسی طرح وہاں بٹھائے رکھنے کی اس کی ہر کوشش ناکام ہونے لگی۔ ایک عالم وحشت میں اس نے اپنے والٹ سے بغیر گئے کئی نوٹ نکال کر ٹیبل پر ڈالے اور ان دونوں میاں بیوی سے کوئی معذرت کئے بغیر وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ وہ ہر صورت بدبو کے ان بھپکوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

ایم این اے شاہد کاظمی کے گھر سے فرار ہوتے ہی اسے پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے رفیق کو احتیاط سے ڈرائیو کرنے کی ہدایت کر کے اس نے اپنی سماعتوں کو سائرن کی آوازوں پر پوری طرح مرکوز کر دیا۔ جلد ہی اس کے سامنے یہ حقیقت آگئی کہ سائرن کی یہ آوازیں جو چاروں طرف سے آتی محسوس ہو رہی ہیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی ہیں۔ یقیناً وہ لوگ چاروں طرف سے انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”اسلم! پولیس ہمیں گھیر رہی ہے۔“ پچھلی سیٹ پر بیٹھے سرمہ کی آواز سے سنائی دی۔

”لیکن ہم نے سب کچھ نہایت خاموشی سے کیا ہے، پھر پولیس کو کیسے اطلاع ملی.....؟“ سرمہ کے ساتھ بیٹھے فواد کی آواز میں حیرت اور خوف دونوں یکجا تھے یوں بھی وہ ان سب میں نیا تھا۔

”خبری کی گئی ہے ہماری۔“ گاڑی میں اچانک ہی اسلم کی آواز سرسرائی۔

تھکن کے باوجود خود کو گھر واپس جانے پر آمادہ نہ کر سکا اور یونہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے اس کی نظر اپنے اس پسندیدہ ریٹورنٹ پر پڑی تو وہ چائے پینے کے ارادے سے وہاں چلا آیا۔ لیکن سامنے کھڑی روبا کو دیکھ کر اسے اپنے اس فیصلے پر پچھتاوا ہونے لگا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو.....؟ کیا پہچانا نہیں مجھے.....؟“ اس کی نگاہوں کا خالی پن محسوس کر کے روبانے اسے ٹوکا۔ وہ وہاں اکیلی نہیں تھی بلکہ اس کا شوہر مڈر بھی اس کے ساتھ موجود تھا۔ ناچار اسے اپنے چہرے پر ایک نمائی مسکراہٹ لانی پڑی۔

”پلیز.....! ہیو آئیٹ.....!“ ہاتھ سے اشارہ کرتے اس نے انہیں وہاں بیٹھنے کی دعوت دی۔

تم تو ان شارٹ ہیر ز اور Beard (داڑھی) کے ساتھ بھی بہت چارمنگ لگ رہے ہو حاشر.....! کیوں مڈر.....! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں.....؟“ نہایت بے باکی کے ساتھ اس کی تعریف کرتے ہوئے روبانے اپنے شوہر سے بھی اپنی بات کی تصدیق چاہی۔

”تمہارے کسی کے بارے میں دیئے کمینٹس کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتے روبا ڈارلنگ.....!“ مڈر کے نہایت فدیہ انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”ویسے اب تو تمہیں حج سے آئے کافی دن ہو گئے ہیں حاشر.....! اور ابھی تک تم نے اپنا حلیہ تبدیل نہیں کیا.....؟ بڑی حیرت کی بات ہے۔ چلو ہاں تو خیر اپنی پہلی والی لمبائی تک پہنچنے میں کچھ ٹائم لیس گے لیکن کم از کم تم اس Beard سے تو چھٹکارا حاصل کر سکتے تھے۔“ روبا کی بات کا کوئی جواب دینے کے بجائے وہ ویر کی طرف متوجہ ہو گیا تاکہ اسے ان لوگوں کے لئے بھی آرڈر دے سکے۔ یوں بھی وہ روبا کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس کی شرٹ کا حد سے زیادہ بڑا گلا اور عریاں بازو اسے مسلسل نظر چرانے پر مجبور کر رہے تھے۔ حالانکہ روبا کا یہ روپ اس کے لئے بالکل بھی نیا نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو روبا کے حسن کے ہر راز سے بالکل ویسے ہی واقف تھا جیسے اس کے

”مجنری.....؟ لیکن کون کر سکتا ہے ہماری مجنری.....؟ ہمارے آج کے مشن سے تو شاہ جی کے علاوہ کوئی واقف ہی نہیں تھا۔“ رفیق کے حیرت زدہ فقرے نے سب کو سانپ سونگھا دیا۔ سوال کا جواب سوال ہی میں پوشیدہ تھا۔

ایم این اے شاہد کاظمی جو کہ شاہ جی کا بھی سب سے بڑا مخالف تھا، اس پر انتقامی حملہ کرنے کی شاہ جی سے اجازت لینے میں اسلم کو کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ شاہ جی نہ صرف اس بات کے لئے باخوشی راضی ہو گئے تھے بلکہ انہوں نے شاہد کاظمی کے بنگلے پر ایسے انتظامات بھی کروادیئے تھے کہ وہاں موجود گارڈز ان کی راہ کی رکاوٹ نہ بن سکیں۔ شاہد کاظمی کے باورچی کی مدد سے رات کے کھانے میں مددہوشی کی دوا شامل کروانے میں انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ اسلم اور اس کے ساتھ آدھی رات کے بعد جب اس کے بنگلے پر پہنچے تو وہاں انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے انہوں نے شاہد کاظمی کے باورچی کو گولی ماری تھی۔ ان کے پورے منصوبے میں وہی ایک باہر کا آدمی تھا جو ان کا راز فاش کر سکتا تھا۔ پھر اسلم نے بیہوش شاہد کاظمی کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا تھا جس سے ایس ایچ او سلیم لودھی کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ اسلم نے شاہد کاظمی کی وہ زبان کاٹ ڈالی تھی جس سے اس نے سلیم لودھی کو اسلم کے گھر ریڈ کرنے کا حکم دیا تھا۔ پھر وہ لوگ خاموشی سے وہاں سے نکل گئے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ صبح گارڈز کے ہوش میں آنے سے پہلے شاہد کاظمی اور اس کے باورچی کی لاشیں دریافت نہیں ہو سکیں گی اور اس وقت تک اسلم اور اس کے ساتھی شہر سے باہر نکل چکے ہوتے۔ شاہ جی کی ہدایت پر وہ لوگ شہر چھوڑ کر کچھ عرصہ اندرونِ سندھ کسی علاقے میں روپوش رہ کر گزارنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن سپر ہائی وے پر پہنچنے سے پہلے ہی پولیس نے انہیں گھیرنا شروع کر دیا تھا۔

”کسی مزاحمت کی ضرورت نہیں، خاموشی سے گرفتاری دے دو۔“ اسلم نے سامنے نظر آتی پولیس کی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کو دیکھتے ہوئے مشین گن سیدھی کرتے سرمد کو ٹوکا۔

”یہ لوگ ہم سے ہمارے جرائم اُگلوانے کے لئے ہماری ایک ایک بوٹی علیحدہ کر دیں گے اسلم.....!“ سرمد کی آواز میں ہیجان تھا۔ دوسروں پر ہر طرح کا اذیت ناک مارچ کرنے والا خود اس مرحلے سے گزرنے کے خیال سے ہی پسینے میں نہا گیا تھا۔

”انہیں تشدد کی ضرورت نہیں پڑے گی، ہم رضا کارانہ طور پر اپنا ہر جرم قبول کر لیں گے بلکہ دوسروں کے جرائم کی گواہی بھی دیں گے۔“ اسلم کی آواز نہایت سرد تھی۔

”لیک..... لیکن شاہ جی..... شاہ جی تو بھس بھروا دیں گے ہماری کھال میں۔“ فواد خوف سے رو دینے کے قریب تھا۔

”اسلم ٹھیک کہہ رہا ہے دوستو.....! ہمارے پاس اب فرار کی کوئی راہ نہیں بچی۔ اکیلے مرنے سے بہتر ہے ہم ان لوگوں کو بھی ساتھ لے کر مریں جنہوں نے ہمیں اس حال تک پہنچایا ہے۔“ رفیق کا لہجہ بھی اسلم ہی کی طرح تھا۔ اس کی بات سرمد اور فواد کی سمجھ میں بھی آگئی۔ رفیق گاڑی تو پہلے ہی روک چکا تھا۔ وہ چاروں ایک ایک کر کے سر پر ہاتھ رکھے گاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ پولیس کی گاڑیاں بھی ان کے آس پاس رُک چکی تھیں۔

”فائر مت کرنا، ہم گرفتاری دینے کو تیار ہیں۔“ اسلم نے چیخ کر پولیس والوں کو مخاطب کیا لیکن اس کی آواز گولیوں کی ترترزاہٹ میں ڈب گئی۔ وہ لوگ انہیں گرفتار کرنے نہیں آئے تھے، وہ جس کام کے لئے آئے تھے اسے ان کی طرف سے کسی مزاحمت کے نہ ہونے اور بھی آسان بنا دیا تھا۔

☆☆☆

”امی.....! پلیز مت روئیں۔“ جائے نماز پر گھنٹہ بھر سے بیٹھ کر روتی ساجدہ کے ہاتھ تھام کر اس کی آٹھ سالہ بیٹی نے التجا کی تھی۔ گھنٹہ بھر پہلے شفقت علی انہیں نہ جانے کون کون سی خبریں سنا کر اور طعنے دے کر گئے تھے کہ وہ مسلسل روئے جا رہی تھیں۔ ماں کا اس قدر بلکنا بچی سے برداشت نہ ہوا اور وہ باوجود خوفزدہ ہونے کے بھی ان کے قریب چلی آئی۔

”ابو کیا کہہ رہے تھے امی.....! ماموں اور آنٹی پر انہیں اتنا غصہ کیوں آ رہا تھا.....؟“ وہ پوچھ رہی تھی لیکن ساجدہ اس کے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے اسے خود سے چمٹا کر پہلے سے بھی زیادہ شدت سے رونے لگیں۔

آج ان کا میکہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا تھا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق اسلم اور اس کے ساتھی ایم این اے شاہد کاظمی کو قتل کر کے فرار ہو رہے تھے کہ پولیس کی ایک پیٹرولنگ کار نے انہیں دیکھ لیا۔ پولیس کی وارننگ دینے پر وہ لوگ مزاحمت پر اتر آئے۔ مجبوراً پولیس کو بھی جوابی فائر کرنا پڑا۔ نتیجتاً اسلم اور اس کے ساتھی موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ اس ساری خبر میں سچ اور جھوٹ کا تناسب کتنا تھا، اس حقیقت کو چند افراد کے علاوہ کوئی بھی صحیح طرح نہ جانتا تھا۔ اس شہر کراچی کی تاریخ تو یوں بھی ایسے ان گنت واقعات سے بھری پڑی تھی، ایک اسلم اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ہونے والے حادثے کی بھلا کون تحقیق کرتا کہ حقائق سامنے آ پاتے۔

ورثا کے لاش وصول نہ کرنے کی وجہ سے اسلم کی تدفین کے انتظامات ایک ویلفیئر ٹرسٹ نے کئے تھے۔ اکلوتے بھائی کے جان سے گزر جانے کا غم ہی کیا کم تھا کہ اس کے بے نام و نشان دفنائے جانے نے ساجدہ کے دل کو تڑپا ڈالا۔ دوسری طرف عبادہ کا غم تھا۔ اپنے ساتھ گزرے المناک حادثے اور اس پر متزاد تنہائی نے اسے پاگل پن کی حدود میں داخل کر دیا تھا۔ وہ دوبار خودکشی کی کوشش کر چکی تھی۔ دوسری بار تو وہ ایک طرح سے اپنی اس کوشش میں تقریباً کامیاب ہی ہو گئی تھی اگرچہ ماسٹر عبدالحمین کے پرانے دوست اپنی بیگم کے ساتھ اس کی خیریت معلوم کرنے بروقت وہاں نہ پہنچ جاتے تو کلائی پر لگایا گیا اس کا زخم اتنا گہرا ضرور تھا کہ وہ زندگی کی جنگ ہار جاتی۔

اخبارات اور میکے کے قریب رہنے والی ایک پرانی سہیلی کے ذریعے ساجدہ کو وہاں گزرنے والے ایک ایک حادثے کی خبر مل رہی تھی لیکن وہ مجبور تھی۔ اس اُجڑے ہوئے دیار میں اس کی واپسی، وہاں ہونے والے حادثات میں ایک اور حادثے کے

اضافے کے سوا کچھ بھی ثابت نہیں ہوتی۔

☆☆☆

”میں یہ زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ مجھے نفرت ہے اس زندگی سے۔ پلیز مجھے یہاں سے نکالنے میں میری مدد کرو۔“ ریڈ لائٹ ایریا میں ملنے والی اس لڑکی کی بات نے اسے حیران کر دیا تھا۔ وہ وہاں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ رات گزارنے آیا تھا۔ اس لڑکی کو اس نے خود اپنے لئے منتخب کیا تھا گرچہ اس کے ریٹ وہاں موجود سب لڑکیوں سے زیادہ تھے لیکن پیسہ تو حاشر حسن کے لئے کبھی پرانہ رہا ہی نہیں تھا۔ سو اس نے اس ہائی ریٹ لڑکی کو بہت آسانی سے حاصل کر لیا تھا۔ لیکن وہ لڑکی اسے اب تک وہاں ملنے والی تمام لڑکیوں سے مختلف ثابت ہوئی تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ اسے اپنے ناز و ادا سے اپنی طرف راغب کرتی، اس نے تنہائی ملنے ہی اس کے سامنے رونا شروع کر دیا تھا۔

”تم اگر یہاں سے نکلنا چاہتی ہو تو بھلا اس سلسلے میں میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں.....؟“ حاشر حسن کا موڈ اس کی بات پر غارت ہو گیا تھا

”تم..... تم مجھ سے شادی کر لو۔“ لڑکی نے گویا اس کی سماعتوں میں دھماکہ کیا تھا۔

”شادی کر لوں.....؟ وہ بھی تم جیسی لڑکی سے.....؟ تم تو مجھے چند ہزار کے عوض بھی بہت آسانی سے مل سکتی ہو۔“ اس کے لہجے میں حقارت تھی۔ لڑکی جو اس نے خوبصورت چہرے کو دیکھ کر اس کے بارے میں غلط اندازہ لگا بیٹھی تھی، اپنی اس تذلیل پر سرخ پڑ گئی۔ البتہ اس نے اپنی کوشش ترک نہیں کی تھی۔

”میں صرف یہاں سے نکلنے کے لئے تمہاری مدد کی طلبگار ہوں۔ اپنے معزز معاشرے میں تم میرا تعارف اپنی بیوی کی حیثیت سے مت کروانا۔ بلکہ مجھے طلاق دے دینا۔ میں نے کمپیوٹر سائنس میں گریجویشن کیا ہوا ہے۔ ایک بار اگر مجھے یہاں سے رہائی مل جائے تو میرے لئے گزارا کرنا بالکل دشوار نہیں ہوگا۔“

متعارف کروایا تھا۔ اس کے سارے ہی دوست اس سے عمر میں کچھ بڑے تھے۔ ان کا اس علاقے میں آنا جانا تھا اور اٹھارویں سالگرہ کے موقع پر انہوں نے حاشر حسن کو بلوغت کا سٹوفکٹ دیتے ہوئے اس دنیا کی سیر کرائی تھی۔ اس رات حاشر کے حصے میں آنے والی لڑکی کے چار جز بھی انہوں نے ہی ادا کئے تھے۔ حاشر حسن اپنی زندگی کے اس تجربے سے سب سے زیادہ محفوظ ہوا تھا اب بیس سال کی عمر میں وہ اتنا مشاق ہو چکا تھا کہ وہاں کی چالاک سے چالاک لڑکی بھی اسے بے وقوف نہیں بنا سکتی تھی۔ طریقہ نامی اس لڑکی کی باتوں پر بھی وہ بے وقوف بننے کے بجائے محفوظ ہوا تھا۔ اس کے آنسو اور فریادوں نے اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے کی بجائے اس کے اندر کے شیطان کو مزید بھڑکایا تھا اور پھر ایک مشکل لڑکی کے ساتھ رات گزارنے کے پر لطف تجربے کے بعد اگلی صبح وہ اس کی ماں کو اس کے ارادوں سے باخبر کر کے اپنے گھر سدھار گیا تھا۔

اس رات کے بعد بھی اس نے طریقہ کے ساتھ کئی بار وقت گزارا تھا لیکن اس نے پھر کبھی اس کے سامنے کوئی التجا نہیں کی تھی۔ وہ نوٹ چھاپنے والی مشین کی طرح دھڑا دھڑا اپنی ماں کو مالا مال کرتی جا رہی تھی۔ حاشر حسن کے ساتھ بھی اس کا رویہ بالکل نارمل ہوتا تھا البتہ کبھی کبھی اسے اس کی آنکھوں میں اپنے لئے چھپی نفرت کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی۔ لیکن اسے اس بات کی پرواہ نہیں تھی۔ اسے کسی Vamp کے دل میں اپنے لئے موجود جذبات سے کوئی غرض ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

لیکن اب چار سال کی مدت گزر جانے کے بعد چوبیس سال کی عمر میں اس نے ایموٹیل ہوتا سیکھ لیا تھا۔ وہ سوچتا تھا کاش اس رات وہ طریقہ کی مدد کرنے کی ہامی بھر لیتا تو شاید وہ اپنی موجودہ زندگی سے مختلف زندگی گزار رہی ہوتی اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کے اپنے دل پر اس کی جاہی کا بوجھ نہ ہوتا۔ اس کی زندگی میں نہ جانے کتنے کاش اور شاید تھے اگر وہ حساب کرنے بیٹھتا تو کتنی مشکل ہو جاتی۔

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں ہی کیوں تمہاری مدد کروں.....؟ تم کسی اور کو بھی تو اس کام کے لئے منتخب کر سکتی تھیں۔“ ریڈ لائٹ ایریا میں موجود اس کمپیوٹر گریجویٹ لڑکی کی بے بسی اسے لطف دے رہی تھی۔

”اس لئے کہ تم میرے پہلے گاہک ہو۔ مجھے ابھی تک کسی شخص نے نہیں چھوا اور تم نے جس قیمت پر مجھے حاصل کیا ہے اسے دیکھ کر میں یہ اندازہ لگا سکتی ہوں کہ تمہاری بیک مضبوط ہے۔ میری ماں اور اس کے غنڈے تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔“ وہ سر جھکائے اس کے انتخاب کی وجہ بتا رہی تھی۔

”اور یہاں سے نکلنے کے بعد جب میں تمہیں چھوڑ دوں گا تو تم کیا کرو گی.....؟ تنہا لڑکی کے لئے تو پوری دنیا بھی ریڈ لائٹ ایریا بن جاتی ہے۔“ حاشر حسن نے اسے خوفزدہ کرنا چاہا۔

”میرا ایک کلاس فیلو تھا عبید۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے تھے لیکن وہ اتنا باحیثیت نہیں کہ ان لوگوں سے ٹکرا سکے۔ اگر ایک بار کسی طرح مجھے یہاں سے آزادی مل گئی تو وہ مجھے اپنا لے گا۔“ آخر کو اس نے حقیقت اُگل ہی دی۔ اس کی بات سن کر حاشر حسن کا دل چاہا کہ وہ زور زور سے قہقہے لگائے۔ وہ لڑکی واقعی ایک Vamp تھی جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے حاشر حسن کو چارے کے طور پر استعمال کرنا چاہتی تھی اور بیس سال کی عمر میں بھی حاشر حسن کو کم از کم اتنا بے وقوف تو نہیں تھا کہ ایک Vamp کے بچائے جاں میں پھنس جاتا۔ یوں بھی اسے اس قسم کے کسی ایڈونچر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جس کی اطلاع گھر تک پہنچنے کی صورت میں ڈیڈی اس کو دی جانے والی سہولتوں میں کمی کر دیتے۔ ٹائٹ کلیمز جانے اور دوستوں کے ساتھ کبھی کبھار ڈرنک کر لینے کی غلطیوں کو تو وہ نظر انداز کر سکتے تھے لیکن ریڈ لائٹ ایریا کی عورتوں سے تعلقات کو وہ کسی صورت بھی معاف نہیں کرتے۔ ان کی اگلی پچھلی نسلوں میں سے کسی ایک فرد نے بھی اس علاقے میں قدم نہیں رکھا تھا۔ یہ تو حاشر حسن تھا جس کی اٹھارویں سالگرہ کے تحفے کے طور پر اس کے دوستوں نے اسے اس طلسم ہو شر با سے

”تم جس مسئلے سے دوچار ہو اس کا حل تمہیں ایک ماہر نفسیات کے پاس مل سکتا ہے، یہ خیال تمہارے دل میں کیسے آیا.....؟“ ڈاکٹر ہادی نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ان کی انگلیاں مسلسل ٹیبل پر پڑے پیپر ویٹ کو گھما رہی تھیں۔

”آپ کے خیال میں ایک ٹھیک ٹھاک، مضبوط جسم، خوبصورت شکل و صورت کا شخص جس کے ڈریس پر کبھی معمولی سا داغ بھی نہیں ہوتا، جس کے جوتے پر معمولی سی گرد نہیں ہوتی، دن رات خود سے تعفن اٹھتا محسوس کرے تو اس کی ذہنی حالت کے صحیح ہونے کا یقین کیا جاسکتا ہے، ہرگز بھی نہیں۔ کوئی نارمل شخص کبھی بھی اس طرح محسوس نہیں کر سکتا۔ یقینی طور پر یہ کوئی سائیکوجیکل پرابلم ہی ہے اور ایسے پرابلمز کا سلوشن ڈھونڈنے کے لئے ہر میچور شخص ماہر نفسیات سے ہی رجوع کرتا ہے۔“ اس نے ڈاکٹر ہادی کو اپنی کیفیت سے متعلق ایک ایک بات بتائی تھی اور جواب میں انہوں نے اس سے جو سوال کیا تھا، اسے سن کر جھنجھلا کر رہ گیا تھا۔

”تم جہاں سے یہ مرض لے کر آئے ہو اس جگہ کو دیکھتے ہوئے سوچنا پڑتا ہے مائی سن.....! تم مانتے نہیں ورنہ تم بھی جانتے ہو کہ ایسے امراض کا علاج تمہارے ہمارے جیسے ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہوتا۔ اگر جسمانی مرض ہوتا تو تم خود اس کا علاج کر سکتے تھے، نفسیاتی گرہ ہوتی تو کوئی ماہر نفسیات اسے سلجھا ڈالتا لیکن یہ روح کی بیماری ہے اور اس بیماری کا علاج کسی روحانی ڈاکٹر کے پاس ہی ہو سکتا ہے۔“ اس کی جھنجھلاہٹ کی پرواہ کئے بغیر ڈاکٹر ہادی بولے۔

”تو پھر کیا کروں میں اس مسئلے کے حل کے لئے.....؟ کسی خانقاہ، کسی مزار کے احاطے میں جا بیٹھوں.....؟ کسی صاحب نظر بزرگ کی قبر سے سر ٹکراؤں کہ وہ مجھے اس اذیت سے نجات دلا دیں.....؟“ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔

اس کی بات سن کر ڈاکٹر ہادی کے چہرے پر سرنخی سی پھیل گئی اور وہ نہایت غصے سے بولے۔

”قبر پرستی نہیں سکھاتا ہمیں ہمارا مذہب۔ زندگی کے مسائل ہیں یہ۔ ان کا حل ڈھونڈنے بھی زندہ لوگوں کے پاس جاؤ۔“

”آئی ایم سوری سر.....! شاید اپنی پریشانی میں کچھ غلط کہہ گیا ہوں میں۔“ وہ شرمندہ ہوا۔

”اٹس اوکے.....! مگر آئندہ بولنے سے پہلے خیال رکھنا۔“ انہوں نے فوراً ہی خود پر قابو پایا تھا۔

”میں چلتا ہوں سر.....! پلیز آپ میرے لئے دعا کیجئے گا۔“ وہ واپسی کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”زکو.....! میں بھی تمہارے ساتھ ہی نکلتا ہوں۔ یوں بھی اب میری کسی کلائنٹ کے ساتھ اپائنٹمنٹ نہیں۔“ ڈاکٹر ہادی جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگے۔

”کوئی ضرورت مند تیرے پاس مدد کے لئے آیا ہے تو تو اس کی مدد کیوں نہیں کرتا.....؟“ وہ اور ڈاکٹر ہادی ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پارکنگ میں آئے تھے کہ اچانک ہی ایک میلے کپڑوں اور بڑھے ہوئے بالوں والے شخص نے ڈاکٹر ہادی کا گریبان پکڑ کر انہیں روک لیا۔

”میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔“ وہ نہایت عاجزی سے بولے تھے۔ حاشر حسن جو اس شخص کو اس کی گستاخی پر ٹوکنا چاہتا تھا، حیرت سے یہ منظر دیکھنے لگا۔ بوڈ، ہائیلی کو الیافائیڈ ڈاکٹر ہادی اس میلے لباس، الجھی داڑھی اور الجھے بالوں والے بوڑھے کے سامنے نہایت مؤدبانہ انداز میں کھڑے تھے۔

”کون کس بات کا اہل ہے، اس بات کا فیصلہ کرنا تیرا کام نہیں۔ جب مریض کو تیرے پاس بھیجا گیا ہے تو اس کا علاج بھی تجھی کو کرنا ہوگا۔“ منگ نے خون آشام نظروں سے انہیں گھورتے ہوئے تلخی سے کہا اور تیزی سے پارکنگ سے نکلتا چلا گیا۔

”اتنی بڑی ذمہ داری سوپ دی مجھ ناچیز کو، کیسے بھاؤں گا میں.....؟“ وہ وہیں پارکنگ کے فرش پر گھٹنوں کے بل گر گئے تھے۔ انہیں سہارا دینے کے لئے جھکتے

حاشر حسن نے بڑبڑانے کے انداز میں ادا کیا، اس کا یہ جملہ سنا تھا۔

”کون تھا یہ بدتمیز آدمی سر.....! آپ نے اسے کچھ کہا کیوں نہیں.....؟“

حاشر حسن کے اندر ان کے انداز نے کھد بد چا دی تھی۔

”نومائی سن.....! نو۔ کوئی گستاخ لفظ نہ ادا کرو اس شخص کے لئے۔ تم نہیں جانتے وہ کون تھا۔“ ڈاکٹر ہادی نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا۔

”کون تھا وہ شخص.....؟ یہی تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔“

”اللہ کا دوست.....!“ ڈاکٹر ہادی کی آواز سرگوشی سے بلند نہ تھی۔

”یو مین ولی سر.....! وہ بوڑھا کوئی ولی تھا.....؟“ حاشر حسن نے بے تابانی سے نظر کو ارد گرد دوڑایا لیکن اب وہاں دُور دُور تک اس شخص کا نام و نشان نہیں تھا۔

”آپ کو مجھے بتا دینا چاہئے تھا سر.....! میں اس سے اپنے مسئلے کا حل معلوم کر لیتا۔“ اس کے لہجے میں ہاتھ آئی اس نعمت کے نکل جانے کا افسوس تھا۔

”تم نے سنا نہیں تھا.....؟ وہ یہ ذمہ داری میرے ناتواں کاندھوں پر ڈال گیا ہے۔“ ڈاکٹر ہادی کا چہرہ جذبات کی شدت سے ترختا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

”مانتے ہیں شاہ جی.....! آپ کی ذہانت کو، کتنے آرام سے آپ نے اپنی راہ کے کانٹوں کو نکال پھینکا۔“ اشفاق خان نے شاہ جی کو سراہا تو وہ مسکراتے ہوئے اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے لگے۔

”بابا.....! سیاست ہے یہ، اس میں تو یہ سب کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ ایم این اے اور اس کا سر چڑھا لیں ایچ او کچھ زیادہ ہی ہمارے منہ کو آنے لگے تھے۔ اگر اب بھی ہم ان کا خاتمہ نہ کروا دیتے تو وہ ہمارے لئے مشکلیں ہی پیدا کرتے چلے جاتے۔“

”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں شاہ جی.....! سنا تھا کہ اس ایس ایچ او نے ہمارے خلاف کئی ثبوت حاصل کر لئے تھے اور اگر اسے کچھ دن کی مہلت اور مل جاتی تو وہ ان ثبوتوں کو ایم این اے کے حوالے کر دیتا۔ پھر اس نے تو ان ثبوتوں کے ذریعے

ہمیں بلیک میل کرنا ہی تھا۔“ عامر مرزا نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”بابا.....! سمجھو کے بچت ہو گئی ہم سب کی۔ وہ تو اتفاق ہی تھا کہ اسلم کے ہاتھوں شاہد کاظمی کا بیٹا مارا گیا اور جذبات میں آکر شاہد کاظمی نے ہمیں دھمکانے کے لئے وقت سے پہلے فون کر دیا۔ ورنہ وہ تو اندھیرے کا تیر بن کر ہمارے جگر میں اترنے والا تھا۔ اس کے جذباتی پن نے ہی ہمارا کام آسان بھی بنا دیا۔ بیٹے کی موت کا سن کر بالکل ہی باؤلا ہو گیا تھا وہ۔ پاگل پن میں ہی اس نے اپنے اس چچے کو اسلم کے گھر دوڑا دیا۔ اسلم کیسی عنقریب تھا یہ تو تم لوگوں کو بھی معلوم ہے۔ شاہد کاظمی اور اس کے پٹھو کی ہڈیاں بھی ابھی تک اسے یاد کر کے قبر میں بلبلا رہی ہوں گی۔“ جی شاہ نے ایک قہقہہ لگایا۔

عامر مرزا اور اشفاق خان نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔

”بس.....! اس بات کا افسوس ہے شاہ جی.....! کہ ان کے چکر میں اسلم جیسا کام کا بندہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا۔ بڑا دلیر اور جی دار تھا۔ مخالفین کو دوسرے جہان کی سیر کرانے میں تو منٹ بھی نہیں لگاتا تھا۔“ عامر مرزا نے افسوس کا اظہار کیا۔

”مجبوری تھی ہماری، اسے نہ مروا دیتے تو ایک دن وہ ہمیں مروا دیتا۔ کچھ زیادہ ہی اس کا نام منظر ہونے لگا تھا۔ خالی زبانی کلامی شہرت تو خیر ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی لیکن اب تو وہ یعنی شاہد کی وجہ سے پھنس گیا تھا۔ اگر ہم اس سے لائقیتی کا اعلان نہ کرتے تو قتل کے سارے الزامات ہمارے کھاتے میں آجاتے، کبھی کسی مخالف پارٹی کے ہاتھ لگ جاتا تو ہمارے سارے راز لیک آؤٹ ہو جاتے۔ ہمارے اور ہماری پارٹی کے مفاد میں اس کا مرجانا ہی بہتر تھا۔ اس لئے ہم نے اس کے پروانہ موت پر دستخط کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ کام کے بندوں کا کیا ہے، ایک جاتا ہے اس کی جگہ لینے دس چلے آتے ہیں۔ کالجوں، یونیورسٹیوں میں ان جو شیلے نوجوانوں کی جو کھپ ہمارے آدمی تیار کر رہے ہیں وہ کبھی بھی اسلم اور اس جیسے دوسروں کی جگہ کو خالی نہ ہونے دے گی۔ ایک جائے گا تو دوسرا اس کی جگہ لے لے گا۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ ہزاروں مرچکے ہیں، لاکھوں تیار بیٹھے ہیں، تو سمجھ لو ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ جب تک معاشرے میں ایسے بے

وقوف موجود ہیں ہماری طلب اور رسد کے درمیان عدم توازن ہرگز بھی پیدا نہ ہو سکے گا۔“ شاہ جی کے عیار چہرے پر پھکی مسکراہٹ کو دیکھ کر کوئی بھی شخص یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ آدمی لاکھوں دلوں کی دھڑکن اور نوجوانوں کا آئیڈیل ہے۔

اور یہ تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ شاہ جی جیسے کردار ہماری سرزمین پر ناسور کی طرح پھیلے ہیں۔ یہ لوگ پہلے قوم کو سہانے خواب دکھاتے ہیں اور پھر اپنے مفاد کی خاطر خواب دیکھنے والی آنکھوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر ڈالتے ہیں۔ انہیں کسی کے گھر کا دیا بجھنے، کسی کی عزت لئے، کسی کی مانگ اُڑنے سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ یہ صرف اپنی تجوریاں بھرنے کی غرض دل میں چھپا کر سیاست کے میدان میں اُترتے ہیں۔ لاشوں کے انبار ان کے لئے دولت کا ڈھیر پیدا کرتے چلے جاتے ہیں اور ہم بے وقوف قوم پھر بھی انہیں پہچان نہیں پاتے۔

☆☆☆

”مجھے تمہاری قسمت پر رشک آتا ہے یک مین.....! تم بہت زیادہ لکی ہو۔“ ڈاکٹر ہادی آج بالکل مختلف روپ میں اس کے سامنے تھے۔

”لکی اور میں.....؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر.....! اگر میں خوش قسمت ہوتا تو آج اس طرح در بدر، پریشان حال نہ پھر رہا ہوتا۔“ حاشر حسن نے ان کی بات تسلیم کرنے سے انکار کیا۔

”ہوتے ہیں، کچھ تم جیسے ناشکرے اور لاعلم لوگ بھی ہوتے ہیں، جنہیں سر سے پیر تک نعمتوں سے لاد دیا جاتا ہے، پھر بھی وہ خود پر کی جانے والی اللہ کی مہربانیوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ کیا نہیں دیا گیا تمہیں، مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ، بے حساب دولت، خوبصورتی، اچھا ذہن اور بہترین تعلیم کہیں ایک جگہ بھی تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے، سب کچھ تو ہے تمہارے پاس لیکن تم مانتے نہیں اور اب صرف چوبیس سال کی عمر میں تم وہاں بھی ہو آئے ہو جہاں جانے کی تمنا دل میں لئے لوگ دُنیا سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن تمہیں وہاں بھی بلوایا گیا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم اپنے پیسے کے بل بوتے پر وہاں

گئے تھے، ہرگز بھی نہیں، لاکھوں دولت مند اپنے خزانوں کے ڈھیر لئے بیٹھے رہ جاتے ہیں لیکن انہیں اس در کی حاضری نصیب نہیں ہوتی، وہاں صرف وہ حاضر ہوتے ہیں جنہیں در حسیب سے باقاعدہ حاضری کی اجازت دی جاتی ہے، بغیر کسی تمنا کے اگر تمہیں وہاں بلوایا گیا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کسی خاص مقصد کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔“ ڈاکٹر ہادی کے لہجے میں جلال تھا۔

”منتخب لوگوں کو تو بڑے بڑے انعامات سے نوازا جاتا ہے سر.....! لیکن مجھے وہاں سے کیا عطا کیا گیا۔ اپنے وجود سے اُمتی بدبو کا احساس جو مجھے کھل کر سانس بھی نہیں لینے دیتا۔“ حاشر حسن نے شکوہ کیا۔

”بدبو کا احساس ہی سہی، لیکن تمہیں کچھ تو عطا کیا گیا ناں.....؟ تم خالی ہاتھ تو اس در سے نہیں لوٹے۔ وہاں سب کو ان کی ضرورت کے مطابق ہی نوازا جاتا ہے۔ تم جو خالی دل لئے وہاں پھر رہے تھے تمہارے اندر احساس کی جوت چگنا بھی تو ضروری تھا۔ اس ظاہری مرض کا علاج ڈھونڈو گے تو اپنی بیماری کی جڑ تک بھی پہنچ جاؤ گے۔“ ڈاکٹر ہادی نے اسے سمجھایا۔

”بیماری تو اپنی جانتا ہوں میں، گناہوں کا مرض لاحق تھا مجھے، چھوڑ چکا ہوں میں سارے گناہ، لیکن کوئی افادہ نہیں ہوتا۔ وجود پر چھائے تعفن کا احساس اب بھی پہلے ہی کی طرح باقی ہے۔“ اس نے بے بسی سے بتایا تھا۔

ڈاکٹر ہادی بے ساختہ ہی مسکرائے۔

”ڈاکٹر ہو کر علاج کا صحیح طریقہ نہیں جانتے تم.....؟ کیا کبھی کوئی مرض صرف پرہیز سے ختم ہوا ہے.....؟ جسم میں جو بیماری داخل ہو جائے اس کے خاتمے کے لئے دوا بھی تو کرنی پڑتی ہے۔ گناہوں کو ترک کر دیا بہت اچھا کیا لیکن جو گناہ پہلے سرزد ہو چکے ہیں ان کے جڑوے تو بدن کو کھاتے ہی رہیں گے۔“

”دن رات اللہ کے حضور گڑ گڑاتا ہوں، ان گناہوں کی بخشش کے لئے، لیکن وہ تو جیسے کسی اونچے مینار پر بیٹھا ہے، اس تک میری صدا پہنچتی ہی نہیں۔“ اس کے انداز

میں شکوہ اور بے بسی دونوں ہی تھے۔

”تم نے Louis I Newmar کی میٹرک کے نصاب میں شامل نظم The voice of God تو ضرور پڑھی ہوگی۔ وہ لکھتا ہے:

I sought to hear the voice of God.

And climbed the top most steeple.

But God declared Go down again.

I dwell among the people.

تم بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہو کہ خدا کسی بلندی پر بس رہا ہے اور تمہیں اس کی تلاش میں کسی ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنا ہوگا۔ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے حاشر حسن!.....! خدا ہمیشہ انسانوں کے درمیان بستا ہے، اس تک پہنچنے کا راستہ دکھی انسانوں کے درمیان بستا ہے، اس تک پہنچنے کا راستہ دکھی انسانوں کے دلوں سے گزر کر ملتا ہے۔ اگر تم اپنے مرض کا جڑ سے خاتمہ چاہتے ہو تو اس کی مخلوق کے دکھ بانو، ان سے کی گئی اپنی زیادتوں کی معافی طلب کرو اور اگر کہیں کسی کو تمہاری ضرورت ہے تو اس کی مدد کرو، تم خود دیکھو گے کہ تمہارے اندر کا ماحول کتنی تیزی سے بدلتا ہے، جسم کے گرد لپٹی بدبوئیں کیسے معطر جھونکوں میں بدلتی ہیں۔“ ڈاکٹر ہادی اس کے مرض کا علاج بتا رہے تھے اور وہ ایک نیک ان کی کشادہ پیشانی اور روشن آنکھوں والے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کسی جنگل بیابان میں بننے والا، دراز زلفوں، لمبے لمبے چونوں اور گتے میں پڑی ڈھیروں مالاؤں والا شخص ہی اللہ کا منظور نظر ہو ضروری نہیں ہوتا، کبھی کبھی تھری پیس سوٹ میں، لمبی سی میز کے پیچھے ریوالوگ چیر پر براہمن، فلی اے سی آفس میں بھی کسی ولی سے ملاقات ہو جاتی ہے، یہ اور بات کہ ایسا شخص اپنے کمرے کے باہر عامل فلاں اور عامل فلاں کا بورڈ لگا کر نہیں بیٹھتا۔

☆☆☆

”کسی رپورٹر اور پریس فوٹو گرافر کو اندر آنے کی اجازت نہیں دیں گے آپ،

اگر ایسا ہوا تو میں آپ کے ہاتھ میں چارج شیٹ پکڑا دوں گا۔“ ڈاکٹر صولت مرزا انٹرکام پر ریسیشنٹ پر غرائے تھے اور پھر فوراً ہی اس لڑکی کی طرف توجہ مبذول کر لی تھی جسے ابھی ابھی امیر جنسی میں یہاں لایا گیا تھا۔ لڑکی کی کلائی بری طرح زخمی تھی اس بات کا اندازہ کلائی کے گرد بندھے دوپٹے کو دیکھ کر لگایا جاسکتا تھا۔ یہ دوپٹہ شاید کسی اناڑی نے خون روکنے کی کوشش میں اس کی کلائی کے گرد لپیٹا تھا لیکن خون سے تر ہر دوپٹہ اس کوشش کی ناکامی کا ثبوت تھا۔

ڈاکٹر صولت کی ہدایت پر حاشر حسن نے لڑکی کا بلڈ پریشر چیک کرتے ایک نظر اس کے لمحہ بہ لمحہ زرد پڑتے چہرے کی طرف ڈالی۔ وہ ایک نوعمر لڑکی تھی، جس کی بڑی بڑی بند آنکھوں پر موجود مڑی ہوئی خوبصورت سیاہ پلکوں پر اب بھی آنسوؤں کے ایک دو قطرے اٹکے ہوئے تھے۔ سر پر موجود گھنے سیاہ بالوں کی الجھن اور بے ترتیبی اس بات کی غماز تھی کہ کئی دنوں سے ان میں برش پھرنے کی زحمت نہیں کی گئی۔

”پسند کی شادی پر گھر والوں کی مخالفت، یا پھر محبوب کی بے وفائی کا دکھ ان میں سے یقیناً کسی ایک وجہ نے ہی اسے اس انتہائی قدم پر اکسایا ہوگا۔“ حاشر حسن نے اندازہ لگایا۔ اب تک نوعمر لڑکیوں کے خودکشی کے جتنے کیس اس کے سامنے آئے تھے ان میں سے 99% کے پیچھے یہی دو وجوہات ہوتی تھیں۔ لڑکی کی بے تحاشا خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے محبوب کی بے وفائی والے اندازے کے درست ہونے کے چانسز بہت کم تھے زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ گھر والے اس کی پسند کو اپنانے پر راضی نہیں ہونے ہوں گے اور احتجاجاً لڑکی نے خودکشی کی کوشش کی۔ لیکن جتنی تیزی سے پریس والے آئی سی یو کے گرد جمع ہوئے جارہے تھے اسے دیکھتے ہوئے حاشر حسن کو الجھن ہونے لگی۔ بے شک پریس ایسی خبروں کا متلاشی رہتا ہے لیکن یہ کوئی اتنا انوکھا کیس بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ یوں ہسپتال میں اُمد آتے۔ لڑکی کے ساتھ آئے ادھیڑ عمر میاں بیوی اور خود لڑکی کے جسم پر موجود لباس کو دیکھ کر بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی عام سی فیملی سے تعلق رکھتی ہے اور کسی عام سی فیملی کی لڑکی کے لئے لستے بڑے بڑے اخبارات کے نمائندوں کا اکٹھا ہو

جانا نہایت اچھے کی بات تھی۔ ڈاکٹر صولت کے ساتھ رہتے ہوئے وہ ارد گرد بھی کسی سے اس سلسلے میں معلومات حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ہاؤس جاب کرنے والے ڈاکٹروں کو ان کی نگاہیں کسی آکسپل کی طرف جکڑی رہتی تھیں۔

چند گھنٹوں کے اندر ہی گورنر اور آئی جی سندھ بھی ہاسپٹل پہنچ گئے تھے۔ ان کے اخباری نمائندوں کو دیئے گئے جوابات اور انصاف کی یقین دہانیوں والے ہمیشہ کے رٹے رٹائے جملوں کو سن کر حاشر حسن پر انکشاف ہوا کہ وہ لڑکی عبادہ عبدالمبین تھی۔ ایک مشہور سیاسی تنظیم کے کارکن اسلام کی بہن، جسے کچھ روز پہلے ہی چند پولیس والوں نے اپنی ہوس کی بھیشت چڑھایا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ ہونے والے گینگ ریپ کے سامنے نے شہر میں قتل و غارت اور دہشت گردی کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ واقعے میں ملوث پولیس اہلکاروں، ان کی پشت پر موجود ایم این اے اور خود اسلام کی موت کی خبریں یکے بعد دیگرے اخبارات کی زینت بنی تھیں۔ اسلام کی پارٹی نے اسلام سے اپنی لائقیتی کے اعلان کے باوجود اس کی بہن کے ساتھ ہونے والے حادثے کو الیٹو بنا کر اپنی سیاست کی دکان خوب چمکائی تھی، ان کی پارٹی اپوزیشن میں تھی لہذا اس واقعہ کو بنیاد بنا کر حکومت پر کیچڑ اچھالنے اور اس کی مخالفت میں نعرے لگانے کا موقع انہیں خوب ملا تھا۔ ایک ایسا حادثہ جو اگر خدا خواستہ ان میں سے کسی کی بہو بنی کے ساتھ پیش آ جاتا تو اسے چھپانے کی پوری پوری کوشش کی جاتی، خوب اچھالا جا رہا تھا۔

حاشر کو خیال آیا کہ جیسی اس لڑکی کے خدو خال کچھ جانے پہچانے محسوس ہو رہے تھے کیونکہ وہ کئی بار اخباروں کے فرنٹ پیج پر سرسری سا اس کی تصویروں کو دیکھ چکا تھا۔ ایک اٹھارہ سالہ لڑکی جس کی ناصر عزت لوٹی گئی ہو، مگر برباد ہو گیا ہو اور جس کی بے عزتی کی خبریں ہر روز اخباروں میں چھپتی ہوں، خود کشی کی کوشش کے سوا اور کبھی کیا سکتی تھی۔

حاشر حسن کے دل میں یکدم ہی اس لڑکی کے لئے ہمدردی کے جذبات ابھرنے لگے۔

”یہ جو کچھ کھو چکی ہے اس کے بعد اسے یقیناً اس بات سے دلچسپی نہیں ہو سکتی کہ صدر نے اس کے لئے کتنے لاکھ کی مالی امداد کا اعلان کیا ہے، وزیر اعظم کو اس واقعہ کا کتنا افسوس ہے یا کتنے نوجوان اس کا غم کھاتے ہوئے اس کی ہمدردی میں اس سے شادی کا اعلان کر چکے ہیں۔ یہ جو یکدم ہی اتنی ہائی لائٹ ہوئی ہے اس کے دل میں تو وہی اپنے پہلے والی گمنام زندگی میں واپس جانے کی تمنا چل رہی ہوگی۔“ اس کے صبح چہرے پر نظر جمائے حاشر حسن نے سوچا تھا۔

☆☆☆

”لیس.....! کم ان.....!“ دسک کے جواب میں اندر سے آتی آواز پر وہ دروازے کی تاب گھا کر اندر داخل ہوا۔ پنک اور وائٹ احتراز رکھنے والا یہ کمرہ جس کی دیواروں پر فلمی ہیروز اور ہیروز کے بڑے بڑے پوسٹر چسپاں تھے، فرسٹ ایئر میں زیر تعلیم اس کی اکلوتی بہن ایمین کا تھا۔

ایمین جو منتظر نظروں سے دروازے کی طرف ہی دیکھ رہی تھی اسے سامنے پا کر رخ موڑ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا اس تک پہنچا اور دائیں ہاتھ سے اس کی کرسی کے بیک تھام کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ ایمین خود کو اس سے بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش میں مانیٹر پر نظر جمائے بیٹھی تھی، اس کی انگلیاں بڑی تیزی سے کی بورڈ پر حرکت کر رہی تھیں لیکن اس مصروفیت میں بھی اس کے چہرے پر چھائے ناراضگی کے تاثرات باسانی دیکھے جاسکتے تھے۔

”ناراض ہو سسر.....!“ اس کی پونی کو چھیڑتے حاشر حسن نے محبت سے پوچھا۔

”لیس.....!“ ایمین نے صرف ایک لفظی جواب دیا تھا۔

”لیکن کیوں.....؟“ وجہ جاننے کے باوجود حاشر حسن اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

”آپ کے خیال میں کل جتنی انسٹ آپ نے میری، میرے فرینڈز کے

سامنے کی ہے اس کے بعد بھی اس سوال کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے.....؟“ کرسی کو گھما کر اس کی طرف رخ کرتے ایمن نے تلخی سے پوچھا۔

”کل میں نے صرف تمہیں ایک بات سمجھائی تھی اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اپنی چھوٹی بہن کو یہ بتانا کہ اس کے لئے کیا چیز درست ہے اور کیا غلط، یہ میرا فرض ہے۔“ قریب موجود دوسری کرسی کو گھسیٹ کر عین اس کے مقابل بیٹھتے حاشر حسن نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

”اگر کل میں نے کوئی غلط حرکت کی ہوتی تو مئی، ڈیڈی یا عاشر بھائی میں سے بھی ضرور کوئی مجھے ٹوکتا۔ لیکن انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ لوگ آپ کی طرح دوسرے کی پرسنل لائف میں دخل نہیں دیا کرتے۔“ اس کا لہجہ کافی حد تک بگڑا ہوا تھا۔ حاشر حسن کے چہرے پر اس کی بات سن کر سرخی سی دوڑ گئی۔

”پرسنل لائف کا جو تصور ہماری کلاس میں رائج ہے، میں سرے سے ہی اسے غلط سمجھتا ہوں، اپنے چھوٹوں کو صحیح غلط بتانا ان کی پرسنل لائف میں انٹرفیر نہیں بلکہ بڑوں کا فرض ہوتا ہے۔“

کل ان کے گھر پر ایک بزنس ڈنر تھا۔ حاشر کافی دیر سے اس ڈنر میں پہنچا تھا اور وہاں پہنچتے ہی اس کی آنکھوں نے جو پہلا منظر دیکھا وہ اس کا خون کھولانے کے لئے کافی تھا۔ ڈیڈی کے بزنس پارٹنر داؤد نقوی کا بیٹا، ذوالفقار نقوی بڑی بے تکلفی سے ایمن کے بائیں شانے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں مسلسل ایمن کی صراحی دار گردن میں پڑی نازک سی گولڈ کی چین کو چھیڑ رہی تھیں۔ ایمن اس کی اس جسارت سے بے نیاز مسکرا مسکرا کر اپنے ارد گرد کھڑے باقی دو لڑکوں اور تین لڑکیوں سے بات کر رہی تھی۔

حاشر حسن کو لگا کہ وہ ایمن نہیں روبا ہے۔ جسے جو شخص چاہے آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ اپنی سگی بہن کو روبا کے روپ میں ڈھلتے دیکھنا اس کے لئے بہت مشکل تھا وہ تیز تیز قدموں سے چلا سیدھا ان لوگوں کے قریب پہنچا۔

”ایمن.....! تم مئی کے پاس جاؤ۔“ ذوالفقار نقوی کے ہاتھ کو ایمن کے شانے سے جھٹکتا وہ غرایا تھا۔ ایمن اس کے لہجے کی سختی سے ڈر کے فوراً ہی وہاں سے ہٹ گئی تھی جبکہ اس کے دوستوں کے گروپ پر بھی ایک سناٹا سا چھا گیا تھا۔ حاشر حسن ان لوگوں کو اسی عالم میں چھوڑ کر دندناتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے وہ جوانی کی سرحد پر کھڑی اپنی معصوم بہن کو بھیڑیوں کے نرغے میں گھرا محسوس کر رہا تھا۔ اسے ہر حال میں اپنی بہن کو ان بھیڑیوں سے بچانا تھا۔ اگلی صبح اس کی مئی سے بھی ٹھیک ٹھاک بحث ہوئی تھی۔ وہ ایمن کے حوالے سے انہیں ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلانا چاہتا تھا جبکہ مئی کا خیال تھا کہ اس کے اندر اس کے دادا ابوی کی روح حلول کر گئی ہے۔ ان ہی کی طرح وہ بھی ملاپن پر اتر آیا ہے۔ حاشر نے ان کا ہر طنز خوش اسلوبی سے سہا تھا لیکن ساتھ ہی انہیں یہ جتاننا بھی نہیں بھولا تھا کہ اگر اس نے آئندہ اتنی بے باکی سے ایمن کو کسی لڑکے کے ساتھ ملتے دیکھا تو وہ ہرگز بھی وقت اور موقع کی نزاکت کا خیال نہیں کرے گا۔

اس دن کے واقعہ کے بعد سے ایمن کا موڈ سخت آف تھا۔ گھر میں جہاں بھی اس کا حاشر حسن سے سامنا ہوتا وہ اس جگہ کو چھوڑ کر چلی جاتی۔ حاشر اس کی ناراضگی کو بہت اچھی طرح محسوس کر رہا تھا لیکن اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ وہ ابھی عمر کی جس اسٹیج پر ہے اسے باسانی کسی بھی روپ میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ غصے کا اظہار وہ ضرورت کے وقت کر چکا تھا اب ضرورت اسے پیار سے سمجھانے کی تھی سو وہ اپنی ذمہ داری نبھانے کے لئے تیار تھا۔ یوں بھی اصلاح کا عمل ہمیشہ پہلے اپنی ذات اور پھر اپنے گھر والوں سے شروع کر کے آگے بڑھایا جاتا ہے۔

”غلط تم ہو یا میں، اس بات کا فیصلہ فوری طور پر کرنے کے بجائے ہم آئندہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس وقت میں چاہتا ہوں کہ تم غیر جانبداری سے ان کتابوں کا مطالعہ کرو اور اگر اس میں سے کوئی بات تمہیں سمجھ آتی ہے اور تمہارے دل کو لگتی ہے تو ارد گرد کے لوگوں کے مذاق اڑانے کی پرواہ کئے بغیر اس پر عمل کرو۔“ خاموشی کے ایک طویل

وقت کے بعد اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا پیکٹ ایمین کی طرف بڑھایا تھا۔ اس پیکٹ میں سورۃ النور، سورۃ احزاب اور سورۃ النساء کی تفاسیر کے علاوہ چند دوسری کتابیں بھی موجود تھیں۔ جنہیں حاشر حسن نے بڑی چھان پھٹک کے بعد ایمین کے لئے منتخب کر رکھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ تربیت جو ایمین کو اپنے ماحول اور ماں کی طرف سے نہیں ملی کتابوں کے ذریعے ہو سکے۔

ایمین نے اس کے ہاتھ سے پیکٹ لے کر بڑی بیزاری سے ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ اس کے انداز بتاتے تھے کہ وہ ان کتابوں کو پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ حاشر حسن کو اس کے انداز سے کچھ ڈکھ سا ہوا لیکن پھر اس نے خود کو یہ سمجھا کر تسلی دی کہ جلد یا بدیر آخر کار وہ صحیح غلط میں تفریق کرنا سیکھ ہی جائے گی۔ اس وقت تک وہ صرف یہی دعا کر سکتا تھا کہ اللہ اسے کسی بھی نقصان سے محفوظ رکھے۔

☆☆☆

”تم اب تک اتنی پرانی بات کو دل سے لگا کر بیٹھے ہو گے یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔“ اپنے سامنے سر جھکائے بیٹھے حاشر حسن کی بات سن کر طربہ نے ایک اونچا قہقہہ لگا کر کہا۔ لیکن حاشر حسن اس قہقہے کے پیچھے چھپی آہوں اور سسکیوں کو محسوس کر سکتا تھا۔

”بات بے شک پرانی ہے طربہ.....! لیکن غیر اہم نہیں۔ تمہاری ساری زندگی کو اس ایک بات نے متاثر کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری موجودہ زندگی کے لئے میں ہی سب سے زیادہ تمہارا مقروض ہوں۔ اگر اس رات میں تمہاری بات پر انسانیت سے غور کرتا تو تم اس جگہ کے بجائے کسی صاف ستھرے گھر میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ایک اچھی لائف گزار رہی ہوتیں۔“ اس کی آواز میں ماضی میں کی گئی غلطی کا پچھتاوا تھا۔

”گھر.....؟ کون سا گھر.....؟ طوائف کے لئے تو قدرت نے شاید اس نعمت کو تخلیق ہی نہیں کیا۔“ طربہ کے لہجے میں استہزاء تھا۔

”تم خود کو میرا مجرم سمجھتے ہو، ایک عرصے تک میں نے بھی ایسا ہی سمجھا تھا اور تم سے بے تحاشا نفرت بھی کی تھی لیکن جب مجھ پر عبید انصاری کی حقیقت کھلی تو تم مجھے اچھے لگنے لگے۔ کم از کم تم نے میرے ساتھ کوئی دھوکا تو نہیں کیا تھا۔ میں بکاؤ مال تھی تم نے مجھے خرید لیا۔ تمہاری نظر میں میری کچھ نہ کچھ تو حیثیت تھی لیکن وہ عبید انصاری جو مجھ سے محبت کے دعوے کرتا تھا صرف ایک چور نکلا۔ اگر کبھی کوئی دوسرا مجھے اس کا وہ روپ دکھانے کی کوشش کرتا تو میں کبھی یقین نہ کرتی جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ تمہارے ماں کو خبردار کر کے جانے کے بعد ماں نے مجھے سخت نگرانی میں رکھا تھا لیکن پھر بھی میں کسی نہ کسی طرح اسے غچہ دے کر یہاں سے نکل گئی۔ مجھے یقین تھا کہ عبید اب بھی مجھے قبول کر لے گا لیکن اس کے سامنے سوال کرنے سے پہلے ہی مجھ پر اس کی اصلیت کھل گئی۔ اس روز اس کی اس کے دوست کے ساتھ کی جانے والی گفتگو سن کر مجھے پتا چلا کہ وہ بھی مجھے ایک طوائف سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتا۔ طوائف کو خریدنے کے لئے اس کی جیب میں مال نہیں تھا اس لئے اس نے محبت کا جال ڈال کر مجھے لوٹنے کا پروگرام بنایا۔ سنا حاشر حسن.....! تم نے، وہ شخص جس کے میں خواب دیکھتی تھی، کتنا برا نکلا۔ دنیا میں طوائفوں کا دھوکہ مشہور ہے اور وہ ہم سے بھی بڑا دھوکے باز نکلا جو شب خون مارنا چاہتا تھا۔ بس پھر میں لوٹ کر اس دنیا میں واپس آ گئی۔ جب کھلونوں کی طرح لوگوں کا دل بہلانا ہی ہمارا مقدر ہے تو مفت میں کیوں کسی کے ہاتھ لگیں.....؟ ساری دنیا کا اصول ہے۔ اس ہاتھ نے اُس ہاتھ دے۔ اب میں بھی ایک ہاتھ سے اپنا حسن اور جوانی اپنے گاہکوں کو دیتی ہوں اور دوسرے ہاتھ سے اس کی قیمت وصول کرتی ہوں۔ تمہارا پچھتاوا، احساس، ندامت اور معذرت اب میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ نہ ہی میں تمہیں اپنا قصور وار سمجھتی ہوں لیکن پھر بھی اگر میرے یہ کہنے سے کہ میں نے تمہیں معاف کیا، تمہاری تسلی ہو جاتی ہے تو میں کہہ دیتی ہوں کہ حاشر حسن.....! میں نے تمہیں معاف کیا۔ روز قیامت اپنی تقدیر کے کسی ستم کے لئے میں تمہارا گریبان نہیں تھاموں گی۔ اس دن تو بس میں خدا سے یہ پوچھوں گی کہ اس نے ہم جیسی مخلوق کو کیوں پیدا کیا.....؟“

ہزار ضبط کی کوشش کے باوجود طریقہ کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے وہ تیزی سے حاشر حسن کے سامنے سے اٹھ کر چلی گئی۔ اس کی طرف سے معافی کے اعلان کے باوجود حاشر حسن اپنے دل پر بوجھ سانس کر رہا تھا۔ آج پہلا موقع تھا کہ وہ ریڈ لائٹ ایریا میں کسی لڑکی کے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے اس سے معافی مانگنے وہاں آیا تھا۔ پہلے جب وہ برائی کے راستے پر چل رہا تھا تو بھی اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی تھی اور آج بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر ہی یہاں سے جا رہا تھا۔ البتہ طریقہ کے لہجے میں کھلے آنسوؤں نے اسے اس کامیابی پر کھل کر خوش نہیں ہونے دیا تھا۔

☆☆☆

”کیا کر رہی ہو تم.....؟“ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہاتھ میں تھامی چھری سے اپنے خطرناک ارادے کو عملی جامہ پہنائی، حاشر نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ آج اس کی ٹائٹ ڈیوٹی تھی، ہاؤس جاب والے ڈاکٹر زکو عموماً اپنا وقت جنرل وارڈ میں ہی گزارنا ہوتا تھا لیکن ڈاکٹر صولت بطور خاص اس پرائیویٹ روم میں ایڈمٹ عبادہ عبدالمبین کا دھیان رکھنے کی ہدایت کر کے گئے تھے۔ اعلیٰ حکام کی اس کیس میں دلچسپی کی وجہ سے ہسپتال کی انتظامیہ اس کا خصوصی خیال رکھ رہی تھی۔ آرام دہ کمرے کے ساتھ ساتھ ایک نرس بھی مستقل اس کی دیکھ بھال پر معمور تھی۔ لیکن حاشر حسن نے دیکھا تھا کہ اس لڑکی کو خود کو دیجے جانے والے اس ایٹش ٹریڈنٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سارا دن سپاٹ چہرہ لئے اپنے ارد گرد پھرتے لوگوں کو دیکھتی رہتی تھی لیکن آنکھیں اس کے چہرے کی طرح بے تاثر نہیں تھیں۔ حاشر حسن ان آنکھوں میں موجود جھلاہٹ اور درد کی تحریر بخوبی پڑھ سکتا تھا۔ وہ ایک بار پھر خود کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی، یہ عزم بھی اس کی آنکھوں سے چھلکتا محسوس ہوتا تھا۔ وہ جب بھی اس کی بولتی آنکھوں کی طرف دیکھتا اس کے وجود میں ایک سردی لہر دوڑ جاتی۔

اب بھی جیسے ہی اس کی نظر اس کے روم میں ڈیوٹی دینے والی سسٹر ماریہ پر

پڑی وہ الٹ ہو گیا۔ سسٹر ماریہ سیڑھیاں اتر کر نیچے ریسپشن کی طرف جا رہی تھیں۔ شاید نہیں کوئی ضروری کال کرنا تھی۔ حاشر ایک نظر وارڈ میں موجود مرلیضوں پر ڈال کر تیزی سے عبادہ عبدالمبین کے کمرے کی طرف بڑھا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے بدشاعت کی تصدیق ہو گئی۔ سائیز ٹیبل پر موجود پھل کاٹنے والی چھری ہاتھ میں پکڑے بیٹا ایک بار پھر وہ اپنی کلائی کو تختہ مشق بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”چھوڑ دیں مجھے، مر جانے دیں، کیوں بار بار آپ لوگ مجھے بچا لیتے ہیں.....؟ نفرت ہے مجھے اس زندگی سے، مر جانا چاہتی ہوں میں۔“ وہ بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شدید جنون نے اس دھان پان سے لڑکی میں بے پناہ قوت بھر دی تھی۔ حاشر حسن جیسے مضبوط ورزشی ہم کے مالک شخص کے لئے اسے سنبھالنا مشکل ہوا جا رہا تھا۔

”سی.....!“ بے اختیار ہی حاشر کے منہ سے سسکاری نکلی۔ اس نے اپنے انت پوری قوت سے حاشر کی کلائی میں گاڑ دئیے تھے۔ یکدم ہی حاشر کا ہاتھ اٹھا اور اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر گیا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ عبادہ عبدالمبین کی ماری مزاحمتیں دم توڑ گئیں۔ وہ یکدم ہی عالم جنون سے واپس عالم خرد میں آگئی تھی اور بے اپنے گھٹنوں میں منہ چھپائے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

حاشر حسن نے ایک نظر اپنی کلائی کی طرف دیکھا۔ اس کے دانتوں کے ٹانبات کے ساتھ وہاں خون کے چند قطرے ابھر آئے تھے۔ خون کے ان قطروں کو نظر ملاز کرتے اس نے دوسری نظر عبادہ عبدالمبین کے شدت گریہ سے جھکولے لیتے وجود پر الٹی۔ رونے سے جسم کو لگنے والے جھکوں کی وجہ سے اس کی پشت پر بڑی موٹی سی چٹیا گے کی طرف آگری تھی اور اب ایک ردہم کے ساتھ مل رہی تھی۔ حاشر حسن نے دیکھا کہ اس کے بال بے انتہا سیاہ اور چمکیلے ہیں۔ چٹیا میں قید ہونے کے باوجود ان کی بصورتی بہت نمایاں تھی۔ قدرت نے اس کی تقدیر بھی شاید اس کے بالوں ہی کی طرح باہ بنائی تھی۔ حاشر حسن کے دل میں اس کے لئے ہمدردی کے جذبات مزید گہرے

ہونے لگے۔

”سنو.....! پانی پی لو.....!“ وہ بے اختیار ہی سائیز نیبل پر پڑے جگہ گلاس میں پانی بھر کر اس کی طرف بڑھا۔ لیکن اس نے اپنی پوزیشن نہیں بدلی۔
”پلیز.....! دیکھو، ایسے مت رو، مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ میں اپنی حرکت شرمندہ ہوں۔ مجھے اس طرح تم پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔“ اس کی آواز میں غلامرہ تھی۔

”جسے دن رات لوگوں کی باتیں سنسکار کرتی ہوں اس کے لئے آپ کا معمولی سا تھپڑ بھلا کیا اہمیت رکھ سکتا ہے.....؟“ اپنے گھٹنوں سے سر اٹھائے وہ نہایت تلخ سے کہہ رہی تھی۔ رونے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں سرخی دوڑنے لگی تھی۔ حاشر حسر کو اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتے پانی میں اپنا وجود ڈولتا محسوس ہوا۔ حسن اس بہت دیکھا تھا لیکن حسن کے ساتھ سادگی اور معصومیت کا احتراز اسے صرف عباد عبدالمبین ہی میں دکھائی دیا تھا۔
”تم جو حرکت کرنے جا رہی تھیں، جانتی ہو کتنا بڑا گناہ ہے.....؟“ اس کے حسین چہرے سے نظر چرا کر وہ کچھ غصے سے بولا تھا۔

”جانتی ہوں۔ لیکن مجھ سے اس داندلار وجود کا بوجھ نہیں اٹھایا جاتا۔“ اس کے آواز بہت پست تھی۔

”یہ وجود تمہارے پاس اللہ کی امانت ہے، تمہیں کس نے حق دیا کہ تم اللہ کی اس امانت کو نقصان پہنچاؤ.....؟“ وہ اسے کٹہرے میں کھینچ لایا تھا۔

”اس کی دی امانت کی میں پہلے ہی کہاں حفاظت کر پائی ہوں، اب تو بس ایک احساسِ عداوت ہے جو جیسے نہیں دیتا۔“ وہاں اپنے لٹ جانے کا ڈکھ بول رہا تھا۔

”امانت کو اگر کوئی داغ لگا دے تو امین اسے جلا کر راکھ کرنے کے بعد مالک کے حوالے نہیں کرتا بلکہ اس داغ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ تمہارا یہ جسم جو اللہ کی امانت ہے اگر کسی وجہ سے داندلار ہو گیا ہے تو تم اس داغ کو مٹانے کی کوشش کرنے کے

بجائے، اسے ہی مٹانے پر کیوں تلی ہو.....؟ اور میں نہیں سمجھتا کہ اس داغ کے لئے بھی تمہیں اللہ کے آگے جواب دہ ہونا ہوگا۔ اس کے ہاں کوئی اندھا قانون نہیں چلتا کہ وہ کسی اور کے کئے جرم کا حساب تم سے مانگنے لگے۔“

”وہ نہیں مانگتا حساب، لیکن یہ دنیا تو مانگتی ہے۔ آپ کے خیال میں جب میں یہاں سے نکلوں گی تو کتنے لوگ ہوں گے جو مجھے عزت دار اور بے قصور جان کر میرا سہارا بننے کی کوشش کریں گے.....؟“ وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

”دنیا اچھے لوگوں سے خالی تو نہیں ہوگئی عبادہ.....! مانا کہ تمہارے ساتھ بہت برا ہوا ہے لیکن یہ برائی کرنے والے صرف چند لوگ تھے، تمہارے ساتھ ہونے والی زیادتی پر احتجاج کرنے والوں کا تو ایک جم غفیر ہے جنہوں نے نیچے سے اوپر تک ہر شخص کو ہلا دیا ہے۔ تم کہتی ہو تمہیں کوئی سہارا نہیں دے گا اور میں نے ان نوجوانوں کو دیکھا ہے جو صرف تمہارے ساتھ ہونے والے ظلم کی تلافی کے لئے تمہارے ساتھ نکاح کے لئے تیار ہیں، ان کی اس نیک نیتی کو تم کیا نام دو گی.....؟“ وہ اخباری بیانات اور سنی سنائی کی بنیاد پر اسے سمجھا رہا تھا۔

عبادہ تلخی سے مسکرائی۔

”جن لوگوں نے مجھ سے شادی کی پیش کش کی ہے آپ کو ان کا بیک گراؤنڈ معلوم ہے.....؟ نہیں.....! لیکن میں جانتی ہوں وہ سارے میرے بھائی کی پارٹی سے تعلق رکھنے والے شاہ جی کے پٹھو ہیں۔ جنہیں چارہ بنا کر وہ اپنی سیاست اور نیک نامی میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ آپ کے خیال میں وہ نوجوان جن کا اپنا کوئی مستقبل نہیں، جن کی اپنی زندگی دوسروں کے پاس رہن رکھی ہے، موت ہر دم جن کے تعاقب میں رہتی ہے۔ میرا سہارا بن سکتے ہیں.....؟ کبھی بھی نہیں۔ آج اگر میں اپنے بھائی کی وجہ سے لٹی ہوئی ہوں تو کل ایسے کسی شخص کو اپنی زندگی کا ساتھ بنا کر برباد ہو جاؤں گی۔ مجھے سہارے کی پیشکش کرنے والوں میں سے ایک بھی نام کسی عزت دار شخص کا نہیں۔ عزت دار لوگ میری حالت پر افسوس تو کر سکتے ہیں لیکن مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا

فیصلہ نہیں۔ آپ بھی تو ہیں جنہیں مجھ سے ہمدردی ہے، جو مجھے بے قصور مانتے ہیں لیکن کیا آپ مجھے سہارا دے سکتے ہیں.....؟ کیا آپ میں اتنی ہمت ہے کہ مجھے اپنی بیوی کے حیثیت سے معاشرے کے سامنے لے جا سکیں.....؟“ اس کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے جلوں نے حاشر حسن کو گنگ کر دیا تھا۔ وہ اس کے سوالوں کے جواب دیئے بغیر ایک تک اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

”آپ ایسا نہیں کر سکتے، میں آپ سے ایسا کرنے کے لئے کہہ بھی نہیں رہا لیکن آپ کو بھی کوئی حق حاصل نہیں کہ مجھے زندہ رہنے کی نصیحت کریں اور اس معاشرے میں اچھے لوگوں کی موجودگی پر دلیل دیں۔“ وہ لب بستہ کھڑے حاشر حسن کے وجود پر طرے کے تیر چلا رہی تھی۔

”سہارا دینے والی ذات تو صرف اللہ کی ہوتی ہے۔ رہا تمہیں بیوی کی حیثیت سے معاشرے میں متعارف کروانے کا سوال تو میں اس کے لئے راضی ہوں۔ کل ہسپتال کے اسی کمرے میں میں تم سے نکاح کروں گا۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو درجے تک تیار رہنا۔“

اب خاموش رہنے کی باری عبادہ عبدالمبین کی تھی۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے حاشر حسن کو دیکھ رہی تھی جو دروازے کے قریب ہی پتھر بنی سسٹر ماریہ کی سائینا سے نکل کر کمرے سے باہر جا رہا تھا۔

☆☆☆

”آر یو سیریس حاشر.....! کہیں یہ تمہارا جذباتی فیصلہ تو نہیں.....؟“ ڈاکٹر صولت بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے پوچھ رہے تھے۔ انہیں اور ڈاکٹر ہادی کو حاشر نے بطور خاص فون کر کے اپنے نکاح میں گواہان کی حیثیت سے شرکت کرنے کی دعوت دی تھی۔

”لیں.....! آئی ایم سیریس سر.....! دیے بھی ایسے فیصلے جذبات میں نہیں کئے جاتے۔ میں نے سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔“ حاشر حسن کا لہجہ اٹل تھا۔

”اوکے.....! جیسی تمہاری مرضی.....! ہمیں بھلا اس بات پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے.....؟“ ڈاکٹر صولت نے بھی لاپرواہی سے کاندھے اچکاتے کہا جبکہ ڈاکٹر ہادی ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز حسب عادت ٹیبل پر پڑا سپردیٹ انگلیوں کی مدد سے گھما رہے تھے۔

عبادہ عبدالمبین نے ہسپتال کے اس کمرے میں جہاں بیٹھ کر وہ اپنی زندگی کو ختم کرنے کے طریقے سوچا کرتی تھی، زندگی میں در آنے والی اس تبدیلی کو حیرت سے دیکھا تھا، ڈاکٹر حاشر حسن، جس کی ذہانت، وجاہت اور دولت کی اکثر ڈاکٹرز اور نرسیں دیوانی تھیں، بن مانگے اس کی تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا۔

”میں نے کہا تھا ناں بیک مین.....! کہ تمہیں کسی خاص مقصد کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔“ نکاح کے بعد اسے گلے لگاتے ڈاکٹر ہادی نے کہا تھا۔

”تمہارا کہنا تھا کہ منتخب لوگوں کو انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ ذرا دیکھو اس لڑکی کی طرف اور بتاؤ کہ یہ تمہارے لئے قدرت کی طرف سے عطا کیا گیا انعام نہیں تو کیا ہے.....؟“ ڈاکٹر ہادی کی بات پر اس نے ذرا سا رخ موڑ کر عبادہ عبدالمبین کی طرف دیکھا تھا۔ سسٹر ماریہ نے نہایت ایمر جنسی میں بھی اسے باقاعدہ دلہن بنا ڈالا تھا۔ اس کے وجود پر سجا ہلکا کامدار گلانی سوٹ اور میک اپ یقیناً انہی کی مہربانیاں تھیں۔ حاشر حسن کی نگاہوں کے ارتکاز پر اس نے پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر اس کی شوخ نظروں سے نظر ٹکرانے پر بے ساختہ ہی گھبرا کر پلکوں کی چلن گرا گئی تھی۔ اس کی پلکوں کی لرزش سے ملاحظہ ہوتا حاشر حسن لکھت ہی مسکرا دیا تھا۔ وہ لڑکی واقعی اسے اپنے لئے قدرت کا انعام محسوس ہو رہی تھی۔

”انہیں ابھی ایڈمٹ رکھنا ہوگا سر.....! یا میں گھر لے جاؤں.....؟“ اس نے ڈاکٹر صولت سے پوچھا تھا۔

”ہم اگر روکیں گے بھی تو تم اتنی حسین دلہن کو چھوڑ کر جانے کے لئے راضی تو نہ ہو گے۔“ ڈاکٹر صولت نے تازہ تازہ گلاب جاسن سے لطف اندوز ہوتے اسے چھیڑا

تھا، آج وہ اپنے ہمیشہ کے کلف زدہ لہجے کے بجائے بڑی محبت سے اس سے مخاطب ہو رہے تھے۔

”نوسر.....! ایسی کوئی بات نہیں، اگر ضرورت ہے تو آپ انہیں روک سکتے ہیں۔“ وہ ان کے مذاق پر جھینپ گیا تھا۔

”نہیں بھی.....! ہم اتنے ظالم نہیں، ویسے بھی جب ڈاکٹر کے ساتھ بیٹی رخصت کرنی ہو تو اس کی صحت کے بارے میں فکر مند ہونا بیکار ہی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے ڈاکٹر ہادی.....! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں.....؟“ ڈاکٹر صولت نے ڈاکٹر ہادی کو بھی اپنے ساتھ شامل کیا۔ حاشر کے گڑبڑاتے انداز کو دیکھ کر ڈاکٹر ہادی بھی مسکراتے ہوئے ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

آن ڈیوٹی اسٹاف اور پولیس کے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں عبادہ عبداللہین کو اپنی بیوی کی حیثیت سے لے کر وہ ہاسپٹل کی عمارت سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتا تھا۔ عبادہ فرنٹ سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھی بے یقینی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ حاشر حسن کوئی خواب ہے جو پلکیں جھپکتے ہی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا۔

”کیا دیکھ رہی ہو.....؟“ حاشر نے اچانک ہی سڑک پر سے نظر ہٹا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”ک..... کچھ نہیں.....!“ وہ گھبرا کر نظر جھکائی تھی۔

”یقین کر لو کہ میں کوئی خواب نہیں، حقیقت ہوں جو کبھی تمہارا ساتھ چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“ اس کے دائیں ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ کی گرفت میں لیتے اس نے یقین دہانی کروائی تھی۔ عبادہ کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے ہاتھ کی پشت پر گرنے لگے۔

اس نے یکفخت ہی گاڑی کو بریک لگائے تھے۔ پیچھے سے آنے والا ٹریفک اس کی اس اچانک حرکت پر ڈسٹرب ہوا۔ کئی گاڑیوں کے ہارن اور بریکس کی آوازیں

ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

”کیا ہوا.....؟ گاڑی خراب ہوگئی.....؟“ وہ ارد گرد سے بلند ہوتی آوازوں پر بوکھلا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”گاڑی نہیں، میرا موڈ خراب ہو گیا ہے اور جب بھی تمہاری آنکھوں میں آنسو دکھائی دیئے یہ موڈ ایسے ہی خراب ہو جایا کرے گا۔“ وہ آس پاس سے گزرنے والی گاڑیوں کے ڈرائیورز کی غصیلی نگاہوں سے لاپرواہ بڑے اطمینان سے اس سے مخاطب تھا۔

”ٹھیک ہے.....! میں آئندہ کبھی نہیں روؤں گی لیکن آپ گاڑی تو چلائیں۔“ رخصتوں پر بہتے آنسو جلدی جلدی خشک کرتے وہ بولی۔

”وعدہ.....؟“ اپنا نازک ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں دیتے وہ مسکرائی۔

حاشر حسن نے پہلی بار اسے مسکراتے دیکھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اسے ہل میں اپنا دل مسکراہٹ کی کرنوں میں قید ہوتا محسوس ہوا۔

”اب چلا بھی چکیں گاڑی.....! ورنہ لوگ اس گاڑی سمیت ہم دونوں کو اٹھا کر پھینک دیں گے۔“

اس کی نگاہوں کی بے خودی پر جھینپتے عبادہ نے اسے ٹوکا تو وہ بھی ہوش میں آتے گاڑی آگے بڑھانے لگا۔ اس وقت اس کا رخ اپنے گھر کے بجائے عماد کے فلیٹ کی طرف تھا۔ عماد کو ساری صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے اس نے کچھ حصہ اس کے فلیٹ پر قیام کی اجازت مانگی تھی۔ عبادہ کو ڈائریکٹ گھر لے جانے کے بجائے وہ پہلے می اور ڈیڈی کو اس کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔

”عماد صاحب نے فلیٹ کی یہ چابیاں آپ کے لئے بھیجی ہیں، انہیں کسی کام سے شہر سے باہر جانا تھا اس لئے وہ خود نہیں آئے۔“ پارکنگ میں ہی عماد کے ایک ملازم نے اسے چابیاں تھماتے ہوئے بتایا تھا۔ وہ سر کو آہستہ سے جنبش دیتا عبادہ کو لے کر لفٹ

کی طرف بڑھ گیا۔ سیکنڈ فلور پر واقع عماد کا یہ فلیٹ ہر طرح کی سہولیات سے آراستہ تھا۔
 ”تم یہاں آرام کرو، اگر بھوک محسوس ہو تو فریج میں دیکھ لینا، بہت کچھ مل جائے گا۔ فی الحال میں تمہارے پاس نہیں رک سکنا۔ مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔ اگر دیر ہو جائے تو تم گھبراننا نہیں۔“ عبادہ کو تسلی دیتے وہ انہی قدموں سے واپس پلٹ گیا تھا۔
 اب اس کی گاڑی کا رخ ڈیڑی کے آفس کی طرف تھا۔

”کہو! کیسے آئے ہو.....؟“ اپنے سامنے موجود فائل پر نظر جمائے جمائے ڈیڑی نے مصروف سے انداز میں اس سے پوچھا۔

”مجھے آپ کو ایک اہم بات بتانی ہے ڈیڑی!.....! امید ہے آپ مجھ سے ناراض نہیں ہوں گے۔“

آج پہلی بار وہ ان کے سامنے بات کرتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ حسن ریاض صاحب بھی اس کے لہجے کے غیر معمولی پن پر سوالیہ نظروں سے دیکھتے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ البتہ زبان سے انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔

”میں نے شادی کر لی ہے ڈیڑی!.....!“ اپنے تئیں اس نے دھماکہ کیا تھا لیکن حسن ریاض صاحب بنا چوٹے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اس اطلاع پر ان کی حالت میں بس اتنا تغیر پیدا ہوا تھا کہ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پین ہولڈر میں واپس رکھ کے اپنی چیئر کی بیک سے پشت نکالی تھی۔

”کس سے کی ہے شادی.....؟“ ان کے انداز کی طرح ان کا لہجہ بھی بہت پرسکون تھا۔ وہ آسانی سے غصے میں نہیں آتے تھے۔ ان کے کامیاب بزنس مین ہونے کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی۔

”آپ اسے نہیں جانتے۔ مجھے ہاسپٹل میں ہی ملی تھی۔“ وہ یکدم ہی سب کچھ بتانے کی ہمت نہ کر سکا۔

”ڈاکٹر ہے.....؟“ حسن ریاض صاحب نے سوال کیا۔

”نہیں پیشہ۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”باپ کیا کرتا ہے اس کا.....؟“ حسن ریاض صاحب کی پیشانی پر سلوٹیں پڑنے لگیں۔ کسی سرکاری اسپتال میں علاج کے لئے آنے والی لڑکی کا فیملی بیک گراؤنڈ مضبوط ہونے کے چانسز بہت کم تھے۔

”ان کے والد کی ڈیجھ ہو چکی ہے۔“

”ماں، بھائی، بہن، چچا، تایا میں سے کوئی.....؟“ انہوں نے جانا چاہا۔

”نہیں!.....! کوئی نہیں!.....! وہ دنیا میں بالکل اکیلی ہے۔“

”کوئی نہیں اس کا.....؟ تو کیا آسمان سے براہ راست ٹپکی ہے وہ زمین پر.....؟“ حسن ریاض صاحب کا غصہ آہستہ آہستہ ابھرنے لگا تھا۔

”ڈیڑی!.....! وہ جو پچھلے دنوں پولیس والوں نے ایک لڑکی کے ساتھ گینگ ریپ کیا تھا، یہ وہی لڑکی ہے۔“ کوئی چارہ نہ پا کر آخر اس نے انہیں بتا ہی دیا۔ ویسے بھی یہ خبر چھپنے والی نہیں تھی آج شام یا زیادہ سے زیادہ کل صبح کے اخبارات میں اس خبر کو آ ہی جانا تھا۔ عبادہ عبدالمکین، اور مشہور انڈسٹریلسٹ حسن ریاض کا بیٹا حاشر حسن اس سوسائٹی کے اتنے گمنام کردار نہیں تھے کہ ان کے متعلق کوئی بات خبر بننے سے محفوظ رہ جاتی۔

”کیا بیہودہ بکواس کر رہے ہو تم.....؟“ حسن ریاض کی شخصیت کا سارا دھیمہ پن دھرا کا دھرا رہ گیا تھا اور وہ حلق کے بل دھاڑے تھے۔

”یہ بکواس نہیں، سچ ہے ڈیڑی!.....!“ اس نے سر جھکائے جھکائے دھیمے مگر مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

”تم کسی ریڈ لائٹ ایریا کی لڑکی سے شادی کر لیتے تو اتنی بدنامی نہیں ہوتی ہماری، جتنی اس لڑکی سے شادی کرنے کے نتیجے میں ہوگی۔ آخر تم نے کیا سوچ کر یہ فضول حرکت کی ہے.....؟“ حسن ریاض صاحب بہت مشکل سے اپنی آواز کو کنٹرول کر رہے تھے۔

”وہ میری بیوی ہے ڈیڑی!.....! اور میں اس کے بارے میں کوئی فضول بات

فلیٹ میں قیام کروانا نہایت ضروری تھا۔ حاشر حسن سمجھ سکتا تھا کہ یہ صرف ایک بہانہ ہے۔ دراصل ڈیڈی میدان میں نکل آئے ہیں اور انہوں نے عماد کے والد کے ذریعے اس پر زور ڈال کر سب سے پہلے حاشر حسن کو ایک چھت کے تحفظ سے محروم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نے عماد سے کوئی شکوہ کئے بغیر دو دن میں فلیٹ خالی کر دینے کی یقین دہانی کر دئی تھی۔ عماد کے علاوہ بھی ابھی اس شہر میں اس کے کئی دوست اور مہربان تھے۔ لیکن اگلے ہی روز ہونے والے یکے بعد دیگرے دو واقعات نے اسے اپنے کسی بھی دوست سے رابطہ نہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

اچھا خاصا اثر و رسوخ رکھنے والے ڈاکٹر صولت مرزا کا تبادلہ اچانک ہی کسی دوسرے شہر میں کر دیا گیا تھا، حسن ریاض جیسے پاورفل شخص کے سامنے ان کا اثر و رسوخ بہت کم تھا۔ جبکہ ڈاکٹر ہادی کے کلینک پر کچھ شرانگیز عناصر نے کافی توڑ پھوڑ مچائی تھی۔ یہ دونوں حادثے حاشر کے لئے تنبیہ تھے کہ وہ اپنے کسی دوست کو اپنی وجہ سے مشکل میں نہ ڈالے۔ صورت حال اتنی بری طرح حاشر کے حق میں بگڑ گئی تھی کہ وہ بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ عماد کی دی گئی دو دن کی مہلت میں سے ڈیڑھ دن گزر چکا تھا اور وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس باقی آدھے بج جانے والے دن میں کس طرح وہ اپنے اور عبادہ کے لئے ٹھکانہ تلاش کرے گا۔ اس کی جیب میں مشکل سے پندرہ ہزار روپے موجود تھے اور ان پندرہ ہزار میں کسی درمیانے درجہ کے ہوٹل میں بھی چند دن سے زیادہ قیام نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کرائے پر گھر لے کر رہنے کا خیال بھی اس کے دل میں آیا تھا لیکن وہ ایک دن میں متوسط درجے کی آبادیوں کے کئی وزٹ کرنے کے بعد جان چکا تھا کہ یہ بھی اس کے لئے ممکن نہیں۔ وہاں بھی گھر کرائے پر دیتے وقت کم از کم بیس پچیس ہزار روپے ایڈوانس کی مد میں وصول کئے جاتے ہیں اگر وہ ان میں سے کسی کو کسی طرح پندرہ ہزار ایڈوانس پر راضی بھی کر لیتا تو دیگر مسائل اسی طرح باقی رہتے۔ انہیں گھر کے لئے بنیادی ضرورت کے سامان، کھانے پینے کی اشیاء سے لے کر بسوں وغیرہ کے کرائے کے لئے بھی کافی رقم درکار تھی۔

سننا پسند نہیں کروں گا۔“ اس نے انہیں ان کے الفاظ پر ٹوکا تھا۔
 ”ہونہہ بیوی.....؟ پہلی فرصت میں طلاق دواے۔ میں ابھی اوپر بات کر کے اس خبر کو اخبار میں آنے سے روکتا ہوں۔“ استہزائیہ لہجے میں کہتے انہوں نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

”میں اسے ہرگز بھی طلاق نہیں دوں گا ڈیڈی.....! چاہے آپ اور می اسے قبول کریں یا نہیں۔“ اس کے اٹل لہجے نے ان کی نمبر ڈائل کرتی انگلیوں کو ساکت کیا تھا۔

”اوکے.....! مت دو تم اسے طلاق۔ لیکن اس کے بدلے تمہیں ماں باپ، بہن بھائی اور جائیداد سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔“ وہ ایک خالص بزنس مین کی طرح اس سے ڈیل کر رہے تھے۔

”مجھے منظور ہے۔“ گاڑی کی چابی ان کے سامنے میز پر ڈالتے وہ تیز تیز قدموں سے چلا ان کے آفس سے باہر نکل گیا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے وہ اس آفس میں داخل ہوا تھا تو اس کے پاس نئے ماڈل کی چھپاتی ہوئی گاڑی موجود تھی اور اب صرف ایک کھٹنے سے بھی کم وقت میں وہ اس گاڑی سمیت تمام دولت اور رشتوں سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

”اے مسٹر.....! تم کہاں سڑکوں پر چہل قدمی کرتے پھر رہے ہو.....؟“ پیدل سڑک کے کنارے چلتے حاشر حسن کے قریب گاڑی روک کر اس میں سے سر نکالتے طریقہ نے پوچھا تھا۔ اس کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر حاشر حسن غائب دماش سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ڈیڈی کے آفس سے وہ واپس عماد کے فلیٹ پر گیا تھا۔ جہاں رات آٹھ بجے اس نے عماد کی کال وصول کی تھی۔ وہ اس سے معذرت کرتے ہوئے دو دن کے اندر اس سے فلیٹ خالی کرنے کی درخواست کر رہا تھا۔ بقول اس کے دو دن بعد اس کا ایک کزن لندن سے آنے والا تھا۔ جسے اس کے کئی کنال پر پھیلے گھر کو چھوڑ کر اس

اپنے باپ کے کامیاب برنس میں ہونے کے کئی راز کھل کر اس کے سامنے آ رہے تھے۔ وہ ایک نہایت شاطر دماغ رکھنے والے انسان تھے جس کی نظر براط پر موجود ہر مہرے پر تھی۔ اولاد کو بے تحاشا سہولیات دینے کے باوجود اسے قابو میں رکھنے کے لئے انہوں نے سارے پتے اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے تھے۔ پورے شہر میں کوئی بھی پراپرٹی ایسی نہیں تھی جس کا حاشر حسن تنہا حقدار ہو۔ ہر پلازہ اور شاپنگ سینٹر میں اس کے ساتھ عاشق اور امین بھی حصہ دار تھے اور ان دونوں کی اجازت کے بغیر وہ ان میں سے کوئی شے تنہا اپنی مرضی سے بیچنے کا مجاز نہیں تھا۔ یہاں تک بینک میں موجود اس کا اکاؤنٹ بھی، صرف اس کا نہیں تھا وہ اس کا اور حسن ریاض کا جوائنٹ اکاؤنٹ تھا۔ ابھی ابھی وہ اپنے بینک سے ہی باہر نکلتا تھا جہاں سے اس کا صرف دس ہزار کا چیک یہ کہہ کر لوٹا دیا گیا تھا کہ اکاؤنٹ میں اتنی رقم موجود نہیں۔ وہ اکاؤنٹ جہاں سے وہ اس سے بھی بڑی رقمیں بغیر کسی مشکل کے نکالتا رہا تھا اچانک کیسے زیرو پر چلا گیا تھا، وہ سمجھ سکتا تھا۔

”کیا اس سڑک کے کنارے کھڑے کھڑے ہی زندگی گزار دو گے تم.....؟“
 طربہ کی آواز نے اس کے خیالوں کا سلسلہ توڑا تھا اور وہ یکدم تھکے تھکے انداز میں خود کے لئے کھولے گئے گاڑی کے دروازے سے اندر داخل ہو کر سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔
 ”پریشان ہو.....؟“ طربہ نے بیک ویو مرر کو صحیح طرح ایڈجسٹ کرتے اس سے پوچھا اور وہ تو جیسے کسی سہارے کا متلاشی تھا۔ الف سے بے تک ساری تفصیل اس سے کہہ گیا۔

”بس.....! اتنی سی بات ہے یہ، تو کوئی مسئلہ نہیں گلشن میں میرا ایک فلی ڈیکورینڈ فلیٹ خالی پڑا ہے، تم چاہو تو اپنی وائف کے ساتھ اس میں رہ سکتے ہو۔“ اس نے گویا چنگی بجاتے اس کا مسئلہ حل کر ڈالا تھا۔

”جو میری مدد کرنا چاہتا ہے ڈیڈی اس کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ یہ بات میں نے تمہیں ابھی ابھی بتائی ہے اور تم پھر بھی مجھے اپنے فلیٹ کی آفر کر رہی ہو۔“
 حاشر نے یوں اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا جیسے اسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

”تمہارے ڈیڈی جیسے کئی میری مٹھی میں رہتے ہیں۔ مجھے ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ طربہ نے جیسے اپنے کان پر سے کبھی اڑائی۔
 ”میں نے تمہیں حالات سے آگاہ کر دیا ہے، اگر تمہیں کوئی خطرہ نہیں تو مجھے بھی تمہاری بات ماننے سے انکار نہیں۔ بہر حال مجھے تو سر چھپانے کے لئے ایک ٹھکانہ چاہئے۔“ اس کی لاپرواہی کو دیکھتے ہوئے حاشر حسن اس کی سیفٹی کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”تم کھانا بہت اچھا بناتی ہو۔“ گرم گرم روٹی سے بھنی ہوئی مونگ کی دال کھاتے ہوئے اس نے عبادہ کو مخاطب کیا۔ عبادہ اس کی بات پر صرف ہلکے سے مسکرا کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ حاشر حسن نے اپنی ساری زندگی میں اس ٹائپ کے کھانے نہیں کھائے ہوں گے اور اس وقت بھی وہ صرف اس کا دل رکھنے کے لئے ایسا کہہ رہا ہے۔
 ”تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔“ حاشر حسن اس کی مسکراہٹ میں چھپے منہوم کو بھانپ گیا تھا۔

”میں جانتی ہوں کہ یہ کھانا آپ کے اسٹینڈرڈ کا نہیں ہے، صرف میری وجہ سے آپ کو اتنی تکلیفیں برداشت کرنا پڑ رہی ہیں۔“ پانی کے لئے جگ کی طرف ہاتھ بڑھاتے اس نے اُداسی سے جواب دیا تھا۔ حاشر حسن نے اس کا ہاتھ جگ تک پہنچنے سے پہلے اپنی گرفت میں لے لیا۔

”تم کبھی تو میری بات کا یقین کر لیا کرو عبادہ.....! میرے رویے میں آخر ایسی کون سی بات ہے جو تم ہر دم احساسِ ندامت سے دبی رہتی ہو۔ تمہارا ہر وقت اس طرح سے سوچنا ہمیں نارمل لائف سے دور لے جائے گا۔ اپنی بیوی کی خوبصورتی، اخلاق اور گھڑپن کو سراہنا میرا حق ہے، لیکن تمہارا ایب نارمل رویہ ہماری زندگی کی ان معمولی معمولی خوشیوں کو بھی ہم سے چھین لے گا۔“ وہ بہت محبت سے اسے سمجھا رہا تھا۔

”میں آپ کو بہت خوش دیکھنا چاہتی ہوں لیکن یہ احساس کہ میری خاطر،

صرف میری وجہ سے آپ اتنی عیش و آرام کی زندگی کو چھوڑ کر اس طرح سے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں مجھے چین نہیں لینے دیتا۔“ اس کے لہجے میں سچائی اور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔

”آنسو.....! تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا موڈ آف ہو جاتا ہے یہ بات میں نے پہلے بھی بتائی تھی اور اب پھر بتا رہا ہوں کہ تمہارے آنسوؤں نے میرا موڈ خراب کر دیا ہے اور اسے درست کرنے کے لئے تم کیا کرتی ہو یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔“ وہ سامنے رکھے کھانے کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے دونوں ہاتھ باندھ کر اطمینان سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا تھا۔

”سنیں.....! آپ کھانا تو کھالیں.....!“ عبادہ نے بے بسی سے اسے پکارا، اس کے اس انداز پر حاشر نے بمشکل اپنے لبوں پر مسکراہٹ کو آنے سے روکا۔ وہ کبھی بھی اسے اس کے نام سے نہیں پکارتی تھی۔

”اچھا.....! صرف ایک بار آنکھیں کھول کر دیکھیں۔“ اس کے بے انتہا لجاجت سے کہنے پر حاشر کو آنکھیں کھولتی پڑیں۔

”اب منہ بھی کھول دیں۔“ وہ نوالہ اس کی طرف بڑھاتی کہہ رہی تھی۔ حاشر نے بے اختیار ہنستے ہوئے اس کی بات پر عمل کیا۔ اسے پتا تھا کہ اس کی خصوصی توجہ ہو عبادہ کا کھویا ہوا اعتماد بحال کر سکتی تھی۔ اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کے ساتھ ہی اس نے اسے اپنی ذمہ داریوں میں پہلا نمبر دے دیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے ہر پل میں اس کا ساتھ اور اعتماد چاہتا تھا۔ طریقہ کے دیئے اس فلیٹ میں شفٹ ہوتے ہی اس نے اپنے پاس موجود رقم اس کے حوالے کرتے ہوئے اسے بجٹ بنانے کی ذمہ داری سونپ دی تھی کیونکہ وہ خود کبھی یہ کام نہیں کر سکتا تھا البتہ عبادہ نے اس ذمہ داری کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا تھا۔ اس وقت ان کے اہم اخراجات اشیائے خورد و نوش کی خریداری اور حاشر کے ہاسپٹل آنے جانے کا کرایہ تھا۔ گھریلو استعمال کی دیگر اشیاء طریقہ کے فلیٹ میں موجود تھیں۔ رقم کے سلسلے میں بھی اس نے حاشر کو مدد کی آفر کی تھی لیکن حاشر نے

اسے انکار کر دیا تھا۔ وہ اس قدر اس کا مقروض نہیں ہوتا چاہتا تھا کہ کبھی اس قرض کو اُتار بھی نہ سکے۔ اسے یوں بھی طریقہ کے اپنی اتنی زیادہ مدد کرنے پر حیرت تھی اور اس نے اس حیرت کا اس کے سامنے اظہار بھی کر دیا تھا۔

”یہ سب میں تمہارے لئے نہیں، عبادہ کے لئے کر رہی ہوں، اگر آج میں نے اس کی مدد نہیں کی تو کل وہ بھی طریقہ بن جائے گی اور میں اسے طریقہ بننے سے بچانا چاہتی ہوں وہ عزت کی زندگی گزارتی رہی ہے، ذلت کا اس قدر زہر برداشت نہ کر سکے گی۔“ طریقہ نے نہایت صاف گوئی سے اسے جواب دیا تھا۔

☆☆☆

انصاری صاحب کے بنگلے سے نکل کر مین روڈ کی طرف جاتے ہوئے اس نے ایک گاڑی کو تیزی سے قریب سے گزرتے دیکھا۔ گاڑی کی تیز رفتاری کے باوجود اس نے فرنٹ سیٹ پر ذوالفقار کے ساتھ بیٹھی ایمین کو پہچان لیا تھا۔ وہ انصاری صاحب کے گھر ان کی بیٹی کو میڈیکل کے Aptitude ٹیسٹ کی تیاری کروانے آ رہا تھا۔ ہاؤس جاب میں مصروف ہونے کی وجہ سے فی الحال وہ کوئی بھی فیل ڈے جاب کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ایک ٹیوٹرز اکیڈمی کے تھرو اس نے اپنے لئے یہ ٹیوشن ڈھونڈی تھی۔ ساتھ ہی اس نے اکیڈمی میں فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کے اسٹوڈنٹس کو بیالوجی پڑھانے کی ذمہ داری بھی لے لی تھی۔ باقاعدگی سے کہیں جاب کرنے کے مقابلے میں اپنی ڈیوٹی کی مناسبت سے اسٹوڈنٹس کے ساتھ ٹائمنگ ایڈجسٹ کر لینا آسان تھا۔ اس سلسلے میں اکیڈمی کی انتظامیہ بھی اس کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہی تھی۔

ڈیڈی کی طرف سے بھی آج کل خاموشی چھائی ہوئی تھی اس لئے بھی وہ کچھ پرسکون ہو کر اپنی زندگی کے اس فیز سے ٹکٹنے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ عبادہ کے ساتھ کی وجہ سے بھی اس کی زندگی میں بہت ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ اس کی صرف ایک مسکراہٹ حاشر کی دن بھر کی تھکن اُتارنے کے لئے کافی ہوتی تھی۔ خاتون خانہ کی توجہ کس طرح مرد کو گھر سے باندھ لیتی ہے، اس تجربے سے بھی وہ پہلی بار گزرا تھا۔ عبادہ کا اپنے

اس گھر کو چھوڑ کر جا چکے ہو اس لئے بہتر ہے کہ یہاں کے معاملات میں دخل دینا بھی چھوڑ دو۔“ مئی نے غصے سے فون بیچ دیا تھا۔ وہ بے چینی سے ریسپور کو گھور کر رہ گیا۔

☆☆☆

”طربہ پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا ہے۔“ وہ عبادہ کا چیک آپ کروانے کے بعد واپس گھر پہنچا ہی تھا کہ اسے فون پر یہ اطلاع ملی اور جو عبادہ کے ماں بننے کی خبر سن کر بے تحاشا خوش تھا، یکدم ہی تفکرات میں گھر گیا۔ طربہ کے اوپر قاتلانہ حملے کا مطلب تھا کہ ڈیڈی خاموشی کے چند ماہ گزارنے کے بعد ایک بار پھر میدان میں اتر چکے ہیں۔ اب تک بھی شاید وہ مصلحتاً خاموش تھے، طربہ کے اعلیٰ عہدیداروں سے تعلقات کی بناء پر وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھانے پر مجبور تھے اور اب اتنے عرصے بعد جب عبادہ والے معاملے کی دھول بیٹھنے لگی تھی وہ دوبارہ فارم میں آگئے تھے۔ یقیناً ان کا خیال تھا کہ اب کسی کو ان پر شک نہیں ہوگا اور اس حملے کو معمول کا ایک حملہ سمجھا جائے گا۔ لیکن حاشر حسن کا پہلا شک ان ہی کی طرف گیا تھا اور اس نے ایک عالم جنون میں گھر کے نمبر ڈائل کئے تھے۔

”اگر اب میرے کسی دوست یا ہمدرد کو ڈیڈی کے ہاتھوں نقصان پہنچا تو میں چپ نہیں بیٹھوں گا۔ آپ یہ بات ضرور انہیں سمجھا دیجئے گا۔“ مئی کے فون پر آتے ہی اس نے بلا تمہید کہا تھا۔

”تمہارے کس دوست کو نقصان پہنچایا ہے حسن نے جو تم اتنے غصے میں ہو.....؟“ اس کے لہجے سے خائف ہو کر مئی نے پوچھا تھا۔

”طربہ پر قاتلانہ حملہ کروایا ہے انہوں نے مئی..... وہ بال بال بچی ہے اس حملے میں۔ اس بار تو میں کچھ نہیں کر رہا لیکن اگر آئندہ ایسا کوئی حادثہ ہوا تو ڈیڈی بھی خود کو بچا نہیں سکیں گے۔“

”کیا کر لو گے تم ان کا، تمہارے اختیار میں ہے ہی کیا۔ ان سے اُلجھنے سے بہتر ہے کہ تم ان سے مصالحت کر لو حاشر.....!“ مئی نے اسے سمجھایا۔

کپڑے دھونا، استری کرنا، اپنے ہاتھوں سے کھانا تیار کر کے کھانا سب کچھ اتنا پرکشش تھا کہ وہ نوکروں کے رحم و کرم میں پلنے بڑھنے اور گزارا کرنے والا حاشر حسن اس کی طرف کھینچا ہی چلا جا رہا تھا۔ پیسے کے ذریعے حاصل کی گئی سہولیات اور محبت سے دی جانے والی مراعات میں بھی اسے فرق پتا چلنا شروع ہو گیا تھا۔ عبادہ کے ساتھ گزرنے والے ان دو مہینوں نے اسے حسن والا کے کینوں کا چوبیس سالہ ساتھ بھلا دیا تھا۔ لیکن ابھی ایمن کو ذوالفقار کے ساتھ دیکھ کر اسے شدید جھٹکا لگا تھا۔ مین روڈ پر پہنچ کر جیسے ہی اس کی نظر ایک پی سی او پر پڑی وہ مئی کو فون کرنے کے ارادے سے وہاں داخل ہو گیا۔ اس کا موبائل پچھلے پندرہ دن سے کارڈ ختم ہو جانے کے باعث بیکار پڑا تھا۔

”مئی.....! ایمن کہاں ہے.....؟“ سلام دُعا سے فارغ ہوتے ہی اس نے چھوٹے ہی مئی سے ایمن کے بارے میں پوچھا تھا۔

”وہ اپنی دوست چنگی سے ملنے گئی ہے۔“ مئی جو اس کے رابطہ کرنے پر حیران تھیں، اس کے ایمن کے بارے میں پوچھنے پر مزید حیران ہوئیں۔

”وہ اس وقت اپنی کسی دوست کے ساتھ نہیں مئی.....! اسے ذوالفقار کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھے میں نے خود دیکھا ہے۔“ اس نے غصے سے کھولتے ہوئے مئی کو ایمن کے بارے میں آگاہ کیا۔

”سو واٹ.....؟ ذوالفقار چنگی کا بھائی ہے۔ ایمن کو اس کے گھر ڈراپ کر کے ڈرائیور واپس آ گیا تھا۔ اب یقیناً ذوالفقار اسے گھر ڈراپ کرنے آ رہا ہوگا۔“ مئی مطمئن تھیں۔

”تو ڈرائیور کو واپس گھر بھیجنے کی کیا تک تھی.....؟ ایمن کو چاہئے تھا کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ ہی واپس گھر آتی۔“ حاشر کو ان کے اطمینان پر غصہ آنے لگا۔

”اگر تم ٹل کلاس کے گھٹیا لوگوں کے ساتھ رہ رہ کر ان جیسی سوچ کے مالک ہو گئے تو ضروری نہیں کہ اپنے ان خیالات کا اظہار کرنے کے لئے ہمیں فون بھی کیا کرو۔ ایمن ہماری ذمہ داری ہے اس کے اچھے بھلے کے بارے میں سوچنا بھی ہمارا کام ہے، تم

”اگر میں نے کبھی اپنے اختیارات کا استعمال نہیں کیا تو آپ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میرے اختیار میں کچھ ہے ہی نہیں۔ میں میڈیا کے ذریعے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ عبادہ عبدالمبین کو عبادہ حاشر بنے ابھی اتنا عرصہ نہیں گزرا کہ لوگ اسے بھول گئے ہوں اگر ایک بھی پریس کانفرنس کر کے میں نے ڈیڈی کی حرکتوں کے بارے میں بیان دے دیا تو سارے شہر میں ان کے خلاف مظاہرے شروع ہو جائیں گے۔ عبادہ کی زندگی میں مشکلات پیدا کرنے والے کے خلاف، چاہے اپنی سیاست چکانے کی غرض سے ہی سہی کون کون سے لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے آپ اور ڈیڈی اس بات کا تصور نہیں کر سکتے۔“ اس نے می کو دھکایا تھا۔

”تو تم اب اس رسوائے زمانہ لڑکی کی خاطر دنیا کے سامنے اپنے باپ کا تماشہ بنواؤ گے.....؟“ می نے طنز سے پوچھا۔

”وہ رسوائے زمانہ لڑکی میری بیوی ہے اس بات سے ڈیڈی سمیت سارا شہر واقف ہے۔ اگر آپ ڈیڈی کو تماشہ بنانے سے ڈرتی ہیں تو انہیں سمجھائیں کہ وہ بھی تماشے کرنا چھوڑ دیں۔“ می کی بات کا تیزی سے جواب دیتے اس نے فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

تیز رفتار گاڑی سے ٹکرا کر وہ بچی بہت تیزی سے اوپر کی طرف اچھلی تھی اور اس کے واپس زمین پر پہنچنے سے قبل ہی گاڑی والا تیز رفتاری کے سارے ریکارڈ توڑنا نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ پیچھے سے آتی مرگلہ میں بیٹھے حاشر نے یہ سارا منظر اچھی طرح دیکھا تھا اور باوجود جلدی میں ہونے کے بے اختیار ہی گاڑی روک دی تھی۔

بچی کے ماں باپ اس دوران اس تک پہنچ چکے تھے۔ ماں اپنی چادر کے پلو سے اس کے زخموں سے بہتا خون روکنے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ باپ مدد کے لئے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ حاشر کے گاڑی روکتے ہی وہ لپک کر اس کے پاس آیا۔

”صاحب.....! میری مدد کریں۔ میری بچی کا خون بہت زیادہ بہہ رہا ہے اگر

اس اسپتال نہ پہنچایا گیا تو خدا نخواستہ.....“ آگے وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا تھا۔

”میں ہسپتال ہی جا رہا ہوں آپ لوگ میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔“ اس کے اجازت دیتے ہی وہ شخص کھل اٹھا اور بچی کو گود میں اٹھا کر گاڑی میں ڈالنے لگا، بچی کی ماں اور اس کے ساتھ موجود باقی دو بچیاں بری طرح ہراساں تھیں۔

”آپ لوگ فکر نہیں کریں، انشاء اللہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔“ بجائے گاڑی کو آگے بڑھانے کے اس نے میڈیکل باکس نکال کر بچی کو فرسٹ ایڈ دینا شروع کر دی تھی۔ ہسپتال پہنچنے سے پہلے اس کے زخموں سے بہتے خون کو روکنا بہت ضروری تھا۔

”آپ ڈاکٹر ہیں صاحب.....!“

”ہاں.....!“ میڈج سے فارغ ہوتے اس نے مختصراً اس آدمی کو جواب دیا

تھا۔

”بس اچانک ہی یہ بچی اپنی بڑی بہن کا ہاتھ چھڑا کر سڑک پر بھاگنے لگی۔ اس سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت اتنی زیادہ نہیں ہوتی کچھ اس وجہ سے بھی ہم لوگوں سے چوک ہو گئی۔“ ہسپتال کی طرف جاتے وہ بے دھیانی سے اس آدمی کی بتائی ہوئی تفصیلات سن رہا تھا۔ اس کا سارا دھیان عبادہ کی طرف لگا ہوا تھا جسے وہ کل رات ہی ہسپتال میں ایڈمٹ کر کے گیا تھا، بچے کی پیدائش میجر آپریشن سے ہوگی یہ بات بہت پہلے ہی ڈاکٹر عفت اسے بتا چکی تھیں۔ آج صبح ساڑھے گیارہ بجے عبادہ کا آپریشن ہونا تھا۔ کل ہسپتال جاتے وقت عبادہ کئی چیزیں اپنے ساتھ لے جانا بھول گئی تھی اور اب یاد آنے پر اس نے حاشر کو گھر کی طرف دوایا تھا۔ حاشر کی ضرورت کے پیش نظر ڈاکٹر ہادی دو دن پہلے سے اپنی گاڑی اسے بعد اسرار سوپ چکے تھے۔ لہذا اسے کافی آسانی ہو گئی تھی اور اس کے پاس اس گاڑی کی موجودگی ہی نے اس بچی کو بروقت اسپتال پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

”پلیز ڈاکٹر صاحب.....! میری بچی کو بے آسرا چھوڑ کر مت جائیں۔“ وہ

انہیں شعبہ ایمرجنسی تک پہنچا کر گاڑی ڈپارٹ کی طرف جانا چاہتا تھا کہ خاتون نے بازو

پکڑ کر اسے روک لیا۔ اس نے ایک نظر اپنی گھڑی پر ڈالی جو سوا گیارہ بج رہی تھی اور پھر بچی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شہر کا سب سے بڑا سرکاری اسپتال ہونے کی وجہ سے ڈاکٹروں کی تمام ٹرائینشن کے باوجود شعبہ حادثات میں ہمیشہ افراتفری کی حالت رہتی تھی۔ اب بھی کوئی ڈاکٹر فارغ نظر نہیں آ رہا تھا جو فوری طور پر بچی کو دیکھ سکا۔ ناچار خود کو یہ تسلی دیتے ہوئے کہ عبادہ کے پاس ڈاکٹر عفت موجود ہیں وہ ایک نرس کی مدد سے اس بچی کو ٹریینٹ دینے لگا۔

”خدا آپ کو بے شمار خوشیاں دے، زندگی میں ہمیشہ کامیاب کرے، آپ جو چاہیں وہ آپ کو حاصل ہو۔“ بچی کو ٹریینٹ دینے کے بعد وہ اس کے والدین کو اس کی طرف سے مطمئن کرتے ہوئے وہاں سے جانے لگا تو خاتون نے اسے ڈھیروں دُعاؤں سے نوازنا شروع کر دیا۔

”میری بیوی کا آپریشن تھا آج، آپ دُعا کیجئے کہ وہ اور میرا بچہ خیریت سے ہوں۔“

حاشر حسن کا لہجہ بھیگنے لگا تھا۔ ایک پورے خاندان کے ہوتے ہوئے وہ زندگی کے اس نازک مقام پر تنہا کھڑا تھا۔ یہ دُکھ اپنے لئے اتنی دُعاؤں سنتے یکدم ہی اس کے دل میں انی کی طرح اُترا تھا۔ اپنے جذبات کو ان سے چھپانے کے لئے وہ تیزی سے رُخ موڑ کر باہر نکل گیا۔

”مبارک ہو.....! آپ کے گھر بیٹا ہوا ہے ڈاکٹر حاشر.....!“ نرس نے اسے خوشخبری سنائی تھی لیکن وہ بے چینی سے عبادہ کے آپریشن تھیٹر سے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بے انتہا کمزور تھی لہذا اس کی طرف سے اسے فکر بھی بہت زیادہ تھی، جب تک وہ اسے اپنی آنکھوں سے باخیریت نہیں دیکھ لیتا اسے چین آنا ممکن نہیں تھا۔

”آپ فکر نہ کریں ڈاکٹر صاحب.....! اللہ اپنا کرم کرے گا۔“ اپنے قریب کسی کی موجودگی کے احساس سے اس نے پلٹ کر دیکھا تو سڑک پر حادثے کا شکار ہونے والی بچی کے والدین کھڑے تھے۔

”آپ اپنی بچی کو تنہا چھوڑ کر یہاں کیوں چلے آئے.....؟“ اس نے انہیں ٹوکا۔

”ہماری بچی خدا کے فضل و کرم سے اب ٹھیک ہے۔ آپ نے اپنی بیوی کو اس حالت میں چھوڑ کر ہماری مدد کی تو کیا ہمارا فرض نہیں بنتا ہے ہم ان کی خیریت معلوم کرنے یہاں آئیں۔“ بچی کے باپ نے نہایت عقیدت سے جواب دیا تھا۔

”عبادہ.....! میری بہن.....! میری بچی.....!“ اسٹریچر پر آپریشن تھیٹر سے باہر آتی عبادہ کو دیکھ کر حاشر سے پہلے وہ خاتون اس کی طرف لپکی تھیں۔

”آپ لوگ عبادہ کے بہن بہنوئی ہیں.....؟“ خاتون کی بے اختیاری نے حاشر پر ان سے عبادہ کا رشتہ منکشف کر ڈالا اور اس نے تصدیق کے لئے ان کے شوہر سے پوچھا۔

”جی ہاں.....!“ عداوت سے چور شفقت علی اس سے نگاہ ملانے کی ہمت نہیں کر رہے تھے۔

حاشر نے بے اختیار ہی ایک گہرا سانس خارج کیا۔ عبادہ دُنیا میں بچ جانے والے اپنے ان رشتوں کو دن میں بارہا یاد کرتی تھی۔ اس کی آپا اس کے لئے ماں کی طرح تھیں، ہوش سنبالتے ہی اس نے آپا کو اپنے ارد گرد دیکھا تھا۔ ماں تو اس کی پیدائش کے وقت ہی دُنیا سے چلی گئی تھیں۔ اس کے لئے ماں کے روپ میں جو کچھ بھی تھا وہ صرف آپا تھیں۔ اس کی زندگی کی مشکل گھڑیوں میں آپا اس کے پاس نہ پہنچیں، اسے اس بات کا بہت صدمہ تھا۔ لیکن پھر بھی وہ انہیں یاد کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ آپا کی کسی مجبوری نے ہی انہیں اس تک آنے سے روک رکھا ہوگا اور وہ مجبوری کیا ہو سکتی ہے یہ شفقت علی کی جھکی نظروں کو دیکھ کر حاشر حسن اچھی طرح جان گیا تھا۔

☆☆☆

”حاشر بھائی.....!“ اس پکار پر بس اسٹاپ کی طرف جاتا حاشر حسن تڑپ کر مڑا تھا۔ اس کے اعزاز کے عین مطابق وہ عاشر ہی تھا جو اپنی کار کی کھڑکی سے سر

نکالے اسے پکار رہا تھا۔

”یہ کیا حال کر لیا ہے آپ نے اپنا.....؟“ وہ دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل آیا تھا اور اب حاشر کی اڑی ہوئی رنگت والی شرٹ اور کھسی جینز کا جائزہ لیتے افسوس سے کہہ رہا تھا۔

”کیوں.....؟ کیا ہوا ہے میرے حال کو.....؟“ حاشر نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر پوچھا۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ.....؟ میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ اس کے گریز کو بھانپتے ہوئے حاشر نے موضوع بدل دیا۔

”نہیں یار.....! تم جاؤ.....! میں بس سے چلا جاؤں گا۔ بڑی مشکل سے عادت پڑی ہے بسوں میں آنے جانے کی۔ کہیں ایک دن میں پھر سے بگڑ نہ جائے۔“ یاسیت سے مسکراتے اس نے اس کی آفر قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ زندگی کے مشکل ترین دور کو گزارنے کے بعد وہ اب ڈیڈی سے وابستہ کسی شے کو اپنے تعریف میں نہیں لانا چاہتا تھا۔

”ٹھیک ہے.....! تو میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں بس میں۔“ حاشر نے گاڑی لاک کرتے اٹل انداز میں کہا۔

”میرے ساتھ چلتے ہو.....؟ مگر کہاں.....؟“ حاشر اس کی بات پر حیران ہوا تھا۔

”آپ کے گھر اور کہاں.....؟ کیا آپ مجھے اپنی مسز سے نہیں ملوائیں گے.....؟“ حاشر کے جواب نے اس کی حیرت میں کچھ اور اضافہ کیا تھا۔ ایک ڈیڑھ سال بعد راہ چلتے مل جانے والا اس کا بھائی اس کے لئے ایسی محبت کا اظہار کرے گا وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اب جبکہ یہ واقعہ ظہور پذیر ہو گیا تھا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں رہا تھا۔

”صرف مسز ہی نہیں، اپنے بیٹے سے بھی ملواؤں گا میں تمہیں۔“ اتنے عرصے کے بعد اپنے کسی خونی رشتے کی طرف سے ملنے والے اس اپنائیت بھرے انداز نے اسے سرشار کر دیا تھا۔

”آپ کا بیٹا.....؟ مطلب میرا بھتیجا.....؟ پلیز بھائی.....! ضد چھوڑیں اور گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ اس نیوز کو سن کر تو میرا دل چاہ رہا ہے کہ اڑ کر اس جگہ تک پہنچ جاؤں جہاں وہ ہے۔“ حاشر کے لہجے میں اتنی بے تابی تھی کہ حاشر حسن کو اس کی بات نہ ماننا اس کے خلوص کی ناقدری لگی اور وہ اس کے ساتھ گاڑی میں جا بیٹھا۔

”ویسے بائی دے دے وہ آپ یہاں کہاں آئے تھے.....؟“ اس سے ایڈریس پوچھ کر گاڑی اس کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر ڈالتے حاشر نے پوچھا تھا۔

”یہاں مریم ہاسپٹل میں، کچھ جائزہ کا ایڈ آیا تھا اخبار میں، اسی کے لئے انٹرویو دینے آیا تھا۔“ حاشر حسن نے بتایا۔

”اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں آپ سے.....؟“ حاشر نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا اور اس کے اجازت دینے پر کہنے لگا۔

”آپ کی مسز کے لئے تو بڑی بڑی امدادی رقوم کا اعلان کیا گیا تھا، کیا آپ تک وہ امداد نہیں پہنچی جو آپ اتنے خراب حال میں ہیں، میں کبھی آپ سے یہ سوال نہ کرتا لیکن آپ نے خودمی کو فون پر بتایا تھا کہ اپنی مسز کے ذریعے آپ بڑے بڑے لوگوں کی فیور حاصل کر سکتے ہیں۔“ اس کی بات پر حاشر نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔

”ان امدادی رقوم کو قبول کرنا نہ تو عبادہ کو منظور تھا نہ مجھے، وہ رقم جس چیز کے مداوے کے طور پر اسے دی جا رہی تھی وہ کسی بھی عزت دار عورت کے لئے اس کی سب سے قیمتی متاع ہوتی ہے، جس کی قیمت دنیا میں کوئی شخص ادا نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی عورت اپنی عزت کا معاوضہ وصول کرے تو وہ عزت دار کے بجائے پیشہ ور کہلاتی ہے اور میری بیوی کم از کم ایسی عورت نہیں۔ رہا عبادہ کے حوالے سے بڑے لوگوں سے رابطہ کرنے یا مدد حاصل کرنے کا سوال تو وہ سب میں نے صرف ڈیڈی کو ان کی حرکتوں سے باز رکھنے

کے لئے کہا تھا ورنہ میرا حقیقت میں ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ صرف حالات سے مجبور ہو کر میں نے ڈیڈی کو وہ دھمکی دی تھی اور تم بھی جانتے ہو کہ اس دھمکی کا ہی اثر ہے کہ وہ اس کے بعد کبھی میری راہ میں آنے کی کوشش نہ کر سکے۔“

حاشر کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے اجنبی نوجوان کو دیکھ کر عبادہ کو خاصی حیرانی ہوئی تھی۔ اس کے حاشر سے شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ڈاکٹر ہادی اور طربہ کے علاوہ کسی نے اس فلیٹ میں قدم رکھا تھا۔

”عبادہ.....! یہ میرا چھوٹا بھائی حاشر ہے۔“ حاشر نے اس کی حیران آنکھوں میں جھانکتے مسرت سے لبریز لہجے میں بتایا تھا۔

”عا.....شر.....؟ آپ کا بھائی.....؟“ خوشی سے عبادہ کی آواز کانپ گئی۔

”صرف ان کا ہی نہیں، میں آپ کا بھی بھائی ہوں۔“ حاشر نے یکدم ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر یقین دہانی کروائی تھی۔ نہ جانے ایسی کیا بات تھی اس لڑکی میں کہ وہ اسے سامنے پا کر ایک سال کے عرصے میں کی جانے والی اس سے اپنی شدید نفرت کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ ادھر لفظ بھائی میں عبادہ کے لئے درد کی ایسی داستان چھپی تھی کہ وہ ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حاشر اس کے اس طرح رونے سے گھبرا گیا تھا اور مسلسل اس کو چپ کروانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ آج پہلی بار حاشر حسن نے اس کو آنسو بہانے سے نہیں روکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے اندر کھولنا لاوا بہہ جائے۔

”سوری.....! میری وجہ سے آپ کو پریشان ہونا پڑا۔“ کچھ دیر بعد عبادہ نے خود ہی اپنے آپ پر قابو پایا تھا اور حاشر کی گھبرائی ہوئی شکل دیکھ کر معذرت کی تھی۔

”سوری کا کوئی فائدہ نہیں۔ اپنی اس حرکت کے لئے تمہیں سزا بھگتنا پڑے گی۔ فی الحال میں حاشر کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے کچھ نہیں کہہ رہا۔“ حاشر نے پانی سے بھرا گلاس اسے دیتے ہوئے دھمکایا تھا۔

”کنیز سزا کے لئے تیار ہے عالی جاہ.....!“ آج پہلی بار اس کی دھمکی سے خائف ہونے کے بجائے عبادہ نے شوخی سے جواب دیا تھا۔

”آپ لوگوں کی باتوں میں میں اپنے بھتیجے کو تو بھول ہی گیا۔ کہاں ہیں وہ محترم.....؟ ذرا ان کا دیدار تو کروائیں۔“ حاشر کے شور مچانے پر عبادہ مسکراتی ہوئی انڈر بیڈ روم میں سوئے دانیال کو لے کر واپس آئی تھی۔

”ارے.....! یہ تو بالکل میری کاپی ہے۔“ حاشر بچے کو گود میں لے کر خوشی سے چلایا۔

”ظاہری بات ہے، تمہارا بھتیجا ہے تو تم ہی سے ملے گا بھی۔“ عبادہ نے اس کی خوشی کو محسوس کرتے بڑی طمانیت سے جواب دیا تھا۔

عبادہ کے کھانا تیار کر کے دسترخوان لگانے تک حاشر مسلسل دانیال کے ساتھ مصروف رہا تھا۔ اس چھوٹے سے ڈیڑھ دو ماہ کے بچے سے اس نے دنیا جہاں کی باتیں کر ڈالی تھیں حاشر اور عبادہ اس کی ان حرکتوں پر مسلسل مسکراتے رہے تھے۔

”آپ کھانا بہت مزے کا بناتی ہیں بھابی.....! آپ کے ہاتھ کا کھانا کھانے میں بار بار یہاں آیا کروں گا۔“ مٹر پلاؤ کو نہایت رغبت سے کھاتے حاشر نے اس کی تعریف کے ساتھ ساتھ اپنے ارادوں سے بھی آگاہ کیا تھا۔

”بار بار کیا.....؟ تم روز بھی چاہو تو یہاں آ سکتے ہو۔“ عبادہ نے فراخ دلی سے اسے جواب دیا۔

”سب کچھ نوٹ کر رہا ہوں میں عبادہ بیگم.....! یہ تمہارا آج کے دن کا دوسرا جرم ہے جسے میں ہرگز بھی معاف نہیں کروں گا۔“ حاشر نے اس کی اس خوشدلی پر جلع بننے لہجے میں کہا تھا۔

”کیوں بھائی.....! آپ کو بھابی کا میرا یہاں بلانا اچھا نہیں لگا.....؟“ حاشر نے ہاتھ روک کر پوچھا۔

”اچھے کو تو چھوڑو، مجھے تمہارا یہاں آنا بے انتہا اچھے لگے گا لیکن میں تو اپنی بیوی کی طوطا چٹھی دیکھ رہا ہوں۔ مجال ہے کہ میری کی ہوئی کسی تعریف پر یہ یقین کر لے لیکن تمہاری بات پر فوراً ایمان لے آئیں محترمہ.....!“ حاشر نے منہ بناتے ہوئے اصل

بات بتائی تھی۔

”تو میری اور آپ کی بات میں فرق بھی تو ہے بھائی.....! آخر آل میں ان کا اکلوتا دیور ہوں، میری اہمیت تو ہونی ہی ہے ان کی نظر میں۔“ عاشر نے کالر کھڑے کرتے ہوئے اسے مزید چھیڑا تھا۔ عبادہ اس صورت حال کو بے انتہاء انجوائے کر رہی تھی اور ایسا صرف حاشر کے خوشی سے دکتے چہرے کی وجہ سے تھا۔

”مئی نے مجھے ہدایت کی تھی کہ کسی طرح آپ سے رابطہ کر کے آپ کو گھر آنے پر مجبور کروں۔ آپ کو احساس دلاؤں کہ عبادہ بھابی سے شادی کی صورت میں آپ نے کیا کیا کھویا ہے اور ان سے نجات حاصل کرنے کے بعد آپ کیا کیا دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کی اس چھوٹی سی دنیا کو دیکھ کر جہاں بے شک پیسہ نہیں ہے لیکن محبت کی فروانی ہے۔ میں مئی کے منصوبے میں شریک ہونے پر شرمندہ ہوں۔ آپ کو وہاں سڑک کے کنارے دیکھ کر آواز دینے اور آپ کے گھر آنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں آپ کو عبادہ بھابی سے متفرک کر کے یہاں سے لے جا سکوں۔ لیکن اب میری دُعا ہے کہ اللہ آپ دونوں کو زندگی بھر ساتھ رکھے۔“

حاشر سے رخصت ہو کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے عاشر نے اپنے وہاں آنے کا مقصد بتانے کے ساتھ بڑے خلوص سے اس کے لئے دُعا کی تھی۔

☆☆☆

”بین انکل کا گھرا تنے عرصے سے خالی پڑا ہوا ہے۔ اگر اسے بیچ دیا جائے تو تم لوگوں کے کافی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔“ شفقت علی نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے تجویز پیش کی تھی۔ وہ اکثر ساجدہ اور بچوں کو لے کر ان لوگوں سے ملنے آ جایا کرتے تھے۔ ماضی میں روار رکھے جانے والے اپنے رویے کے لئے انہوں نے عبادہ سے معافی مانگ لی تھی اور عبادہ نے بھی یہ سوچ کر انہیں محاف کر دیا تھا کہ وہ اگر اپنی بچیوں کے مستقبل کے لئے ان لوگوں کی بدنامی کو دیکھتے ہوئے ان سے کنارہ کش ہو گئے تھے تو یہ کچھ اتنا غلط بھی نہ تھا۔ ہر باپ اپنی اولاد کے بھلے کے لئے اتنا ہی جذباتی ہوتا

ہے جتنا شفقت علی تھے۔ گو ان کے اس فعل میں ان کی فطرت کی خرابی کا بھی کچھ دخل تھا لیکن اپنی چھوٹی بیٹی کے حادثے پر حاشر کی مدد نے انہیں خرید لیا تھا اپنی سالی کی حیثیت سے نہ سہی، حاشر کی بیوی کی حیثیت سے سہی عبادہ ان کے لئے بہت اہمیت اختیار کر گئی تھی انہوں نے ساجدہ سے مشورے کے بعد طے کیا تھا کہ ساجدہ مکان میں سے اپنے حصے سے دستبردار ہو کر مکان کی فروخت سے حاصل ہونے والی تمام رقم عبادہ کو دے دے گی تاکہ حاشر اپنا کوئی چھوٹا موٹا کلینک شروع کر سکے۔

”ہمارے مسائل تو سمجھیں اب نکل ہونا شروع ہی ہو گئے ہیں بھائی صاحب.....! جب تک ان کا ہاؤس جاب مکمل نہیں ہوا تھا ہمیں پریشانی تھی۔ اب تو انہیں کافی مناسب جاب مل گئی ہے۔ انشاء اللہ کچھ عرصے میں ہم سیٹ ہو جائیں گے۔“ عبادہ نے جواب دیا۔

”ان عام سے پرائیویٹ ہسپتالز میں، وہ بھی ایک فرلیش ڈاکٹر کو کتنی سیر می مل سکتی ہے یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں لہذا تمہیں پردہ پوشی کی ضرورت نہیں۔ جب تک مجبوری تھی تم لوگوں نے گزرا کر لیا لیکن اب جبکہ حاشر کچھ نہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہے، موقع سے فائدہ نہ اٹھانا بے وقوفی ہوگی۔“ شفقت علی نے بغیر لگی لپٹی کے کہا تھا۔

”کوئی چھوٹا موٹا کلینک شروع کرنا بھی اتنا آسان نہیں ہوتا بھائی صاحب.....! ایک سو بیس گز کے گھر کی فروخت سے جو رقم حاصل ہوگی اس میں آدھا حصہ تو یوں بھی ساجدہ آپا کا ہوگا، پھر بھلا میں کس طرح یہ کام کر سکتا ہوں.....؟“ اتنی دیر سے خاموش بیٹھے حاشر حسن نے بھی ان کی بات میں دخل دیا۔

”ساجدہ کے حصے کی فکر نہ کرو تم لوگ۔ ساجدہ اپنے حصے سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر چکی ہے۔“ شفقت علی نے ساجدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ان کی تائید میں سر ہلانے لگیں۔

”یہ بات تو خیر میں کسی صورت بھی قبول نہیں کر سکتا۔ وہ رقم تو ہر حال میں

ساجدہ آپا ہی کا حق ہے۔ اگر آج آپ لوگوں کو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تو کل ضرور ہوگی۔“ ننھے دانیال کے ساتھ کھیتی ساجدہ آپا کی تینوں بیٹیوں کی طرف ایک نگاہ ڈالتے حاشر حسن نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے ساجدہ.....! اپنے حصے سے دستبردار نہیں ہوتی، لیکن وہ تمہیں یہ رقم قرض کے طور پر تو دے سکتی ہے، ابھی ہماری بیٹیاں چھوٹی ہیں۔ جب تک بڑی ہوں گی تم لوگ اس لائق ہو جاؤ گے کہ ہمیں یہ رقم واپس کر سکو۔“ اس کی نظروں کا مفہوم بھانپتے شفقت علی نے دوسری تجویز پیش کی تھی جو کسی حد تک قابل قبول تھی۔ حاشر مشورہ طلب کرتی نگاہوں سے عبادہ کی طرف دیکھنے لگا۔

”بیوی کی طرف کیا دیکھ رہے ہو حاشر بیٹا.....! یہ تو ابھی خود بچی ہے، بلکہ تم بھی ہمارے لئے بچوں ہی جیسے ہو۔ لہذا اب جو بات کہہ دی گئی ہے وہ فائل ہے، میں اس سلسلے میں مزید کوئی بحث بالکل نہیں سنوں گی۔“ ساجدہ آپا نے بزرگوں والے مان سے کہا تو عبادہ اور حاشر نے ان کا مان قائم رکھتے ہوئے ان کی بات ماننے کی ہامی بھری۔

☆☆☆

”کیسا لگ رہا ہے یک مین.....! باپ کی دولت کا سہارا لئے بغیر زمین پر قدم جما کر کھڑا ہونا.....؟“ ڈاکٹر ہادی نے حاشر حسن کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”بہت اچھا اور خوبصورت.....!“ حاشر حسن نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ ان کی بات کا جواب دیا۔ وہ آج ڈاکٹر ہادی کے کال کرنے پر ان سے ملنے ان کے کلینک آیا تھا۔ ابھی دو دن پہلے ہی اس نے ایک پسماندہ علاقے میں ان کے ہاتھوں اپنے چھوٹے سے کلینک کا افتتاح کروایا تھا۔ اس موقع پر ڈاکٹر ہادی کے علاوہ ساجدہ آپا کی فیملی اور حاشر بھی موجود تھے۔ اس مختصر گیدرنگ میں اپنی پہلی کامیابی کو تسلیم کرتے حاشر حسن نے ڈیڑی کے گھر ہونے والے بڑے بڑے فنکشنز سے بھی زیادہ خوشی محسوس کی تھی۔ کیونکہ اس تقریب میں شامل ہر شخص دل کی گہرائیوں سے اس کی خوشی میں خوش

تھا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی وہاں صرف فارلٹی نبھانے نہیں آیا تھا۔ وہ سب حاشر حسن کی محبت میں وہاں جمع ہوئے تھے۔

”تمہیں کبھی محسوس تو ہوا ہوگا حاشر بیٹا.....! کہ تمہاری زندگی کے اتنے مشکل دور میں میں نے تمہاری کوئی قابل ذکر مدد نہیں کی اور تم تنہا ہی حالات سے لڑتے رہے۔“ ڈاکٹر ہادی نے حسب عادت پیپر ویٹ گھماتے اس سے سوال کیا تھا۔

”کبھی نہیں سر.....! ایک بار بھی نہیں۔ اپنی زندگی کے اس فیز میں میں اندھا دھند اپنے مسائل سے لڑنے میں مصروف تھا کہ مجھے کبھی کسی سے شکوہ کرنے کا خیال آیا ہی نہیں اور آپ کے خلاف تو میں کچھ غلط سوچنے کا کبھی تصور کر ہی نہیں سکتا تھا۔“ حاشر حسن ان کی بات پر جیسے تڑپ ہی تو گیا تھا۔

”اور تمہارا وہ مرض، جس کے علاج کے لئے تم میرے پاس آئے تھے.....؟“ ڈاکٹر ہادی نے کچھ رُکے رُکے انداز میں پوچھا۔

”وہ.....؟ وہ تو مجھے اتنے عرصے میں کبھی یاد ہی نہیں آیا۔ میں تو اس تمام وقت میں اپنے وجود ہی سے غافل رہا تو وجود میں اُٹھتے کسی تعفن کا احساس کیسے ہوتا.....؟“ ڈاکٹر ہادی کی بات پر وہ کچھ چونک سا گیا تھا کیونکہ واقعی عبادہ کے اپنی زندگی میں شامل ہونے کے بعد اسے کبھی اپنی اس سابقہ کیفیت کا دھیان ہی نہیں آیا تھا۔

”مجھے خوشی ہے حاشر بیٹا.....! کہ جس مقصد کے حصول کے لئے میں نے تمہیں حالات کی بھیٹی میں تپنے کے لئے تنہا چھوڑا تھا وہ مقصد رائج نہیں گیا۔ سونا تو اصل میں تم بن ہی گئے تھے اس آگ نے تمہیں کندن بھی بنا ڈالا۔ اب تم نے لوگوں کے درمیان رہ کر Voice of God کی تلاش کرنا سیکھ لیا ہے۔ کوئی شخص تمہارے اس علاقے میں کلینک کھولنے کی اصل وجہ نہیں سمجھا ہوگا لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نے اپنے کلینک کے لئے اس پسماندہ علاقے کا انتخاب کیوں کیا ہے.....؟ اور مجھے تمہارے اس فیصلے پر فخر بھی ہے۔ بندگان خدا کی خدمت میں ہی اصل میں روح کا سکون پوشیدہ ہوتا ہے۔ تمہاری روح کی تطہیر تو اس دن ہی ہوگئی تھی جب تم نے عبادہ سے نکاح کیا تھا۔

اب وہ سجدہ سے اٹھ کر دونوں ہاتھ دعا کے لئے بلند کئے دو زانو بیٹھا تھا۔
دست گریہ سے اس کے جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ عبادہ کے لئے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔
اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھتے اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھتے
ہے پکارا۔

”حاشر.....!“ آج پہلی بار اس نے عبادہ کی زبان سے اپنا نام سنا تھا۔ اس پر
ایسا رنگاڑ ٹوٹنے لگا اور اس نے رخ موڑ کر اپنے قریب بیٹھی عبادہ کا چہرہ دیکھنا چاہا لیکن
اپنی اس کوشش میں ناکامی ہوئی۔ عبادہ نے اپنا ماتھا اس کی پشت سے ٹکا رکھا تھا۔
اس کی گھنیری زلفوں نے بکھر کر اس کے چہرے کو چھپا لیا تھا۔ اپنی پشت پر محسوس ہونے
والی نانی نے حاشر حسن کو بتایا کہ وہ رو رہی تھی۔

”عبادہ.....! کیا بات ہے.....؟ کیوں رو رہی ہو.....؟“ خود پر قابو پاتے اس
چہرے پر سے بال ہٹاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ آنسوؤں کے دوران اس نے بتایا تھا۔

”ڈر.....؟ مگر کس بات سے.....؟“ حاشر حسن نے ایک جھٹکے سے اس کا چہرہ
ہاتھ میں لیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”آپ کے کھو جانے سے، کہیں آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے.....؟“ اس
لڑتے لہجے میں اندیشے بول رہے تھے۔

”میں تمہیں چھوڑ دوں گا.....؟ میں عبادہ.....! میں جس نے تمہارے لئے
ہاں باپ، بہن بھائی، دولت سب کچھ چھوڑ دیا.....؟ میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا
.....؟ تم نے آخر یہ بات سوچتی بھی کیسے عبادہ.....!“ صدے سے اس نے عبادہ
پارے وجود کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”آپ کی بے قراری اور اُداسی کو دیکھ کر۔ اگر آپ میرے ساتھ خوش ہیں تو پھر
نہ آپ کو اتنا ترپاتی ہے کہ آپ راتوں کو سو نہیں پاتے.....؟“ وہ اندیشوں میں
لیٹی تھی۔

اب جو بھی نیک عمل تم کرو گے وہ تمہارے قلب کو سکون اور روح کو معطر کرنے کا سبب
بنے گا۔ گناہوں کا کفارہ ادا ہو چکا، اب انعامات وصول کرنے کی باری ہے۔“

”یہ سب آپ کی نظر کرم کا کمال ہے سر.....! ورنہ مجھ جیسا گناہگار کہاں اس
لائق تھا.....؟“ حاشر حسن کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ ان اشکوں میں احساس
ندامت عاجزی، خوشی اور احساس تشکر سب ہی کچھ پوشیدہ تھا۔

☆☆☆

حضور ایسا کوئی انتظام ہو جائے

سلام کے لئے حاضر غلام ہو جائے

رات کے آخری پہر کسی عجیب سے احساس نے عبادہ کی نیند اُڑا دی تھی۔ اس
نے ایک نظر اپنے قریب سوئے دانیال اور حاشر کی خالی جگہ پر ڈالتے گھڑی کی طرف
دیکھا جو صبح کے ساڑھے چار بجنے کا اعلان کر رہی تھی۔ یہ سارا منظر اس کے لئے اجنبی
نہیں تھا۔ حاشر حسن سے شادی کے بعد گزرے ڈھائی تین سالوں میں وہ رات کے اس
پہر اپنے پہلو کو غیر آباد دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی اس پر
یہ حقیقت منکشف ہو گئی تھی کہ حاشر بیچ وقت نماز کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ تہجد کی نماز بھی
بڑی باقاعدگی سے ادا کرنے کا عادی تھا۔ اس وقت آنکھ کھلنے کی وجہ بیڈ روم میں حاشر حسن
کی غیر موجودگی نہیں بلکہ لاؤنج سے آتی آنسوؤں میں ڈوبی اس کی آواز تھی۔ طربہ کا
فلیٹ چھوڑ کر دو کمروں کے اس مختصر فلیٹ میں منتقل ہوئے انہیں کچھ ہی عرصہ گزرا تھا۔
شاید فلیٹ کے محدود ہونے کی وجہ سے ہی حاشر حسن کی آواز لاؤنج کو پار کر کے عبادہ کی
نیند توڑنے کا سبب بنی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی جائے نماز پر سجدہ ریز حاشر
حسن کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ وہ اس وقت خالق حقیقی سے راز و نیاز کی جس ڈور میں
بندھا تھا، عبادہ خود میں اس کو ڈسٹرب کرنے کی ہمت نہیں پار رہی تھی۔

میں دیکھ لوں صرف ایک بار صبح طیبہ کو

بلا سے پھر میری دنیا میں شام ہو جائے

”جو چیز میرے دل کو تڑپاتی ہے وہ تمہارے ساتھ شادی کا پچھتاوا یا دینے کا دکھ نہیں بلکہ ایک تمنا ہے جس کے حصول سے پہلے میں بہشت میں جا خواہش بھی نہیں رکھتا۔“ اپنی انگلیوں کی پوروں پر اس کے آنسو چھتے اس نے بتایا تو ”کیسی تمنا.....؟“ وہ حیران ہوئی۔

”خانہ کعبہ اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری کی تمنا۔“ اس نے ”لیکن آپ تو حج کر چکے ہیں۔ ابھی کچھ عرصے پہلے ہی تو عاشر نے

تھا۔“

”ہاں.....! پہلے گیا ہوں میں اس دیار میں مگر کسی خواہش اور تمنا کے جب میرے دل میں وہاں جانے کی کوئی بے تابی اور بیقراری نہیں تھی تو مجھے وہاں گیا تھا۔ پھر دل کو تڑپ کا تھک دے کر وہاں سے نکال دیا گیا۔ دو سال تک وسائے تھے کہ وہاں جانے کا سوچتا اور اب پائی پائی جوڑ کر وہاں جانے کے لئے رقم جوڑ میری درخواست ٹھکرا دی گئی ہے۔ قرعہ اندازی میں میرا نام ہی نہیں نکلا۔ شاید وہ ابھی میری سزا کے خاتمے کا حکم نہیں ہوا۔“

”کیسی سزا.....؟“ اس کے درد بھرے لہجے نے عبادہ کو پوچھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اسے اپنے ماضی کا ایک ایک باب کھول کر سنا تا گیا۔ عبادہ حیرت منی بنی رہی۔ آج پہلی بار حاشیہ نے اسے کھل کر اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ”آپ کو وہاں سے حاضری کی اجازت نہیں ملی اس کی وجہ لازماً یہی تو سکتی کہ آپ کی سزا معاف نہیں ہوئی۔ بعض اوقات رب کائنات کے فیصلوں کی مصلحت بھی تو ہوتی ہے۔“ عبادہ نے اسے سمجھایا۔

”کیسی مصلحت.....؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ تو صرف وقت ہی بتا سکتا ہے۔“ عبادہ نے جواب دیا۔

”ٹھیک کہتی ہو تم.....!“ قریبی مسجد سے بلند ہونے والی فجر کی اذان کے لئے مسجد کی طرف جانے کے ارادہ سے اٹھتے حاشیہ نے اس کی بات

کی۔

☆☆☆

”بھائی.....!“

حاشیہ کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف موجود عاشر نے جس لہجے میں اسے پکارا وہ دھک سے رہ گیا۔ کلینک کے اوقات میں اس کا حاشیہ کو فون کرنا یوں بھی خلاف معمول تھا۔

”آپ گھر آجائیں بھائی.....! مجھے آپ کی ضرورت ہے۔“

عاشر کا لہجہ رویا سا ہو رہا تھا۔

”کیا بات ہے عاشر.....! تم اتنے پریشان کیوں ہو.....؟ می ڈیڈی تو ٹھیک ہیں ناں.....؟“

اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔

”وہ ٹھیک ہیں۔ لیکن آپ گھر آجائیں۔ فون پر میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔“ عاشر کے لہجے میں جو اصرار تھا اس نے حاشیہ کو کھٹکا دیا۔ کلینک پر موجود مریضوں کو گھر میں ایمر جنسی کا بتا کر وہ ان سے معذرت کرتا بہت تیزی سے حسن و لاکی طرف روانہ ہوا تھا۔ دل میں اُمنڈتے خدشوں نے اسے یہ تک سوچنے کی مہلت نہیں دی تھی کہ عرصہ ہوا ڈیڈی نے اس گھر کے دروازے اس پر بند کر دیئے تھے۔

اس کی آمد پر حیران حیران سے ملازم نے اسے ڈیڈی کے کمرے میں سب کی موجودگی سے آگاہ کیا تھا۔ ڈیڈی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے وہاں کی کشیدہ اور بوجھل فضا کو محسوس کر لیا۔ اپنے بستر پر لیٹے ڈیڈی برسوں کے پتار لگ رہے تھے۔ می ڈیڈی ہی کے قریب بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر اس وقت میک آپ کی تہ کے بجائے پریشانی کی چادر تھی۔ عاشر بھی وہیں ایک کرسی پر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔

”کیا ہوا عاشر.....! کیا ڈیڈی کی طبیعت خراب ہے.....؟“

اس نے پوچھا لیکن عاشر کے جواب دینے سے پہلے ہی می اس سے آکر لپٹ گئیں۔

”ہم برباد ہو گئے حاشر بیٹا.....! ہماری عزت خاک میں مل گئی۔“

وہ اس کے سینے سے لگی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ حاشر کو یکدم ہی صورت حال کا احساس ہوا۔ گھر کے افراد میں سے صرف ایمن ہی وہاں موجود نہیں تھی۔

”ایمی..... ایمن کہاں ہے می.....!“

اس کے سر اسیمہ انداز پر می کے رونے میں کچھ اور شدت آگئی تھی۔

”ایمن کل شام چکی کی برتھ ڈے میں شرکت کا کہہ کر گھر سے گئی تھی، ابھی تک واپس نہیں آئی۔“

عاشر نے بتایا۔

”ابھی تک نہیں آئی.....؟ پوری ایک رات اور ایک دن گزرنے کے بعد ابھی تک نہیں آئی.....؟ اور تم سب لوگ اطمینان سے بیٹھے ہو.....؟ اسے کہیں تلاش کرتے۔“

اپنے بدترین خدشات کے سامنے آجانے پر وہ دہل ہی تو گیا تھا۔

”کہاں تلاش کریں.....؟ ڈرائیور سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ چکی کے گھر کے گیٹ پر ایمن کو چھوڑ کر آیا ہے۔ ادھر چکی کے گھر والے کہتے ہیں کہ کل ان کے گھر نہ تو کوئی تقریب تھی اور نہ ہی ایمن وہاں آئی تھی۔“

می نے بتایا۔

”ذوالفقار..... ذوالفقار کو چیک کیا تھا آپ لوگوں نے.....؟“

اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

”معلوم کروایا ہے۔ صبح سے ابھی تک وہ گھر سے نکلا ہی نہیں۔ میرا ایک آدمی مسلسل اس کے گھر کی نگرانی کر رہا ہے۔“

عاشر نے جواب دیا۔

”تو پھر تم لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہو.....؟ پولیس میں رپورٹ لکھواؤ اور یہ ڈیڈی کیوں آنکھیں بند کئے لیٹے ہیں.....؟ ان سے کہو کہ انہیں اور اپنے تعلقات کو استعمال کر کے اپنی بیٹی کو بازیاب کروائیں۔ لوگوں کی زندگیاں اجیرن کرنے کے لئے تو بہت سورسز ہیں ان کے پاس، اب اپنی بیٹی کی تلاش کے لئے ان سورسز کو کیوں استعمال نہیں کرتے یہ.....؟“

وہ یکدم ہی اپنے اعصاب پر کنٹرول کھو کر چلانے لگا تھا۔

”پلیز حاشر بیٹا.....! خدا کے لئے اپنی آواز کو نیچا رکھو۔ اس گھر میں درجنوں ملازم ہیں۔ اگر کسی ایک نے بھی تمہاری بات سن لی تو ہماری رسوائی کی داستان گھر گھر پھیل جائے گی۔“

می نے اس سے التجاء کی۔

”کیسے چپ رہوں میں می.....! کیسے چپ رہوں.....؟ مجھے چپ کروا کروا کر ہی تو آج یہ دن آپ ہماری زندگیوں لے آئی ہیں۔ کتنا سمجھایا تھا میں نے آپ کو کہ ایمن پر نظر رکھیں۔ اس کے ملنے جلنے پر دھیان دیں لیکن آپ کو تو مجھے طعنے دینے ہی سے فرصت نہیں تھی، آپ میری بات پر بھلا عمل کیسے کرتیں.....؟“

وہ ڈھے سا گیا تھا۔

”اب ان سب باتوں کا کوئی فائدہ نہیں بھائی.....! اس وقت تو ہمیں صرف یہ سوچنا ہے کہ ایمن کو کیسے تلاش کیا جائے.....؟ ڈیڈی تو کسی بھی سورسز کو استعمال کرنے کے لئے بالکل راضی نہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ اس صورت میں خبر لیک آؤٹ ہو جائے گی۔ انہیں ایمن کی موت تو منظور ہے لیکن اپنی بدنامی نہیں۔ انہوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر کسی کو اس بات کی بھٹک بھی پڑی تو وہ خود کو شوٹ کر لیں گے۔ سخت ٹینس تھے وہ، ابھی کچھ دیر پہلے می نے انہیں ٹرکولائزر دے کر سلایا ہے ورنہ ٹینشن میں انہیں ہی کچھ ہو جانے کا ڈر تھا۔“

عاشر جو اس کے آنے سے پہلے خود بھی ساری ہمت کھوئے بیٹھا تھا، اسے

پر سکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”آپ لوگ دُعا کریں کہ ایسی خیریت سے ہو۔ میں اپنے طور پر اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

جذبات کے شدید ترین ریلے کے گزرنے کے بعد اب وہ کچھ عقل سے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

نفوی ہاؤس کا آہنی گیٹ وا ہوا تھا اور ایک گاڑی بڑی تیزی سے نکل کر سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ سیاہ ٹیوٹا کرولا میں پنجر سیٹ پر بیٹھے حاشر کے اعصاب گاڑی میں موجود ذوالفقار اور اس کے والد داور نفوی کو دیکھ کر تن سے گئے۔ وہ رات گیارہ بجے سے طریقہ کے ایک قابل اعتماد آدمی کے ساتھ اس کی گاڑی میں نفوی ہاؤس کی نگرانی کر رہا تھا۔ حاشر کے معمور کئے بندے کو وہ لوگ واپس بھیج چکے تھے۔ معاملہ چونکہ بہن کی عزت اور ان کے خاندان کی ساکھ کا تھا اس لئے احتیاط بے حد ضروری تھی۔ بشیر نامی یہ آدمی جو اس وقت ٹیوٹا کرولا کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا، طریقہ نے ہزار یقین دہانی کے بعد اس کے ہمراہ کیا تھا۔ حسن ولا سے نکلنے کے بعد حاشر کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح ایمین کو تلاش کرے۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے طریقہ پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ لڑکی ہمیشہ ہی اس کی زندگی کے کڑے وقت میں اس کے کام آئی تھی اور اس وقت بھی اس نے حاشر کو مایوس نہیں کیا تھا۔

بشیر نہایت محتاط انداز میں گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھائے داور نفوی کی کار کا تعاقب کر رہا تھا۔ ٹیوٹا کرولا کا بے آواز اور سبک انجن بھی اس کی کوشش کو کامیاب بنا رہا تھا۔

گنجان آبادی سے نکل کر گاڑی اب شہر سے کافی آگے ویرانے میں سفر کر رہی تھی اور جب آگے والی گاڑی نے سیدھے چلتے چلتے بائیں جانب ٹرن لیا تو حاشر سمجھ گیا کہ وہ لوگ داور نفوی کے فارم ہاؤس کی طرف جا رہے ہیں۔ اسے کچھ کچھ اطمینان

نے لگا۔ فارم ہاؤس کی لوکیشن اور وہاں صرف ایک چوکیدار کی موجودگی سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔

فارم ہاؤس کے اکلوتے چوکیدار کو بشیر نے بآسانی قابو کر لیا تھا۔ گاڑی کافی بکڑی کر کے وہ لوگ فارم ہاؤس کے وسط میں موجود عمارت کی طرف بڑھے تھے۔

”تم جب تک ان پیمبرز پر سائن نہیں کرو گی ہم تمہیں یہاں سے جانے نہیں دے سکتے۔ اگر اپنی خیریت چاہتی ہو تو سیدھی طرح ہماری بات مان لو۔“

یہ داور نفوی کی آواز تھی جو ایمین کو دھمکا رہے تھے۔

”سائن کرتی ہے میری جوتی۔ تم لوگوں کے لئے بہتر ہے کہ مجھے سیدھی طرح بے گھر پہنچا دو ورنہ ڈیڈی خود مجھے ڈھونڈ نکالیں گے اور اس کے بعد تمہارا کیا حشر ہے؟ یہ تم خود ہی سمجھ سکتے ہو۔“

ہمیشہ کی تند خو اور اکھڑ مزاج ایمین نے پیمبرز ان کے منہ پر دے مارے تھے۔

”پاپا!.....! آپ چھوڑیں اس سے میں بات کرتا ہوں۔ اس جیسی لڑکیوں کو بل کر مجھے اچھی طرح آتا ہے۔“

ذوالفقار نفوی کسی خطرناک ارادے سے اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ حاشر

رے میں داخل ہو گیا۔

”ہینڈز آپ!.....!“

اس کی آمد اتنی اچانک تھی کہ دونوں باپ بیٹا ششدر سے اپنی جگہ کھڑے رہ گئے۔ ذوالفقار نفوی نے کچھ پھرتی سے کام لے کر اپنی جیب سے ریو اور نکالنے کی کوشش کی مگر ”ٹھاہ“ کی زور دار آواز کے ساتھ اپنا ہاتھ تھام کر رہ گیا۔ یہ بشیر کی چلائی گولی تھی لانے اسے زخمی کر دیا تھا۔

”جس تھالی میں کھاتے ہو، اسی میں چمید کرنے چلے تھے۔ لعنت ہے تم لوگوں

حاشر نے ایک اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ ذوالفقار کے منہ پر رسید کرتے ہوئے کہا۔

اس دوران بشیر جو دونوں باپ بیٹے کی تلاشی لے کر ان کے ریوالور اپنے قبضے میں چکا تھا، حاشر سے بولا۔

”آپ چھوڑو صاحب.....! ان باپ بیٹے سے مننے کے لئے بشیر اکیلا کا ہے۔“

اور پھر واقعی اس نے ان کا حلیہ بگاڑ ڈالا تھا۔
”چلو.....!“

بشیر کو اس کی کارروائی میں مصروف چھوڑ کر اس نے خود سے نظر چراتی ایمن درستی سے مخاطب کیا تھا۔

”دیکھ لیا اپنی حد سے زیادہ آزاد روی اور بڑوں کی بات نہ ماننے انجام.....؟ اگر کچھ دیر اور ہم لوگ یہاں نہ پہنچ پاتے تو یہ باپ بیٹا جانے تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتے اور جن ڈیڈی کی پہنچ پر تم اتنا اترا رہی تھیں، انہوں نے تو صاف طور تمہاری تلاش سے انکار کر دیا تھا۔ اگر حاشر فون کر کے مجھے نہ بلاتا تو اپنی طرف سے وہ تم کو مرا ہوا ہی سمجھ لینے کو تیار بیٹھے تھے۔“

گاڑی کی طرف جاتے وہ اسے دبی دبی آواز میں گھرک رہا تھا۔

”ڈیڈی نے مجھے تلاش کرنے سے انکار کر دیا تھا.....؟ لیکن کیوں.....؟“

وہ بے یقینی سے حاشر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”اس لئے کہ انہیں اپنی عزت تمہاری جان سے پیاری ہے۔ اگر تمہارے گہ سے غائب ہونے کی خبر پھیل جاتی تو ان کی ناک کٹ جاتی۔“

وہ بھی بغیر کسی لگی لپٹی کے ہر بات بتا رہا تھا۔

”میں جان کر یہاں نہیں آئی تھی۔ بچی اور ذوالفقار برتھ ڈے کے بہانے مجھے یہاں لائے تھے۔ پھر پتا نہیں کس چیز میں ان لوگوں نے مجھے بیہوشی کی دوا ملا کر کھل دی۔ رات بھر میں بے ہوش ہی رہی۔ صبح داور انکل میرے پاس آئے کہ میں ذوالفقار سے نکاح کے لئے ہامی بھریوں۔ دراصل وہ میرے ذریعے ڈیڈی کے برنس پر اپنا ہولہ

قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آپ کو ڈیڈی نے عاق کرنے کا جو اعلان کیا تھا اس کے بعد میں اور حاشر ہی ڈیڈی کے وارث رہ گئے تھے۔ اگر میں ذوالفقار سے شادی کر لیتی تو داور انکل جو ڈیڈی کے برنس میں صرف 10% کے حصے دار تھے، انہیں برنس پر قبضہ جمانے کا موقع مل جاتا۔ داور انکل نے ڈیڈی کو بھی میرا پر پوزل دیا تھا لیکن ڈیڈی نے انکار کر دیا۔ پھر ذوالفقار مجھے ڈیڈی کے خلاف اُکسانے کی کوشش کرنے لگا لیکن میں نے اسے صاف بتا دیا کہ میں اسے صرف ایک دوست سمجھتی ہوں اور شادی کے لئے می ڈیڈی کا فیصلہ ہی قبول کروں گی۔ ہر طرف سے ناکام ہونے کے بعد ان لوگوں نے یہ چال چلی تھی تاکہ میں اور ڈیڈی مجبور ہو جائیں۔“

ایمن سسکیاں لیتے اسے ساری تفصیل بتا رہی تھی۔ حاشر کے دل میں بے اختیار ہی اپنی چھوٹی بہن کی محبت جاگنے لگی۔ تربیت کی کمی نے اسے کچھ ضدی اور آزاد مزاج کا مالک بنا دیا تھا ورنہ بنیادی طور پر وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔

”اوکے.....! جو ہوتا تھا ہو چکا۔ لیکن وعدہ کرو کہ آئندہ زندگی میں ایسی کوئی غلطی نہیں کرو گی اور اپنے کردار و اخلاق کو اسلامی اصولوں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرو گی۔“

حاشر نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔

”وعدہ بھائی.....! آئندہ آپ جو بھی کہیں گے میں ضرور مانوں گی۔“ وہ فوراً ہی راضی ہو گئی۔ ہزار بہادری اور بولڈنئس کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اس کے لئے یہ تجربہ بہر حال بہت ہولناک تھا۔

”دونوں کوریسیوں سے باندھ کر ان کے موبائل فون چھین کر لے آیا ہوں۔“

گاڑی کے چاروں ٹائر بھی برسٹ کر دیئے ہیں۔ سالوں کو واپس شہر پہنچنے میں چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔“

بشیر نے ان کے پاس پہنچ کر فخریہ اپنا کارنامہ بیان کیا تو حاشر حسن نے مطمئن ہوتے ہوئے سر ہلا دیا۔ فی الحال ان دونوں کے لئے یہی سزا کافی تھی۔ اصل سزا تو انہیں

جب آتا جب ڈیڈی انہیں اپنے بزنس سے الگ کرتے۔ 10% شیئرز کے ساتھ ان لوگوں کے لئے بزنس سرکل میں دوبارہ اتنے بڑے پیمانے پر سروائیو کرنا مشکل ہو جاتا اور حاشر حسن جانتا تھا کہ ڈیڈی اب کبھی انہیں سروائیو کرنے بھی نہیں دیں گے۔ حسن ریاض کو چھیڑ کر ان لوگوں نے اپنی تباہی کے پروانے پر دستخط کروائے تھے۔

☆☆☆

تین سالہ دانیال اپنے می ڈیڈی، دادا، دادی اور چاچو کے ساتھ ایئر پورٹ پر موجود تھا۔ وہ سب لوگ احرام پہنے ہوئے تھے۔ حاشر حسن کی دعاؤں کو شرف قبولیت حاصل ہو گیا تھا اور وہ لوگ حج کی سعادت حاصل کرنے جدہ جانے والی فلائٹ میں سوار ہونے کے منتظر تھے۔ ایئر پورٹ پر ان کے خاندان کے افراد کے سوا ایک ہستی اور بھی موجود تھی۔ یہ ہستی طریبیہ تھی جسے حاشر حسن نے ڈیڈی کے نیویارک والے آفس کی برانچ میں جاب کی آفر کی تھی۔ طریبیہ اس طیارے میں سوار ہونے کے لئے بے چین تھی جو اسے ان فضاؤں سے دور ایک اجنبی سرزمین پر لے جاتا۔ جہاں کوئی بھی اسے اس کے ماضی کے حوالوں کے ساتھ شناخت کرنے کے لئے موجود نہ تھا۔ جہاں ایک بے رنگ ہی سہی لیکن باعزت زندگی اس کی منتظر تھی اور طریبیہ کو عزت کے سوا دنیا میں اب کسی چیز کی خواہش بھی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اس نے عبادہ کی اس آفر کو کہ وہ اس کے ساتھ اپنا گھر شیئر کرنے کے لئے تیار ہے، رد کر دیا تھا۔

ایمن کے ساتھ ہونے والے حادثے نے عبادہ کی زندگی کے دکھ جن لئے تھے۔ حسن ریاض صاحب اور ان کی بیگم نے اپنی بیٹی کی جدائی میں گزرنے والے 36 گھنٹوں میں اس لڑکی کی بے بسی اور مجبوری کو 36 ہزار دفعہ محسوس کیا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ بیٹی کی عزت کیا چیز ہوتی ہے۔ انہیں اپنے بیٹے پر بھی بے حد فخر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ اس کی عبادہ کے ساتھ کی گئی نیکی ہی کا صلہ ہے کہ اللہ نے ان کی بیٹی باخیریت ان تک پہنچا دی تھی۔ کسی دوسرے کی عزت کو بچانے کا فعل آج ان کی بیٹی کی عزت بچانے کا سبب بن گیا تھا۔ اس حادثے کے بعد صرف دو مہینے کے عرصے میں ایمن کی شادی

اس کے آسٹریلیا میں مقیم خالہ زاد سے کر کے وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے تھے اور اب رب کعبہ کے حضور شکرانہ ادا کرنے جا رہے تھے۔ واپس آکر ان لوگوں کو بہت سے اہم کام سرانجام دینے تھے جن میں سب سے سرفہرست پسماندہ علاقے میں واقع حاشر حسن کے چھوٹے سے کلینک کو بڑے ہسپتال میں تبدیل کرنے کا کام تھا۔ جہاں غرباء کے لئے مفت علاج کی سہولت مہیا کی جاتی۔ اس ہسپتال کے لئے تمام فنڈز اور ڈونیشن حسن ریاض صاحب کے اکاؤنٹ سے جاری کئے جاتے تھے۔

پی آئی اے کا طیارہ عازمین حج کو اپنے وجود میں سموئے آسمان کی وسعتوں میں محو پرواز تھا۔ طیارے کی اندرونی فضا ”لیک الہم لیک“ کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ آج ان الفاظ کا ورد صرف حاشر حسن کی زبان ہی نہیں بلکہ جسم کا رواں رواں کر رہا تھا۔ وہ جسم جہاں سے تعفن اٹھتا محسوس ہوتا تھا، ایک انوکھی سی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ دل بھی پہلے کی طرح خالی نہیں تھا۔ وہاں بھی ہر دھڑکن کے ساتھ محبوب کے وصال کی تمنا اور ”میں حاضر ہوں، اے اللہ! میں حاضر ہوں“ کی صدائیں گونج رہی تھیں۔

☆☆☆

میڈیکل اسٹور سب ایک ایک کر کے اس کے سامنے سے گزرتے جا رہے تھے۔ جانی پہچانی راہیں، آشنا لوگ جن کے درمیان چلتے پھرتے کبھی وہ ان کے محدود ذہنوں کے سبب الجھن کا شکار ہوتا تھا تو کبھی ان کے لامحدود خلوص کے آگے شرمسار۔ اگر اسے گھر پہنچنے کی جلدی نہ ہوتی تو ٹیکسی یہیں رکو کر ان سب سے فرداً فرداً ملاقات ضرور کرتا۔

”بائیں ہاتھ پر آخر سے پہلے والی گلی میں موڑ لینا“ دودھ کی بالٹی ہاتھ میں لیے ناگوری ملک شاپ کی طرف بڑھتے ادھیڑ عمر شخص کو پہنچانے کی کوشش کرتے اس نے ٹیکسی والے کو ہدایت کی۔ اپنی گلی کا کوتا مڑنے تک وہ انہیں پہچان چکا تھا۔ وہ چاچا دین محمد تھے۔ اپنی یادداشت پر ناز کرتے وہ مسکرانے ہی لگا تھا کہ یکدم وہ مسکراہٹ غائب ہو گئی سامنے اس کے پانچ سال پرانے ٹوٹے پھوٹے گھر کی جگہ خوب صورت ڈبل اسٹوری بلڈنگ کھڑی تھی۔ دیواروں پر لگالش لاش کرتا ماربل وہائٹ پینٹ کی گرل اور گرل کے ساتھ جھولتی پھولوں سے لدی خوب صورت آرائشی بلیں۔ وہ بلڈنگ چھوٹے چھوٹے پست اور رنگ و روغن اڑے گھروں کے درمیان کھڑی بڑی مغرور اور شاہانہ لگ رہی تھی مگر اس کے سکتے کی وجہ وہ بلڈنگ نہیں بلکہ اس کے ساتھ موجود آسانی رنگ کے چومنے والا وہ چھوٹا سا گھر تھا جس کے اوپر دو افراد لائٹوں کی جھالیں لگا رہے تھے جبکہ دیوار کے ساتھ لگے بجلی کے پول پر چھت کے قریب ”شادی مبارک“ کا بورڈ جگمگا رہا تھا۔

آئی دیکھو مہندی کی رات ہری ہری مہندی لگاؤ

مہندی لگاؤ گیت خوشیوں کے گاؤ

آئی ہے نصیبوں والی رات

ہری ہری مہندی لگاؤ

زرد اور سبز احتجاج کے گھا گھروں پر چھوٹی قمیصیں پہنے لڑکیاں نل والیوم میں بچے گیت پر ڈانڈیاں رقص کر رہی تھیں۔ مگر اس کی توجہ کا مرکز ان لڑکیوں کے بجائے

صرف تم

”ٹیکسی ایئر پورٹ کے صاف ستھرے اور سرسبز و شاداب علاقے سے نکل کر شاہراہ فیصل پر رواں دواں ٹریفک کے اژدھام کو پیچھے چھوڑ کر اب قدرے پسماندہ سے علاقوں سے گزرتے مسلسل جھکے لے رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ پانچ سال پہلے جب وہ روزگار کی تلاش میں دہلی گیا تھا تب بھی اس جگہ سے گزرتے ایسے ہی جھکے لگا کرتے تھے۔ بلکہ اب ان جھکوں کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وجہ سڑک پر بنے گڑھوں کی تعداد میں مثالی اضافے کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔ اسے اپنے علاقے کی سڑک سے گزرتے ہوئے لگنے والے ان جھکوں سے نفرت تھی لیکن آج بھی جھکے اس کی سرشاری کو بڑھا رہے تھے۔

پانچ سال بعد اس مانوس ماحول میں سانس لیتے وہ اپنے اندر ایک تازگی محسوس کر رہا تھا۔ کھڑکی کا شیشہ نیچے اتار کر اس نے خوشی کے بھرپور احساس کے ساتھ ایک گہرا سانس لیا۔ ہوا کہ ماتیہ تیز چھتی ہوئی بدبو اس کے نھتوں سے ٹکرائی اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے لیکن پھر فوراً ہی ایک آسودہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔ کچرے کے ڈھیر اور کھلے تالے سے اٹھتی یہ بو اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ اس کا گھر اب چند منٹوں کے فاصلے پر ہی ہے جانی پہچانی سبزیوں کی دکانیں، کو قصابی کا گوشت کا ٹھیا، شمس ٹیلر کی شاپ، انور بھائی کا

ذرا ہٹ کر بیٹھی وہ لڑکی تھی جس نے سبز چوڑیوں دار پانچاے پر سبز اور سنہری گونگا لگی زرد شرٹ کے ساتھ بڑا سا سبز اور زرد رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہز اور زرد چوڑیاں اور دوسرے ہاتھ میں مویے کے گجرے تھے۔ میک اپ کے نام پر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی دھار اور ہونٹوں پر لائٹ سے شیڈ کی لپ اسٹک کے سوا کچھ نہیں لگایا تھا۔ دائیں رخسار پر بالوں کی ایک موٹی سی لٹ لہرا رہی تھی جبکہ سیاہ بالوں کی لمبی چٹیا بائیں شانے سے آگے اس کی گود میں پڑی تھی۔ عدن بخاری نے کمرشلز کے سوا اتنے لمبے اور خوب صورت بال کبھی کسی لڑکی کے نہیں دیکھے تھے۔ وہ جس کلاس سے تعلق رکھتا تھا وہاں لڑکیاں عموماً بالوں کو نئے نئے شپس میں کٹوانے اور عجیب و غریب رنگوں میں ڈائی کرنے کے خط میں مبتلا رہتی تھیں۔

”عدن! بیٹا بور تو نہیں ہو رہے؟“ ماما کی آواز نے اس کی محویت کو توڑا تھا۔
”نومو! میں ٹھیک ہوں۔ آپ انجوائے کریں۔“ اس نے مسکرا کر ان کی تسلی کروائی۔

”تھنک یو جان! اصل میں عاکف اور حسان انتظامات میں مصروف ہیں ورنہ وہ تمہیں ضرور کہہ بیٹے۔“ ممانے وضاحت پیش کی۔ دراصل وہ اس وقت اس تقریب میں صرف اور صرف ان ہی کی وجہ سے شریک تھا۔ یہ ان کی بچپن کی دوست نازی آنٹی کی بیٹی کی مہندی کی تقریب تھی۔ طبقاتی فرق کے باوجود ماما اور نازی آنٹی کی دوستی ہمیشہ قائم و دائم رہی تھی اور اس میں یقیناً بڑا ہاتھ ماما ہی کا تھا۔ نازی آنٹی ان کے گھر آئیں، آئیں ماما ان کے گھر ہر موقع پر ضرور پہنچتی تھیں۔ آج بھی جبکہ ان کا ڈرائیور چھٹی پر تھا وہ عدن کے ساتھ یہاں شرکت کے لیے پہنچ گئی تھیں لیکن ساتھ ہی انہیں اس بات کا بگ احساس تھا کہ عدن کے لیے یہ لوگ اور ماحول بہت اجنبی ہیں۔

”بس ابھی آدھے گھنٹے میں نکلتے ہیں۔ کھانا کتنے ہی والا ہے اگر بغیر کھانے چلے گئے تو نازی کی دل آزادی ہوگی۔“ وہ جیسے اسے بہلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔
”میں نے کہا ناں ماما! میری فکر مت کریں، میں بالکل ٹھیک ہوں اور آگ

آپ آدھے کے بجائے ایک گھنٹہ اور بھی رکنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“
”مامی سوٹ سن!“ انہوں نے بے ساختہ ہی جھک کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

اس کی نظریں ماما پر سے پھسلتی اس لڑکی کے چہرے پر جا رکیں۔ وہ ان ہی کی طرف متوجہ تھی اور ماما کے اسے بچوں کی طرح پیار کرنے پر مسکرا رہی تھی اس نے قدرے جھینپ کر نظریں موڑ لیں۔ وہ ماما کا ایسا ہی لاڈلا تھا اور وہ اس سے محبت کا اظہار کرنے میں کبھی تکلف سے کام نہیں لیا کرتی تھیں۔

”آنٹی! امی آپ کو عدن بھائی کے ساتھ اندر بلا رہی ہیں۔“ نازی آنٹی کی بیٹی نے آکر پیغام دیا تو ماما اس کی ناز برداری چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔
”آؤ عدن! دیکھیں نازی نے کیوں بلوایا ہے۔“ ان کے کہنے پر کرسی سے اٹھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس طرف دیکھا جہاں وہ لڑکی بیٹھی تھی لیکن اس بار اس کی نظروں کو مایوس لوٹنا پڑا۔ وہ اب وہاں نہیں تھی۔

”آؤ ابھی جاؤ عدن!“ ممانے اسے پکارا تو وہ ان کے پیچھے چل پڑا۔
”آؤ نوشاہہ! میں نے تم لوگوں کے لیے یہاں کھانا لگوادیا ہے۔“ نازی آنٹی ماما کو دیکھتے ہی بولیں۔

”وہ کیوں بھی؟“ حنا کے سرال والوں کو پتہ چلا تو برا مانیں گے۔“ ممانے فوراً ہی انہیں ٹوکا۔

”نہیں مانتے۔ ان لوگوں کا ابھی لمبا پروگرام ہے۔ فی الحال وہ بے گلے گلے مصروف ہیں دیر تک رکیں گے۔“

”اور تم مجھے جلد سے جلد بھگانا چاہتی ہو۔“ ممانے ان کی بات اچکی۔

”ایسی کوئی بات نہیں میں صرف عدن کے خیال سے جلدی کر رہی ہوں۔“ نازی آنٹی نے وضاحت پیش کی۔

”آپ نے خواہ مخواہ ہی تکلیف کی آنٹی!“ اسی پل بریانی کی ڈش اٹھائے وہی

لے بالوں والی لڑکی اندر داخل ہوئی۔

”چلیں ماما! جب آنٹی نے اتنا تکلف کر ہی لیا ہے تو ہم کھانا کھا لیتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ آپ سب لوگ بھی ہمارے ساتھ ہی کھائیں گے۔“ وہ ایک کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا اور اس کی طرف دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”سوری بیٹا! مجھے اور ثناء کو تو آپ جانے دو ہم لوگ ذرا دوسرے مہمانوں کو دیکھ لیں البتہ یہ میری بھانجی ہے یہاں آپ کی میزبانی بھی کر لے گی اور آپ کا ساتھ بھی دے گی۔“ نازلی آنٹی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا لیکن اس کے تو دل کی مراد برآئی۔

”اوکے آنٹی! ایز یو ڈش۔“ فوراً ہی منظوری دے دی۔

”لیجے آنٹی! شروع کریں۔“ اس نے پلیٹ ماما کے آگے رکھتے ہوئے ڈش سامنے کی۔

”تم کیوں نہیں لے رہے عدن!“ ماما نے چپہ منہ کی طرف لے جاتے اسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے دیکھ کر ٹوکا۔

”ہمیں کسی نے آخر ہی نہیں کی۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولا تو وہ گھبرا گئی۔

”پلیز لیجے ناں آپ بھی۔“

”یہ کبھی کبھی ایسے ہی تنگ کرتا ہے۔ آپ پریشان مت ہوں بیٹا! ماما نے اسے تسلی دی اور عدن کو کھانا نکالنے کا اشارہ کیا۔

”آپ کا نام کیا ہے بیٹا؟“ انہوں نے اس سے پوچھا۔

”رطابہ!“ اس نے آہستہ سے بتایا۔

”تو رطابہ بیٹا! آپ بھی ہمارا ساتھ دو ناں۔ یوں ہم دونوں اکیلے کھاتے تو اچھے نہیں لگ رہے۔“

”آپ کھائیں آنٹی! میں بعد میں کھالوں گی۔“

”سمجھا کریں ماما! اس وقت یہ ہمارے نوالے مگننے پر مامور ہیں۔“ اس کے

انکار پر وہ شرارت سے بولا تو وہ جو پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی مزید گھبرا گئی۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ فوراً ہی ایک پلیٹ میں کھانا نکال کر سر جھکا کر کھانے لگی۔ عدن اس کی کیفیت سے حظ اٹھاتا زیر لب مسکرا رہا تھا جبکہ ماما چہرے پر پیار بھری خفگی لیے اسے گھورنے میں مصروف تھیں۔

☆☆☆

”اماں.....!“ وہ عالم وحشت میں دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی چیخا تھا قیمتی ساز و سامان سے بھرے سوٹ کیس دہلیز پر ہی ڈھیر پڑے تھے۔

”بھائی! میٹھیوں سے اترتی ٹمرہ اسے دیکھ کر تیزی سے دوڑی آئی۔

”ٹمرہ! کیا غضب آ یا ہے؟“ اماں بھی ایک کمرے سے افتاں و خیزاں برآمد ہوئیں۔

”آپ اتنا اچانک کیسے آ گئے بھائی! پہلے سے کوئی خبر ہی نہیں دی۔“ ٹمرہ اس کے بازو سے لگی شکوہ کر رہی تھی۔

”ارے میرا بچہ! میری تو آنکھیں ترس گئی تھیں تجھے دیکھنے کو۔“ اماں اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے آنسو بہاتی آنکھوں کے ساتھ بار بار اسے چوم رہی تھیں۔

”اے ٹمرہ! اپنے ابا کو دوکان پر فون کر انہیں بتا کر غضب آ یا ہے۔“ انہوں نے بیٹی کو ہدایت دی اور پھر اس کا بازو پکڑ کر اندر کی طرف کھینچتے ہوئے بولیں۔

”چل بیٹا! اندر چل اتنے لمبے سفر سے آیا ہے۔ تھک گیا ہوگا۔ اندر چل کر دیکھ میں نے تیرے لیے کتنا خوب صورت کمرہ بنوایا ہے۔ ساتھ میں ٹھنڈے گرم پانی والا غسل خانہ بھی ہے تو نہادو کر تازہ دم ہو جا میں تیرے لیے کھانا لگواتی ہوں آج صبح سے ہی تیری بہت یاد آرہی تھی میں نے یوں ہی تیری پسند کا کھڑے مسالے کا قیمہ اور مٹر پلاؤ بنا ڈالا۔ میرے مولا کا کرم اس نے تجھے بھیج کر میری مامتا کو ٹھنڈا کر دیا۔“

اس نے مسلسل بولتی اماں کے ساتھ اندر جاتے ان کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ سالن کا چہرہ خوشی کے گہرے احساس سے جھگکا رہا تھا۔ اسی خوشی کو محسوس کرنے کے لیے

ہی تو وہ بنا اطلاع کے واپس لوٹا تھا لیکن.....

”اماں! وہ.....“ اس نے بے چین سا ہو کر کچھ پوچھنا چاہا۔

”ساری باتیں بعد میں۔ پہلے تو نہا دھو کر کھانا کھالے پھر دل بھر کر بائیں

ہوں گی۔“ اماں نے اسے بولنے نہیں دیا تھا اور ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اسے اندر لے گئی تھیں۔

”بتا کیسا ہے تیرا کمرہ۔“ ثمرہ نے اپنی پسند سے ہر چیز ڈلوائی ہے روزانہ صفائی کرتی ہے۔ کسی دوسرے کو یہاں قدم بھی نہیں رکھنے دیتی۔“ اماں فخر سے اسے بتا رہی

تھیں۔ اس نے نظریں گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔ الٹش گرے پیٹ والا کمرہ گرے اور سلور کبی نیشن کے پردوں سے مزین تھا۔ دیواروں پر فینسی لائٹس جگمگا رہی تھیں۔ کمرے

کے درمیان میں ایک آرام دہ بیڈ پڑا تھا۔ کمرے کی کلر اسکیم کو مد نظر رکھتے ہوئے کئی خوب صورت ڈیکوریشن پیمز بھی سجائے گئے تھے۔ اسے بے ساختہ ہی اپنا پانچ سال پرانا کمرہ

یاد آیا۔ سائنور وہ دیواروں والا کمرہ جو کسی بھی آرائشی سامان سے محروم اس کی اور اس کے چھوٹے بھائی کی مشترکہ پناہ گاہ تھا کمرے میں ایک جھلکا چار پائی پڑی رہتی تھی جس پر

دونوں میں سے جو پہلے قبضہ کر لیتا وہ اس کی ملکیت ٹھہرتی اور دوسرا زمین پر بستر لگا کر سوتا۔ اپنی کتابیں رکھنے کے لیے اس نے کباڑے سے ایک میز خرید لی تھی جس کا ایک

پایہ ٹوٹا ہوا ہونے کی وجہ سے انٹینٹ رکھنا پڑتی تھیں۔ اس نے دیکھا اس ٹوٹی میز کی جگہ ایک بڑی سی رائٹنگ ٹیبل نے لے لی تھی جس پر گرے شیڈ والا لیپ اور قیمتی پین ہولڈ

رکھا تھا۔

”اماں! احسن کہاں ہے؟“

”یونیورسٹی گیا ہے۔ بس! ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہو گا۔“ اماں نے اس

پوچھنے پر بتایا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اس کا چھوٹا احسن انجینئرنگ یونیورسٹی میں فائل ایئر کا اسٹوڈنٹ ہے۔

”ادیرا شیر پتر واپس آ گیا۔ آجا میرے سینے سے لگ جا۔“ وہ نہا دھو کر کمرہ

سے باہر آیا تو ابا اس کے منتظر تھے ان سے گلے ملتے اس نے ان میں واضح تبدیلی محسوس کی۔ پرچوں کی چھوٹی سی دکان چلانے والے خستہ حال ابا اس وقت کاشن کے کڑکڑاتے شلوار قمیض میں بہت آسودہ لگ رہے تھے۔

”دیکھ لے تیرا بیجا ایک ایک پیسہ تیری خواہش پر خرچ کیا ہے۔ یہ زبردست پراسٹور بنایا ہے کہ تو دیکھے گا تو دیکھتا ہی رہ جائے گا۔“ ابا بہت جوش سے اسے بتا رہے

تھے۔

”یہ ساری باتیں بعد میں کیجئے گا جی! ابھی میرے بیٹے کو کھانا کھانے دیں۔“ اماں نے آکر ابا کو ٹوکا اور اسے لیے دوسرے کمرے میں چلی آئیں یہاں چھ کر

سیوں والی ڈائیننگ ٹیبل پر کھانا چنا گیا تھا۔

”جلدی سے شروع کر دیں بھئی! ورنہ روٹی ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ ثمرہ نے اس کا بازو پکڑ کر بٹھایا اور اس کی پلیٹ میں سالن نکالنے لگی۔

”یہ کباب بھی ضرور کھائیے گا بھائی! میں نے کل ہی بنا کر فریز کیے تھے۔“ ثمرہ ایک ایک چیز اٹھا کر اسے پیش کر رہی تھی۔

”واہ بھئی! ساری خاطر میں بھائی کی ہو رہی ہیں۔ ہم تو جیسے یہاں ہیں ہی نہیں۔“ ابا نے ثمرہ کو چھیڑا۔

”بھائی کو اتنے دنوں میں دیکھا ہے ابا! بس نہیں چل رہا ان کے لیے کیا کیا کروں۔“ ثمرہ کے لہجے کی سرخوشی پر ابا مسکرانے لگے۔ خوشی تو خود ان کے اپنے وجود میں

بھی خون بن کر دوڑ رہی تھی۔

”غنی چا چا کے گھر کیا ہو رہا ہے!“ بونی دیر سے دل کو بے قرار کرنے والا سوال اس کے ہونٹوں پر آ رہی گیا۔

”ہاں اچھا ہے بڑے موقع سے آیا تو۔ اپنی رطابہ کی شادی ہے۔ تیری تو بڑی دکن تھی اس سے تجھے دیکھ کر خوش ہو جائے گی وہ۔“ ابا کی بات نے اس کے اندیشوں

کی تصدیق کر دی۔ ہاتھ میں پکڑا نوالہ چھوٹ کر پلیٹ میں جا گرا۔ اس کے چہرے کے

بدلتے رنگوں پر اماں نے غصیلی نظروں سے ابا کو گھورا۔ وہ ان سب سے بے نیاز کھا۔
سے انصاف کرنے میں مصروف تھے۔

☆☆☆

”ہیلو ماما!“

”ہیلو جان! آج کچھ جلدی نہیں آگئے تم!“ وہ دستک دے کر ان کے کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے ہاتھ میں پکڑا میگزین ایک طرف رکھتے ہوئے اس۔
پوچھا۔

”اچھا جلدی آگیا ہوں۔“ اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے انہما
بننے کی کوشش کی۔

”میرے سامنے تمہاری ایکٹنگ بالکل نہیں چل سکتی صاف صاف بتاؤ کیا باہ
ہے؟“ وہ اس کے کان کھینچتے محبت سے پوچھنے لگیں۔

”کچھ نہیں ماما! میں نے سوچا آپ کو نازی آئی کے ہاں شادی میں جانا ہوگا
میں آفس سے ٹھوڑا جلدی اٹھ گیا آفٹر آل میں آپ کا خیال نہیں رکھوں گا تو کون رہے
گا۔“

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آج کل شادی کی تقریبات سرشام پونہ
رات گئے ہوتی ہیں اور دوسری بات یہ کہ میرا ڈرائیور آج ڈیوٹی پر ہے اس لیے تمہیں
زحمت اٹھانے کی قطعی ضرورت نہیں۔“ ماما نے اس کے بہانے کو پل میں رو کر دیا۔

”اچھا تو پھر میں چلتا ہوں۔ کسی دوست کے پاس یا جم چلا جاؤں گا۔“
نے مایوسی سے کہتے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

”عدن! یہاں آؤ۔“ ماما کی آواز نے اس کو پلٹنے پر مجبور کیا۔
”اپنی ماما کو نہیں بتاؤ گے اپنے دل کی بات۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ
اپنے قریب بیڈ پر بٹھاتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

”ماما! وہ جو کل لڑکی تھی ناں لمبے بالوں والی۔ وہی جس نے ہمارے ساتھ ک

کہا یا تھا۔“

”ہاں ہاں سمجھ گئی۔ نازی کی بھانجی رطابہ۔“ ماما حیران ہوئی تھیں۔

”مجھے وہ لڑکی بہت اچھی لگی ہے ماما۔ میں اسے اپنی لائف پارٹنر بنانا چاہتا
ہوں۔“ وہ اپنے دل کی خواہش زبان پر لے آیا تھا۔

”آریو سیریس عدن؟ اتنا بڑا فیصلہ تم نے اتنا اچانک کر لیا؟“ ماما واقعی حیران
تھیں۔ کتنے عرصے سے وہ اسے اپنے سرکل میں لڑکیاں دکھا رہی تھیں۔ کئی ایک گھروالوں
سے تو خود لڑکی والوں نے خواہش ظاہر کی تھی لیکن وہ کسی کے لیے ماننا ہی نہیں تھا اور اب
راضی ہوا تھا تو اپنے ماحول سے ہٹ کر بالکل عام سے گھرانے کی لڑکی کے لیے جو بے
ٹک اچھی تو تھی لیکن ایسی بھی نہیں کہ ایک سے ایک چاند چہرہ لڑکی کو رنجیکٹ کرنے والا
عدن بخاری اس کا سوالی بنا بیٹھا تھا۔

”آئی نو ماما! وہ ہماری کلاس سے بلوگ نہیں کرتی آپ کو اور ڈیڈی کو اس کے
ایٹشس پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی بھی اعتراض سے پہلے اس بات کو ذہن میں
رکھیے گا کہ وہ میری پسند ہے اور اسے بھولنا شاید میرے لیے آسان نہ ہو۔“ وہ بہت
سیریس تھا۔

”واٹ ریش عدن! مجھے تم جانتے ہو۔ میں کبھی ایٹشس کا نفس نہیں رہی۔
ای تمہارے ڈیڈی کی بات تو میں انہیں منالوں گی لیکن تمہیں دوسرے رخ سے بھی سوچنا
چاہیے ہو سکتا ہے وہ لڑکی پہلے سے کسی کے ساتھ انگیج ہو یا ان کے ہاں ذات برادری
کے کچھ مسائل ہوں۔ تو ایسی صورت میں ہم زبردستی تو نہیں کر سکتے ناں۔“ وہ اس کی
بے انتہا سنجیدگی سے ہول کر اسے سمجھا رہی تھیں۔

”مجھے یقین ہے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ آج شادی میں جائیں تو نازی آئی
سے ساری معلومات کر لیجے گا۔“

وہ بہت پر یقین تھا اور آنے والے دنوں میں اس کا یہ یقین درست ثابت ہوا
تھا۔ نازی آئی کے ذریعے رطابہ کے گھر رشتہ بھیجنے سے لے کر اس کا اور رطابہ کا رشتہ

طے ہونے تک کے سارے مراحل بہت تیزی اور آسانی کے ساتھ طے پائے تھے۔
 رطابہ کے گھر والوں کو جہیز وغیرہ کے کسی بھی جھنجھٹ میں نہ پڑنے کی ہدایت دیتے ما
 نے براہ راست شادی کی تاریخ طے کروالی تھی۔ خود عدن بھی ایسا ہی چاہتا تھا۔ رطابہ اس
 کی پہلی نظر کی محبت تھی جسے پانے کی نوید نے اس کے دل کو خوشی سے سرشار کر دیا تھا اس
 کی خواہش تھی کہ وہ رطابہ کے ساتھ خوشی کے اس احساس کو شیر کرے لیکن رطابہ کے گھر
 کا ماحول اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ عدن بخاری کے پاس ملن رت کے
 انتظار کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

”غصنفر بیٹا! میری بات تو سن۔“ اماں اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں
 آئی تھیں۔

”کیا سنوں اماں! کیا سنوں؟ میری زندگی بھر کی خوشی میرے دل کی واحد
 خواہش آپ نے پوری نہیں کی اور اب آپ چاہتی ہیں کہ میں بغیر کوئی احتجاج کیے
 خاموشی سے خود کو لٹتا دیکھتا رہوں۔“ بے بسی سے کہتے ہوئے اس نے اپنی مٹھیاں بھنج
 لیں۔

”ایسی بات نہیں ہے بیٹا! تیرا خط ملتے ہی میں غنی بھائی اور بھابھی کے پاس
 تیرے لیے رطابہ کا رشتہ لینے گئی تھی لیکن انہوں نے کوئی جواب ہی نہیں دیا اور پھر اچانک
 ہی رطابہ کا رشتہ طے ہونے کی خبر سنا دی۔ لڑکا کروڑوں کی جائیداد کا اکلوتا وارث
 ہے۔ اس کے سامنے تیرے رشتے کی بھلا حیثیت ہی کیا تھی۔ میں احتجاج کرتی بھی تو
 کیسے تجھے اس لیے کچھ نہ بتایا کہ اتنی دور اپنوں سے الگ یہ خبر تجھے دکھی نہ کر دے مجھے کیا
 معلوم تھا کہ تو عین شادی کے دنوں میں یہاں آجائے گا اور میں نصیبوں جلی تیرے آنے
 کی خوشی بھی ڈھنک سے نہ منا پاؤں گی۔“ اماں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔
 لیکن خود اس کے اپنے دل پر لگنے والی چوٹ اتنی گہری تھی کہ فی الحال خود اس سے اپنا
 آپ نہیں سنبھل رہا تھا۔

”آپ جائیں اماں! میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ تھکے تھکے لہجے
 میں کہتے ہوئے رخ بدل کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ اماں کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی
 رہیں مگر جب وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا تو مجبوراً باہر نکل گئیں۔
 غصنفر نے ان کے باہر نکلتے ہی کمرے کا دروازہ لاک کیا اور واپس بیڈ پر آگیا
 بڑی دیر سے خود پر کیے ضبط کے بندھن ٹوٹنے لگے تھے۔

اس سے پانچ سال پہلے جب وہ ہاتھ میں بی ایس سی کے ڈگری اور آنکھوں
 میں بہت سے خواب لیے دہی سدھارا تھا تو رطابہ کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے
 اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کا انتظار کرے گی۔ آنسوؤں سے لکھا وہ عہد رطابہ نے کیسے
 بھلایا، پیار کی زنجیر سے بندھا رشتہ دولت کی ضرب سے کیونکر ٹوٹا غصنفر علی کا دل سمجھنے سے
 قاصر تھا۔ وہ تو سمجھا تھا منزل قریب آگئی۔ یوں دو ہاتھ کے فاصلے پر آکر وہ محروم رہ
 جائے گا یہ خبر نہ تھی۔

”اماں! شرمناک رہی ہے بھائی آئے ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟ مجھے ان سے ملنا
 ہے۔“ باہر سے احسن کی پر جوش آواز سنائی دے رہی تھی۔

”شش! شور مت کرو۔ بھائی تھکا ہوا آیا ہے آرام کر رہا ہے۔ بعد میں مل
 لینا۔“ اماں کی احسن کو تنبیہ کرتی نسبتاً ہلکی آواز سنائی دی۔

”آرام..... کیسا آرام۔ وہ تو اس نرم گرم بستر پر لیٹا بھی گویا کانٹوں پر لوٹ
 لہا تھا۔ دل میں اٹھتے شور نے اعصاب جھنجھنا کر رکھ دیے تھے۔ رہی سہی کسر کھلی کھڑکی
 سے اندر آتے شادی بیاہ کے گانوں کی آوازوں نے پوری کر دی تھی۔ غصنفر نے جھنجھٹا کر
 زور سے کھڑکی بند کی اندر آتی آوازوں کا زور ٹوٹ گیا لیکن دل کو چین کہاں تھا۔

اصل ہنگامہ اور چیخ و پکار تو خود اس کے اندر سے سر اٹھا رہے تھے۔ لاچار ہو کر
 اس نے اپنا سوٹ کیس کھولا۔

دہی میں قیام کے دنوں میں جب اپنوں سے دوری بہت شاق گزرنے لگتی عید
 تہوار پر تہائی کے ناگ اسے ڈسنے لگتے تھے تو وہ فرار کے لیے نیند کی گولیاں استعمال کرتا

تھا۔ اب بھی نجات کا واحد راستہ یہی لگ رہا تھا۔ اس نے شیشی میں سے دو گولیاں نکال کر منہ میں رکھیں اور نیبل پر پڑے پانی کے جگ کو منہ سے لگا کر غناٹ کئی گھونٹ چڑھا کر بستر پر اوندھا آلیٹا۔ وہ جانتا تھا اب کچھ ہی دیر میں نیند اسے اپنی آغوش میں لے کر اس ماحول بیگانہ کر دے گی اور فی الحال وہ یہی چاہتا تھا۔

☆☆☆

”پڑوس میں سے کوئی نہیں آیا ابھی تک؟“ زرد سادہ سے سوٹ میں لمبوس سوگوار سی رطابہ سے ثناء نے پوچھا۔

”آجائیں گے وہ لوگ تم اپنی تیاری مکمل کرو۔“ کلائی میں پڑی سبز چوڑیوں کو گھماتے اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

”میں تو بالکل تیار ہوں۔ بس لوگوں کا انتظار ہے۔ مہمان جمع ہوں گے تو ہی تمہارے مایوں کی رسم ہو سکے گی پھر نوشابہ آئی بری لے کر بھی تو آنے والی ہیں۔ مایوں تو ان کے آنے سے پہلے ہی ہو جانی چاہیے۔“

اپنے کامداز دوپٹے کو کاندھے پر سیٹ کرتی ثناء نے فکر مندی سے کہا۔ اس کے برعکس رطابہ کے اندر میں بے نیازی تھی۔ سیدھی مانگ پر بالوں کی چٹیا بنائے سر پر زرد دوپٹہ لیے وہ مسہری کی پشت سے ٹیک لگائے ڈھلیے ڈھالے انداز میں بیٹھی تھی۔ روٹی روٹی آنکھیں اور زرد دوپٹے کا عکس مل کر اس کے حسن کو سوگوار سا تاثر دے رہے تھے۔

”میں باہر جا کر دیکھتی ہوں کون کون آیا ہے۔ پھر اگر خالہ نے کہا تو تمہیں رسم کے لیے باہر لے جائیں گے۔“ ثناء نے بولتے ہوئے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے مگر پھر اندر آتی ثمرہ کو دیکھ کر رک گئی۔

”اچھی پڑوسی ہو تم۔ اتنی دیر سے آرہی ہو۔ میں تو رباب کو بھیجنے ہی والی تھی تمہیں بلانے۔“ اس نے ثمرہ کی کلاس لی۔

”سچ کہوں ثناء باجی! میں نے تو آج کا سارا دن یہیں گزارنے کا سوچ رکھا تھا لیکن بات ہی کچھ ایسی ہو گئی کہ میں آئی نہیں سکی۔“ ثمرہ کے انداز میں دبا دبا سا جوش

تھا۔

”اچھا! ایسی کیا بات ہو گئی؟“ ثناء نے مسکرا کر پوچھا۔

”میرے بڑے بھائی جو پانچ سال سے دہلی میں تھے آج بالکل ہی اچانک واپس آ گئے۔ سچ میں تو بہت خوش ہوں غنفر بھائی کے آنے سے۔“

”ارہے واقعی؟ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ لو بھی رطابہ! تم یاد کرتی تھیں ناں اپنے دوست کو وہ آ گیا تمہاری شادی میں شرکت کرنے۔“ ثناء پلٹ کر رطابہ سے بولی۔

”ثناء مجھے پانی دو میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ سینے پر ہاتھ رکھے پسینہ پسینہ ہوتی رطابہ ان دونوں کو پریشان کر گئی۔

”ثمرہ! پانی لاؤ جلدی۔“ ثناء نے رطابہ کی طرف بڑھتے ہوئے ثمرہ سے کہا مگر وہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی بے ہوش ہو کر مسہری پر گر چکی تھی۔ ثناء اس کے ہاتھ پیر سہلا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔

”ثناء باجی! یہ لیس پانی۔“ ثمرہ فوراً گلاس بھر کر پانی لے آئی تھی۔

”دیکھو امی اور خالہ کہاں ہیں انہیں جلدی سے بلا کر لے آؤ۔“ ذرا ہی دیر میں سب لوگ کمرے میں جمع ہو چکے تھے۔

”رطابہ! ہوش میں آؤ بچی۔“ نازلی آنٹی اور رطابہ کی امی مل کر اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کر رہی تھیں چہرے پر پانی کے چھٹے ڈالنے کے ساتھ ساتھ وہ اس کا چہرہ بھی تھپتھا رہی تھیں لیکن اس کے ہوش میں آنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔

”باجی! اسے اسپتال لے چلتے ہیں۔“ نازلی نے یہ صورت حال دیکھ کر بڑی بہن سے کہا۔ آنا فانا خبر مردوں تک پہنچائی گئی۔ رطابہ کا چھوٹا بھائی بھاگ کر ٹیکسی لایا اور یوں وہ مایوں بیٹھنے کے بجائے اسپتال جا پہنچی۔

”آپ لوگ فکر نہ کریں۔ آپ کی پیشہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بہت زیادہ ویکینس اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ابھی ڈیزھ دو گھنٹے میں اس لائق ہو جائیں گی کہ آپ انہیں اپنے ساتھ گھر لے جاسکیں لیکن پلیز! ان کے ذہنی سکون کا خیال رکھیے

گا۔ بے آرامی اور شور شرابے سے ان کی طبیعت پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔“ ڈاکٹر نے ان لوگوں کو تسلی دینے کے ساتھ ساتھ چند ہدایات بھی دیں۔

”کتنے دنوں سے ڈھنگ سے کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا۔ پھر گھر چھوڑنے کا غم میری بچی تو ادھ موٹی ہو کر رہ گئی۔ رباب ایک نمبر کی کام چور ساری ذمہ داریاں بھی اسی کو اٹھانی پڑیں۔ کچھ مجھ سے لا پرواہی ہو گئی۔ بیابنے والی بیٹی کا تو بہت خیال رکھنا پڑتا ہے لیکن میں کاموں میں الجھی اسے دیکھ ہی نہیں سکتی۔“ رطابہ کی امی آنکھوں سے آنسو پونچھ رہی تھیں

”کوئی بات نہیں ہو جاتا ہے کبھی کبھار۔ آپ ٹینشن مت لیں اسد کے ساتھ گھر جائیں اگر دولہاں والے آگئے تو انہیں ٹینڈ کرنے کے لیے بھی تو کسی کا ہونا ضروری ہے۔ رطابہ کے پاس میں ہوں آپ بے فکر رہیں جیسے ہی ڈاکٹر نے اجازت دی میں اسے لے کر گھر پہنچ جاؤں گی۔“ نازی نے بڑی بہن کو سمجھایا تو وہ گھر جانے کے لیے راضی ہو گئیں۔

معاہدہ نازک تھا۔ عین مایوں مہندی والے دن دلہن کا اسپتال میں ہونا دولہا والوں کو کسی شک میں بھی ڈال سکتا تھا ان کے روانہ ہونے کے بعد نازی اپنے بیٹے حسان کے ساتھ اسپتال میں ہی رک گئیں۔

”آپ لوگ انہیں لے جاسکتے ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی یہ مجھے کچھ ٹینس لگ رہی تھیں اس لیے میں نے انہیں خواب آور انجکشن دے دیا ہے۔ انجکشن کے اثر سے یہ صبح تک سوتی رہیں گی اور انشاء اللہ اٹھنے کے بعد بالکل سیٹ ہو جائیں گی۔“ دو گھنٹے بعد ڈاکٹر نے انہیں اطلاع دی تو وہ اسے گھر لے جانے کا انتظام کرنے لگیں۔

”کیا ہوا نازی! کیا حال ہے رطابہ کا؟“ گھر پہنچتے ہی سب نے انہیں گھیر لیا۔ ”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن ڈاکٹر نے اسے آرام کرنے کو کہا ہے پلیز آپ لوگ اس کے گرد رش لگانے کے بجائے باہر ٹھہریں۔“ انہوں نے سب کے سوالوں کا جواب دیتے نرمی سے درخواست کی تو کمرے سے رش چھٹنے لگا۔

”سوری نوشابہ! تم لوگ اتنے شوق اور ارمانوں سے بری لے کر آئے لیکن تمہاری بہو صاحبہ نے مسئلہ کر دیا۔“ نازی نے نوشابہ کو ہاتھ پکڑ کر روک لیا تھا اور معذرت خواہانہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔

”پاگل ہوئی ہو نازی! اس میں سوری کی کیا بات ہے۔ آج کل بچیاں ہوتی ہی بڑی دھان پان اور نازک ہیں اور شادی کے کام تو بڑے بڑوں کو تھکا ڈالتے ہیں۔ رہی رسموں کی بات تو وہ کون سا فرض ہیں۔ بس شغل ہی تو ہے سارا۔ میں نے اپنی بہو کو مایوں کے جوڑے میں دیکھ لیا۔ ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہے۔ گھر جا کر صدقہ دوں گی۔“ نوشابہ نے سبھاؤ سے نازی کو تسلی دی اور پھر رطابہ کی امی کی طرف مڑ کر بولیں۔

”آپ بالکل بے فکر رہیں۔ میرے دل میں کسی قسم کی ناراضی یا شکوہ نہیں۔ آپ رطابہ کو آرام کرنے دیں۔“

”بہت بہت شکریہ بہن۔“ نوشابہ کے تسلی آمیز فقرہوں پر رطابہ کی امی ممنونیت سے فقط اتنا ہی کہہ سکیں۔ نوشابہ نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگا لیا اور دھیرے دھیرے ان کی پیٹھ سہلانے لگیں۔

☆☆☆

صبح رطابہ کی آنکھ کھلی تو امی اس کے سرہانے بیٹھی اس کے بالوں میں انگلیاں بھیر رہی تھیں وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔ رات جو کچھ ہوا تھا اس وقت اسے قطعی یاد نہیں تھا۔

”اٹھ گئیں بیٹا! چلو اب چل کر ہاتھ منہ دھو لورات بھی تم نے کچھ نہیں کھایا تھا۔“ امی نے اسے دیکھتے ہوئے پیار سے کہا اور پھر رباب کو آوازیں دینے لگیں۔

”رباب! جلدی سے رطابہ کا ناشتہ بنا کر لے آؤ۔“

”اپنا خیال نہیں رکھتی ہوتا جب ہی یہ حالت ہو گئی ہے ابھی رباب ناشتہ لاتی ہے تو تمہیں اپنے سامنے بٹھا کر کھلاتی ہوں۔“ رطابہ نے مسہری سے اٹھنے کی کوشش کی تو

تمہاری دونوں پھپھیاں ہوں گی۔ شاء بھی برابر والے کمرے میں بیٹھی گفتگو وغیرہ پیک کر رہی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ ابھی نمنا دے یہ سارے کام دوپہر کے بعد تو کوئی نہ کوئی آہی جائے گا پھر بھیڑ بھاڑ میں کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔“ امی نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا تو وہ سر ہلاتے ہوئے سامنے پڑی ناشتے کی ٹرے میں سے چائے کا کپ اٹھانے لگی۔

”خالی پیٹ چائے معدے میں اٹیلنے کی کوئی ضرورت نہیں پہلے کچھ کھاؤ پھر پینا۔“ امی نے فوراً ہی اسے ٹوکا۔

”دل نہیں چاہ رہا!“ اس نے انکار کیا۔

”دل کا کیا ہے وہ تو بہت سی باتوں کو نہیں چاہتا اگر انسان دل کے کبے پر چلنے لگے تو ہو گئے دنیا کے سارے کام۔“ انہوں نے اسے ڈپٹا اور بواکل انڈا اٹھا کر چھیلنے لگیں۔ ”کھانا پینا جسم کی ضرورت ہے۔ یہ مواد دل کون ہوتا ہے ضروری کاموں کو روکنے والا اور پھر ہم کون سا نہیں پراٹھے کھلا رہے ہیں ہلکا پھلکا ناشتہ ہے انڈا ڈبل روٹی حلق سے اتارنا کوئی ایسی مشکل بات بھی نہیں۔“ وہ خفا خفا سی اسے کیا سمجھانا چاہ رہی تھیں رطابہ جان سکتی تھی۔ سوچ چپ ان کے ہاتھ سے انڈا لے کر آہستہ آہستہ کھانے لگی۔

”یہ ایک پیس ڈبل روٹی کا بھی کھا لو۔ دوپہر میں تمہاری پسند کے وال چاول بناؤں گی تب تک ان چیزوں سے گزارا کرو۔“ امی مسلسل اس کے کھانے پینے کی فکر میں مبتلا تھیں۔

”مت رکھیں میری پسند کا خیال۔ کچھ نہیں چاہیے مجھے کوئی خواہش نہیں میری۔“ وہ یکدم ہی اپنا ضبط کھو کر رونے لگی تھی۔

”بری بات ہے بیٹا! ایسا نہیں کرتے۔ میں ماں ہوں تمہاری تم سے زیادہ تمہارا برا بھلا سوچ سکتی ہوں۔ اگر تمہارا دل دکھا ہے تو خوش میں بھی نہیں لیکن اپنے اختیار سے بڑھ کر تو تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی حالات سے تم بھی اچھی طرح واقف ہو۔ جو کچھ

اسے یکدم ہی بہت زور کا چکر آیا۔ امی نے اسے فوراً ہی سنبھال لیا مگر ساتھ ہی ساتھ بڑبڑانے بھی لگیں۔

”میں ٹھیک ہوں امی۔ بس اچانک ہی کھڑے ہونے سے سرچکرا گیا تھا۔“ خود کو فوراً ہی سنبھالتے ہوئے اس نے انہیں تسلی دی اور غسل خانے کی طرف بڑھ گئی اس کا ذہن نیند کے غبار سے نکلنے کے بعد اب جاگنے لگا تھا۔ اسے یاد آرہا تھا کہ کل اس کی مایوں اور مہندی کی رسم تھی لیکن شمرہ کی زبانی غفنفر کی واپسی کی اطلاع سن کر وہ اپنے پہلے ہی سے تھے ہوئے اعصاب پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔

”اب کیوں آئے ہو غفنفر؟“ آئینے میں اپنی صورت دیکھتے اس نے اپنی آنکھوں میں جھانکا وہاں غفنفر کا عکس جھللا رہا تھا۔ آنسو ایک بار پھر روانی سے اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

”کتنا مشکل ہے تم سے جدائی کی راہ پر چلنا اور اب تمہارے یہاں آس پاس ہی ہونے کا احساس اس راہ کو دشوار ترین بنا رہا ہے۔“

جس دن سے اس کا عدن بخاری سے رشتہ طے پایا تھا وہ اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ عدن بخاری کی دولت خوب صورتی اور محبت پر غفنفر علی کی بچپن کی چاہت کے رنگ غالب تھے مگر وہ اپنے لب سے ایک مشرقی لڑکی ہونے کا بھرم رکھے ہوئے تھی۔

”باجی! جلدی باہر آئیں ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ رباب نے اسے آواز دی تو وہ جلدی جلدی چہرے پر پانی کے جھپا کے مارنے لگی۔

”شاء اور نازی آئی کہاں ہیں؟“ واپس کمرے میں آ کر اس نے ماں سے اپنی کیفیت پھپھانے کی خاطر گفتگو کا آغاز کیا۔

”نازی تو گھر گئی ہے۔ اپنے میاں کے کپڑوں اور کھانے پینے کا بندوبست کرنے تمہیں تو معلوم ہی ہے اپنے انگل کے بارے میں۔ اپنا گھر چھوڑ کر کسی دوسرے کے گھر ہرگز نہیں رکتے۔ نازی شام تک ان کے کام نمنا کر یہاں آجائے گی۔ رات پھر تمہاری سسرال جانا ہے زیادہ لوگوں کو تو میں نے بلایا نہیں۔ بس ہم گھر والے نازی اور

”میں جو بھی کروں لیکن تمہیں کیا ضرورت تھی پیچھے سے آکر مجھے ڈرانے کی اگر میں گر جاتی اور میری کوئی ہڈی وڈی ٹوٹ جاتی تو۔“ اس نے خفگی سے اسے دیکھا۔

”مجھے معلوم ہے تم نہیں گر سکتیں، بچپن سے تمہیں ہمارے پیڑ پر سے کیریاں چرانے کی پریکٹس ہے۔ اتنے ایکسپٹ چور کو میری ذرا سی لکار سے بھلا کیا فرق پڑ سکتا ہے۔“ وہ اسے چرانے کو بولا لیکن وہ بنا کوئی اثر لیے مزے سے بولی۔

”کیریاں چرانا میری مجبوری ہے۔ کوئی شوق نہیں اگر تم لوگ ہمسایوں کے حقوق کا خیال کرتے خود ہی روزانہ چند کیریاں ہماری طرف بھجوا دیا کرو تو مجھے کیا ضرورت ہے اتنی محنت کرنے کی لیکن تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو تو لگتا ہے ہمسایوں کے حقوق کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں بلکہ میرا خیال ہے اسلامیات کی کتاب میں سے جب تمہارا ٹیچر۔“ ہمسایوں کے حقوق“ والا چھپر پڑھاتے ہوں گے تو تم کانوں میں روٹی ٹھونس کر کلاس میں بیٹھتے ہو گے۔“

”ہم نے ہمسایوں کے حقوق نہیں پڑھے کم از کم تم ہی ”چوری کی مذمت“ پر کچھ پڑھ لیتیں۔ غضب خدا کا اتنی کیریاں چراتی ہو کہ آم پکنے سے پہلے پہلے ہی ہمارا پیڑ گنجا ہو جاتا ہے۔“ جواباً اس نے مبالغہ آرائی کی حد کر دی۔

”ارے واہ کہاں کی چوری میرے خون پسینے کی کمائی ہیں یہ کیریاں۔“ رطابہ نے ناک چڑھا کر اس کا الزام رو کر دیا۔

”اچھا.....! وہ کیسے؟“ اس نے لہجے میں حیرت پیدا کی۔

”اتنی بھری دوپہر میں اپنی دیوار پر چڑھ کر تمہارے پیڑ پر چڑھنے اور کیریاں توڑنے میں ذہیروں پسینہ آجاتا ہے اس پر سے تم نے آکر ڈرایا تو بوکھڑا کر پلٹنے میں میری کہنی چھل گئی۔ دیکھ لو ابھی تک خون نکل رہا ہے۔“ اس نے اپنا بازو سامنے کیا۔ چھلی ہوئی کہنی پر خون کے ننھے ننھے چند قطرے دکھائی دے رہے تھے۔

”گاڈ! تم سے احق لڑکی نہیں دیکھی میں نے۔ اندر چلو ڈیوئل سے چوٹ صاف کر کے کوئی مرہم لگاتا ہوں۔“ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر

ہوا اس میں میرا یا تمہارے۔ ابو کا کوئی دوش نہیں۔ تمہارے دل کی خواہش پوری ہو سکتی تو ہم کبھی رکاوٹ نہ بنتے لیکن جیسے حالات تھے اس میں ہم نے عدن کا رشتہ قبول کر کے تمہارے لیے اچھا ہی سوچا۔ لوگ تمہاری قسمت پر ناز کر رہے ہیں۔ اتنے اونچے خاندان کا پڑھا لکھا لڑکا ہے وہ۔ اس کی ماں کتنی چاہت اور عزت سے تمہارا رشتہ لائی تھی کل بھی ایسی بری آئی ہے تمہاری کہ ہم نے اپنے جاننے والوں میں کسی کی نہیں دیکھی ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی ساز و سامان ہے دیکھو گی تو دیکھتی رہ جاؤ گی۔“ وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔

”چیزوں سے خوشی کب ملتی ہے امی!“ وہ بکھنے لگی۔

”بات چیزوں کی نہیں عزت کی ہے عدن کے گھر والے تمہیں عزت اور احترام سے لے جانا چاہتے ہیں ہم جیسے سفید پوش لوگوں کے لیے سب سے اہم بات عزت ہی ہوتی ہے اور یہی بات میں تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں۔ خدا کے لیے رطابہ تم ہماری عزت سے نہ کھیلنا۔“

اس بار آنسوؤں نے ان کی آنکھوں کی سرحد پار کی تھی۔ رطابہ جو جذبات کے زیر اثران سے الجھ رہی تھی تڑپ کر ان کے سینے سے جا لگی۔ احتجاج کرنا اور بات تھی لیکن وہ کبھی اپنے ماں باپ کی عزت کو روکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

”کیا ہو رہا ہے یہ؟“ درخت پر چڑھی رطابہ اپنی پشت پر سے سنائی دینے والی آواز پر چونک کر پلٹی تھی۔

”تم غنفر کے بچے اتنی زور سے ڈرا دیا۔ اگر میں درخت سے گر جاتی تو۔“

سامنے غنفر کو کھڑے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ ہاتھ بڑھا کر ایک کیرنی اور توڑ لی۔ ”یہ لو پکڑو۔“ دوپٹے کے پلو میں جمع کی گئی کیریاں ایک ایک کر کے اچھالتے اس نے پہلے اپنا پلو خالی کیا اور پھر خود بھی چھلانگ مار کر نیچے اتر آئی۔

”تمہیں چین سے بیٹھنا نہیں آتا۔ جب دیکھو تب اس درخت سے لٹکی ہوتی ہو۔“ غنفر نے کیریاں واپس اس کے پلو میں ڈالتے ہوئے اسے ڈنپا۔

گھینٹے ہوئے اندر لے گیا تھا۔ ”آئندہ تمہیں ایسی امتحانہ حرکتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جتنی کیریاں چاہیے ہوں مجھ سے کہہ دیا کرو میں خود توڑ کر دے دوں گا۔“ وہ خفا خفا سا اسے ڈانٹ رہا تھا۔

”غصنفر! اٹھ گئے بیٹا!“ دروازے پر ہونے والی دستک کے ساتھ سنائی دیتی اماں کی آواز نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ اس نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ اب نہ وہاں کوئی آنگن تھانہ آم کا پیڑ۔

”غصنفر! دروازہ کھول بیٹا! دوپہر ہونے کو آئی ہے تو نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔“ اماں کی آواز میں واضح پریشانی تھی اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ کر دروازے کا لاک کھولا۔

”تیرے واپس آنے کا کیا فائدہ تیرے یہاں رہتے ہوئے بھی میں تیری صورت دیکھنے کو ترس رہی ہوں۔“ اماں کی آنکھوں میں ڈھیروں آنسو تھے۔

”سفر کی تھکن تھی اماں! بس اس لیے تھوڑا زیادہ سو گیا۔“ وضاحت دیتے اس کے لہجے میں بلا کی تھکن تھی۔ اماں اس کی سوچی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر نظر چرا گئیں۔

”اچھا چل اب نہا دھو کر باہر آ جانا شے کا وقت تو تو نے نکال دیا میں کھانا لگوا رہی ہوں۔ تیرے ابا اور احسن بھی تیری وجہ سے آج کہیں نہیں گئے۔ بیٹھ کر ان کے ساتھ کھانا کھا لینا۔ احسن بے چارہ تو ابھی تک تجھ سے ملا بھی نہیں۔“ انہوں نے اسے پیار سے چکارا تو وہ فرمانبرداری سے سوٹ کیس میں سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔

”تو جا کر نہا میں ابھی ثمرہ سے تیرے کپڑے استری کرواتی ہوں۔ باقی کپڑے وہ شام میں استری کر کے تیری انارنی میں ٹانگ دے گی۔“ اماں کے کہنے پر وہ سر ہلاتا نہانے چلا گیا۔

”آپ نے مجھے اپنے دیدار کے لیے ترسا دیا بھائی کل سے آس لگائے بیٹھا ہوں اور آپ ہیں کہ اٹھارہ انیس کھنے سے لگا تا سو رہے ہیں۔ سچ بتائیں کیا وہاں دینی میں پانچ سال جاگ کر گزارے ہیں؟“ وہ استری شدہ سوٹ پہن کر ڈائینگ روم میں

پہنچا تو احسن اس کے گلے لگ کر ڈھیروں شکوے کرنے لگا۔

”اب تم لوگ باتیں ہی کیے جاؤ گے یا کچھ کھاؤ پیو گے بھی۔“ اماں کے ٹوکنے پر وہ دونوں بھائی کرسیوں پر آ بیٹھے۔

”میں نے اپنے ہاتھ سے چائیز رائس بنائے ہیں“ آپ کھائیں گے تو مجھے داد دیں گے۔“ ثمرہ نے اس کے آگے ڈش رکھتے فخر سے بتایا۔

”ایک تو سردیوں میں سبزیوں کی بہتات ہماری بہن کو پاگل کر دیتی ہے کبھی چائیز رائس تو کبھی سبزیوں کی بریانی اور کباب ہر ڈش میں سبزیاں ہی سبزیاں دکھائی دیتی ہیں۔“ احسن جسے سبزیاں سخت ناپسند تھیں چڑ کر بولا۔

”کون سے لوکی بیگن پکا لیے میں نے اتنی اچھی ڈش ہے لیکن آپ کو تو صرف سبزی نظر آتی ہے اس میں جو انڈے اور چکن ڈالی ہے اس کی کوئی ویلیو نہیں۔“ ثمرہ نے منہ پھلا کر احسن کو جواب دیا۔

”اوہو ختم کرو یہ جھگڑا مجھے اپنے بیٹے سے بات کرنے دو۔“ ابا نے انہیں ٹوکا۔

”آپ کہیں ابا! میں سن رہا ہوں۔“ پلیٹ میں نکالے چند لقمے چاولوں کو بچچے سے ادھر ادھر کرتے وہ بولا تھا۔

”کوئی خاص بات نہیں بیٹا! تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ تم کھاپی کر فارغ ہو جاؤ تو پھر اسٹور تک چلتے ہیں تم وہاں کا جائزہ لے لیتے جو کی بیشی لگے اسے دیکھ کر بتا دینا۔ آخر کو اب تمہیں ہی وہاں کے معاملات دیکھنے ہیں احسن تو پڑھائی مکمل کر کے اپنی لائن کا ہی کوئی کام کرے گا۔“

”میں نے کیا کرنا ہے جائزہ لے کر آپ ہیں ناں سب کچھ دیکھنے والے ویسے بھی میں تو چھٹی کے چند دن گزار کر واپس دینی چلا جاؤں گا۔“ اس کے جواب نے سب کو حیران کر دیا ”یہ تو کیا کہہ رہا ہے غصنفر! تو تو پچھلے پانچ سال سے اسی لیے چھٹی لے کر نہیں آیا کہ ایک ہی بار آؤں گا۔ اب آ گیا ہے تو پھر واپس جانے کی کیا ضرورت پڑی

ہے۔ ہم نے تو اسی خیال سے ایک ایک پیسہ سنبھال کر خرچ کیا کہ تجھے لمبا عرصہ ہم سے جدا نہیں رہنا پڑے اور آخر تجھے ضرورت کیا پڑی ہے واپس جانے کی۔ یہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ گھر بنا لیا ہے کاروبار بھی جم گیا ہے۔ اچھی آمدنی ہوتی ہے پھر بلاوجہ تو پردیس میں خوار کیوں ہو؟“ اماں نے فوراً ہی اسے ٹوکا مگر وہ بنا کوئی رد عمل ظاہر کیے چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

☆☆☆

”مہمات سنیں میری۔“ خوشگوار موڈ میں مہمانوں کو اٹینڈ کرتی ماما کا ہاتھ پکڑ کر وہ ایک کونے میں لے گیا۔

”کیا ہے عدن؟ کل شادی ہونے والی ہے تمہاری اور بی بیو بالکل بچوں کی طرح کر رہے ہو۔ سارے لوگ تمہیں ماما بوائے کہہ کر بلاتے ہیں۔ کل کو تمہاری بیوی آجائے گی تو اسے یوں منٹ منٹ پر تمہارا مجھے پکارنا برا بھی لگ سکتا ہے۔“ وہ جو خود چھوٹے بچوں کی طرح اس کے لاڈ اٹھاتی تھیں اسے سمجھانے لگیں۔

”اوہو ماما! جو آپ سے کرنے کی بات ہے وہ آپ سے ہی کروں گا ناں لوگ چاہے کچھ بھی کہتے رہیں۔“ وہ تھوڑا جھنجھلایا۔

”اچھا کہو کیا مسئلہ ہے؟“ وہ فوراً ہی پسج گئیں۔

”میں چاہ رہا تھا کہ رطابہ کے گھر والے اگر کوئی رسم وغیرہ کرنا چاہ رہے ہیں تو ابھی فوری طور پر کر لیں تاکہ میں فارغ ہو جاؤں آگے آپ کا جو بھی پروگرام ہے آرام سے جاری رکھیے گا۔“ اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

”کیوں؟ تمہیں کس بات کی جلدی ہے؟“ ماما نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔

”بس ہے نا کوئی بات آپ نہیں سمجھیں گی۔“ اس کے لیوں پر مبہم سی مسکراہٹ جگمگائی۔

”سب سمجھ رہی ہوں میں خیر تم جو کہتے ہو ویسا کر لیتی ہوں۔“ انہوں نے اس

کے شانے پر ہلکی سی دھپ لگاتے ہوئے کہا اور وہاں سے ہٹ گئیں۔ پھر رطابہ کی امی اور نازی آئی کے ساتھ اس کی دونوں ہتھکیوں نے عدن کی رسم ادا کی اور پھر وہ لمحوں میں اپنے دوستوں کو جل دیتا وہاں سے اڑنچھو ہو گیا۔ ڈنر اور محفل غزل کے چارم میں کھوئے مہمانوں کو اس کی عدم موجودگی کا احساس ہونا مشکل ہی تھا اور اس نے سوچ سمجھ کر یہ موقع منتخب کیا تھا کل ماما کی زبانی رطابہ کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں سن کر وہ بے حد پریشان ہو گیا تھا اور ماما کی تمام تر تسلیوں کے باوجود خود ایک نظر اسے دیکھ کر مطمئن ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ آج جیسے ہی رطابہ کے گھر سے مہمان آئے اس نے نازی آئی سے تمام معلومات حاصل کر لیں۔ گھر پر رطابہ کے ساتھ صرف ثناء تھی اور باقی لوگ یہاں آچکے تھے۔ عدن کو رطابہ سے ملاقات کے لیے یہ موقع بے حد مناسب محسوس ہوا۔ سواب وہ تیزی سے ڈرائیو کرتا رطابہ کے گھر کی طرف گاڑن تھا۔

”آپ! اور یہاں!“ دروازے پر دستک کے جواب میں ثناء نے دروازہ کھولا اور اسے سامنے کھڑا دیکھ کر حیرت سے بولی۔

”مجھے رطابہ سے ملنا ہے ثناء! پلیز ہیلپ می۔ بس دس منٹ کی بات ہے میں اس سے مل کر اس کی خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے لجاجت سے ثناء سے کہا۔

”اندر آجائیے۔“ ثناء اس کی بے قراری پر مسکراتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی۔

☆☆☆

”دیکھیں بھائی! میں نے آپ کے چھ سات سوٹ پر لیں کر دیے ہیں۔ فی الحال یہ کافی ہوں گے باقی بھی میں کل پر لیں کر دوں گی ابھی مجھے تھوڑی جلدی ہے۔“ وہ لبا کے ساتھ بقول ان کے سپراسٹور کا جائزہ لے کر ابھی ابھی گھر واپس آیا تھا کہ اس کے کمرے میں کپڑے پر لیں کر کے الماری میں رکھتی ثمرہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”تھینک یو بھائی! اصل میں صبح سے اتنی مصروف ہوں کہ پڑوس کا ایک چکر بھی نہیں لگا سکی کل رات بے چاری رطابہ باجی کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی تھی۔ کیا سوچتی

ہوں گی کہ میں انہیں دیکھنے تک نہیں گئی۔“ ثمرہ اپنی ہی دھن میں بول رہی تھی مگر وہ بیزار سا بیٹھا تھا اس کی ساری حیات جاگ اٹھیں۔

کیوں؟ کیا ہوا تھا اسے؟“

”پتہ نہیں بس میں وہاں پہنچی تو ان کی کزن ثناء باجی میرے دیر سے آنے پر ہونے لگیں۔ میں آپ کے آنے کا بتا کر معذرت کر رہی تھی کہ اچانک رطابہ باجی کی طبیعت خراب ہونے لگی اور وہ بے ہوش ہو گئیں۔ ان کی امی اور نازی آئی انہیں اسپتال لے کر گئیں تب کہیں جا کر وہ سنبھلیں لیکن ڈاکٹر نے سکون کا انجکشن لگا کر بھیجا تھا اس لیے وہ اسپتال سے آکر بھی سوتی رہیں۔ نہ مایوں کی رسم ہو سکی اور نہ مہندی کی محلے کی عورتیں تو باتیں بھی بنا رہی تھی لیکن رطابہ باجی کی ساس بہت اچھی خاتون ہیں انہوں نے ذرا بھی منہ نہیں بنایا۔“ ثمرہ کو اماں نے غنفتر کے سامنے رطابہ کے گھر کی کوئی بھی بات کرنے سے منع کیا تھا مگر وہ اس وقت ان کی ہدایت کو بھولے ساری تفصیل سن رہی تھی۔

”اچھا تم ایسا کرو ابھی جا کر رطابہ کی خیریت معلوم کرو لیکن دس منٹ سے زیادہ وہاں نہیں بیٹھنا۔“ غنفتر نے اسے جانے کی ہدایت کی اور خود بے چینی سے کمرے میں چکر کاٹا انتظار کرنے لگا مگر ثمرہ کو اس کی کیفیت کا بھلا کیا اندازہ ہو سکتا تھا وہ دس منٹ کے بجائے پورے آدھے گھنٹے میں واپس آئی۔

”کہاں چلی گئی تھیں تم؟ میں نے کہا بھی تھا دس منٹ میں واپس آ جانا۔“

غنفتر جھنجھلا یا۔

”سوری بھائی! اصل میں وہ لوگ مہندی لے کر دولہا والوں کے گھر جا رہے تھے افراتفری اور ہنگامے میں وقت گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلا ثناء باجی تو ابھی بھی مجھے آنے نہیں دے رہی تھیں کہ اچھا ہے مل کر باتیں کریں گے مگر میں آپ کے خیال سے واپس آ گئی۔“

ثمرہ نے فوراً ہی معذرت کرتے وضاحت پیش کی۔

”رطابہ کے پاس اس کی کزن کے علاوہ اور لوگ بھی تو ہوں گے؟“ اس نے

جملہ انداز میں ثمرہ سے پوچھا۔

”نہیں تو صرف ثناء باجی ہیں باقی لوگ تو رطابہ باجی کی سسرال گئے ہوئے ہیں۔“ ثمرہ کا جواب سن کر وہ تیز تیز قدموں سے چلتا گھر سے باہر نکل گیا اس کے سینے میں ایک الاؤ سا دھک رہا تھا۔ بہت سے سوال تھے جن کے جواب اس نے رطابہ سے لینا تھے اور اس سے بہتر موقع شاید اسے پھر نہ ملتا۔

”جی!“ دسک کے جواب میں باہر نکلنے والی ہستی یقیناً ثناء تھی۔

”میں غنفتر ہوں۔ رطابہ کا پڑوسی اس سے ملنے آیا ہوں۔ تم ثناء ہونا اس کی کزن کیا مجھے پہچانا نہیں؟“

”ارے ہاں پہچان لیا کیسے ہیں آپ؟ اصل میں اتنے سالوں بعد دیکھا ہے۔“ تو اس لیے فوراً پہچان نہیں سکی۔ ورنہ کل ثمرہ نے آپ کے آنے کے بارے میں بتایا تھا اچھا ہے آپ رطابہ سے ملنے آ گئے۔ آپ سے مل کر اس کی طبیعت بہل جائے گی۔ آپ تو اس کے بہت اچھے دوست ہیں آپ کی غیر موجودگی میں وہ آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔“ ثناء جوں سے بولتی اسے اندر لے گئی۔

”رطابہ یہ سامنے والے کمرے میں ہے آپ اندر چلے جائیں۔ میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ اسے بتا کر وہ خود کچن میں چلی گئی۔

غنفتر آہستگی سے قدم اٹھاتا ثناء کے بتائے گئے کمرے کی طرف بڑھا کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور سامنے مسمری پر زرد لباس میں خود بھی زروسی ہوتی رطابہ لیٹی صاف دکائی دے رہی تھی۔ غنفتر وہیں کھڑا اسے دیکھنے لگا۔ وہ سیدھی لیٹی ایک تک کمرے کی جھٹ کو تک رہی تھی۔ بیز چوڑیوں سے بھرا ہاتھ سینے پر رکھا تھا اور بالوں کی لٹیں چٹیا سے نکل کر چہرے پر بکھری ہوئی تھیں یقیناً اس نے کل کے بعد دوبارہ بالوں کو سنوارا نہیں تھا انجان خیالوں میں ڈوبی وہ ویلنیز پر کھڑے غنفتر کی موجودگی سے یکسر لاعلم تھی۔ غنفتر نے ہاتھ بڑھا کر انگلی سے دروازے کو ہلکے سے بجایا۔ آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا اور غنفتر کو سامنے پا کر تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”غففر.....“ اس کے ہونٹوں نے آہستگی سے اسے پکارا تھا۔

”شکر ہے تمہیں میرا نام یاد ہے ورنہ میں تو سمجھا تھا دولت کی چکا چوند میں تم میرے جذبوں کے ساتھ مجھے بھی فراموش کر بیٹھی ہوگی۔“ وہ طنز سے مسکرایا۔

”دولت کے طعنے مت دو مجھے۔ نوٹوں کی خوشبو میرے جذبوں کی مہک پر کبھی حاوی نہیں ہو سکی لیکن تمہارے گھر والوں کے رویے نے مجھے اپنے جذبات کو کچل دیے پر مجبور کر دیا۔ آج میں اپنے خوابوں کے طے پر اپنی زندہ لاش لیے اپنے ماں باپ کی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے کھڑی ہوں تو تم مجھے طعنے دینے آ گئے۔“ وہ بے تحاشہ پڑی تھی۔

”اماں کو بھیجا تو تھا میں نے غنی چا چا اور چاچی کے پاس رشتے کی بات کرنے لیکن انہوں نے بنا کوئی جواب دیے تمہارا رشتہ کہیں اور طے کر دیا ایسے میں میں یہ نہ سمجھوں کہ میرے سچے جذبوں کی جگہ دولت کی پذیر آئی کی گئی ہے تو اور کیا سمجھوں۔“ اس کے رونے سے گھبرا گیا تھا سو بے بسی سے بولا۔

”آئیں تمہیں تمہاری اماں! رشتہ بھی مانگا تھا انہوں نے مگر ان الفاظ میں جنہیں سن کر کوئی بھی عزت دار بیٹی والے ہاں نہیں کر سکتے انہوں نے ابو سے کہا کہ غففر کا خط آیا ہے اس نے رطابہ کے رشتے کے لیے زور دیا ہے صاف بات ہے میں نے تو ایسا کبھی سوچا نہیں لیکن غففر کے خط سے ایسا لگتا ہے اس کے اور رطابہ کے بیچ سارے معاملات طے ہیں۔ ہو سکتا ہے خط بھی غففر نے رطابہ کے کہنے پر لکھا ہو۔ ایسے میں ہمارے تمہارے سوچنے کی گنجائش تو رہتی نہیں۔ غففر آجائے تو دو بول پڑھا کر رطابہ لے جاؤں گی۔ اب تم خود سوچو غففر! میرے ماں باپ کا اور میرا کیا حال ہوا ہوگا۔

تمہاری ماں نے ان کی گردنیں جھکائیں اور میں خود شرم کے مارے ان سے نظر ملانے کے لائق نہیں رہی کیا تھا تمہارے اور میرے درمیان سوائے ایک خاموش محبت کے بس ایک ان کہی ہی تو تھی جسے ہمارے دل جانتے تھے لیکن تمہاری اماں کے انداز سے ایسا لگا کہ نہ جانے میں کیا کچھ کر گزری ہوں۔ بچپن کی معصوم دوستی سے جوانی کی بے داغ محبت

تک ہمارے تمہارے درمیان کوئی ایک لمحہ بھی تو ایسا نہیں جسے سوچ کر میں اپنے آپ سے شرم محسوس کر سکوں۔ میرے اللہ کے بعد تم خود اس بات کے گواہ ہو۔ پانچ سال تک میں نے تمہارا خاموش انتظار تو ضرور کیا لیکن کبھی ایک معمولی سا خط بھیجنے یا فون کرنے کی غلطی نہیں کی۔ اس پر میری ذات پر لگنے والے ایسے الزامات میرے پاس تو اپنے ماں باپ کی آن پر قربان ہونے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہا کروڑ پتی عدن بخاری کی جگہ وہ اگر کسی معمولی ٹھیلے والے سے بھی میرا رشتہ طے کرتے تو میں انکار نہیں کرتی کیونکہ کہہ ہی نہیں سکتی تھی۔“ رطابہ کے الفاظ اسے پاتال میں دھکیل رہے تھے۔ جس کے ہاتھوں لٹا تھا اس ہستی کے بارے میں کبھی کچھ غلط سوچنا بھی اس کے نزدیک گناہ تھا۔ سامنے کھڑی رطابہ کا وجود ہچکچوں سے بری طرح لرز رہا تھا لیکن اس پل خود غففر علی کے دل کی دنیا میں جو آگ لگی تھی اس میں گہرا وہ خود اپنا وجود بھی سنبھالنے کے لائق نہیں تھا۔ سو ایک جھٹکے سے پلٹا اور کھلے دروازے سے سیدھا باہر نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

”غففر! کہاں چلا گیا تھا بیٹا؟“ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا اماں سے سامنا ہو گیا لیکن وہ بنا کوئی جواب دیے ایک زخمی سی نگاہ ان کے چہرے پر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اس پل اس کے چہرے کے تاثرات اتنے گہمیر تھے کہ اماں کو کسی انہونی کے احساس نے لرزادیا۔

”غففر! کیا بات ہے اتنا چپ کیوں ہے؟“ اماں ہول کر اس کے پیچھے لپکی تھیں وہ جو اپنے کمرے میں بیڈ پر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگا۔

”آپ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا اماں؟“ الفاظ سرسراتے ہوئے اس کے ہونٹوں سے نکلے تھے۔ اماں اپنی جگہ ساکت رہ گئیں مگر پھر سنبھل کر بولیں۔

”کیا کیا ہے میں نے جو تو میرے سر الزام رکھ رہا ہے؟“

”آپ نے میری زندگی بھر کی خوشیوں کو مجھ سے چھینا ہے۔ آپ نے میری

محبت کا قتل کیا ہے آپ نے میرے ساتھ وہ کیا ہے اماں! کہ اب میں چاہوں بھی تو خود کو زندہ محسوس نہیں کر سکتا۔“ وہ اتنا لمبا چوڑا مرد پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

”آپ نے خود پر سے میرا بھروسہ اٹھا دیا۔ آپ نے کہا کہ آپ رطابہ کے گھر میرا رشتہ لے کر گئی تھیں۔ میں نے یقین کر لیا لیکن آپ نے غنی چاچا کے انکار کی وجہ سے نہیں بتائی آپ نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ جو مجھے اپنے سگے بیٹوں کی طرح چاہتے تھے کیسے کسی اور کو مجھ پر ترجیح دے گئے۔“

”غففر! میری بات تو سن بیٹا!“ اماں بوکھلائی جا رہی تھیں۔

”کہنے سننے کو اب رہا ہی کیا ہے میں تو اپنا سب کچھ گنوا چکا۔ لیکن آنے والا وقت آپ سے پوچھے گا کہ آپ نے یہ سب کیوں کیا؟ تو آپ کے پاس سوائے بچھتاؤں کے کچھ نہیں ہوگا۔“

”تو کیا کرنے والا ہے غففر!“ وہ خوفزدہ ہوئیں۔

”کچھ نہیں کم از کم حرام موت تو ہرگز نہیں مروں گا مگر آپ صرف سانپوں سے رشتہ جوڑے میرے لاش جیسے وجود کا کیا کریں گی۔ میں آپ کی نظروں کے سامنے چلتا پھرتا کھاتا پیتا موجود تو رہوں گا لیکن آپ پھر بھی مجھے ترسیں گی۔“ وہ یکدم ہی رخ بدل گیا تھا۔ اماں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے انداز میں اتنی سختی تھی کہ وہ لبوں کو حرکت دینے کی جرأت نہ کر سکیں اور تھکے تھکے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ غففر نے ان کے نکلنے ہی جھپٹ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور سلیٹنگ پلڑی کی شیشی سے دو گولیاں نکال کر پانی کے ساتھ نکل گیا۔ اگر وہ موت کو گلے نہیں لگا سکتا تھا تو جاگتی آنکھوں سے اتنی تلخ حقیقتوں کا سامنا بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

”اماں! آپ کے کون سے کپڑے استری کروں شادی میں جانے کے لیے۔“ وہ کم صم سی بیٹھی کچھ سوچ رہی تھیں کہ شرہ کی آواز نہیں چونکا یا۔

”ہوں..... کیا کہا تم نے؟“

”میں پوچھ رہی ہوں رطابہ باجی کی شادی میں کون سے کپڑے پہن کر جائیں گی؟ آپ بتائیں تو میں نکال کر استری کر دوں۔“ شرہ نے اپنی بات دوہرائی۔

”میرا تو دل ہی نہیں چاہ رہا کہیں آنے جانے کو۔“ انہوں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”لیکن جانا تو ہو گا ناں! آخر وہ لوگ ہمارے اتنے پرانے پڑوسی ہیں۔ ہمارا ان کے ہاں گھر جیسا آنا جانا ہے۔ اگر نہیں گئے تو غنی چاچا اور چاچی کو برا لگے گا پہلے ہی رباب مجھ سے ناراض ہو رہی تھی کہ میں نے ان کے ہاں کی تقریبات میں بھرپور شرکت نہیں کی۔ بلکہ غففر بھائی کو بھی چاہیے کہ وہ ہمارے ساتھ چلیں۔ بچپن سے رطابہ باجی سے دوستی ہے اور اب جب ان کی زندگی کا اتنا اہم دن ہے تو بھائی سرمنہ لپیٹے کمرے میں بند ہیں۔“

”اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ اور الماری سے میرے کوئی بھی کپڑے نکال کر استری کر دو۔“ اماں کچھ بے چین ہو گئی تھیں اس لیے دانستہ اسے جھڑکتے ہوئے بولیں۔ غففر نے کل سے خود کو اپنے کمرے میں بند کر رکھا تھا صبح شرہ سے چائے بنا کر پی تھی اس کے بعد سے مسلسل خاموشی تھی۔ دوپہر کے کھانے پر انہوں نے بہتیرا دروازہ بجایا اور اسے کھانے کے لیے پکارا لیکن وہ باہر نہیں نکلا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر بری طرح پچھتا رہی تھیں۔ آخر کیوں انہوں نے غففر کا رشتہ رطابہ سے نہیں کرانا چاہا تھا؟ صرف اس لیے ناں کہ نئے نئے آنے والے پیسے نے ان کے خیالات بدل دیے تھے وہ خوشی کو دولت کی دین سمجھنے لگی تھیں انہیں لگتا تھا کہ اگر غففر کی شادی رطابہ کے بجائے کسی اونچے گھرانے میں کی جائے تو یہ غففر کے حق میں اچھا رہے گا۔ لیکن آج بیٹے کا ٹرپنا انہیں احساس دلا رہا تھا کہ اس کے لیے تو سب سے بڑی دولت ہی رطابہ تھی وہ رطابہ جیسے انہوں نے معمولی لڑکی سمجھ کر چھوڑ دیا تھا آج شہر کے ایک بڑے صنعتکار کی بہو بننے جا رہی تھی۔

☆☆☆

”بارات نہیں آئی؟“

”بڑے لوگ ہیں بھئی جب دل چاہے گا آجائیں گے۔ آجکل تو ویسے بھی رواج بنتا جا رہا ہے آدھی رات کے بعد بارات لے کر نکلنے کا۔“

”مگر مہندی والے روز تو بہت جلدی آگئے تھے۔ بالکل دیے ہوئے وقت پر۔“ پنڈال میں ہر طرف چہ گوئیاں ہو رہی تھیں۔ بڑھتی ہوئی ٹھنڈ میں بھوک سے منڈھال مہمان اب بیزار ہونے لگے تھے رطابہ کے گھر والوں کے چہرے پر بھی اس وقت پریشانی اور کوفت کے آثار تھے۔

”نازلی! تم فون کر کے پوچھو ناں آخر وہ لوگ ابھی تک کیوں نہیں آئے۔“ رطابہ کی چھوٹی پھپھو بالا خرہ نہ سکیں۔

”امی نے فون کیا تو تھا آنٹی! ان لوگوں نے کہا تھا کچھ مہمان آنے باقی ہیں ان کا انتظار ہے۔“ ثناء نے ماں کی جگہ جواب دینے کی ذمہ داری اٹھائی۔ یہاں موجود تمام لوگوں میں سے سب سے زیادہ ٹینشن اسی کو تھی۔ کل جب غنفر کی موجودگی میں عدن بخاری وہاں پہنچا تو وہ ذرا بھی پریشان نہ تھی کیونکہ وہ جانتی تھی عدن ایک کھلے ذہن و دل کا شخص ہے اور اس کی کلاس میں یوں بھی لڑکا لڑکی کی دوستی کو مانڈ نہیں کیا جاتا اس لیے وہ بہت مطمئن سی اسے لے کر اس کمرے کی طرف چلی آئی تھی جہاں رطابہ اور غنفر موجود تھے مگر اندر سے سنائی دیتی ان دونوں کی آوازوں نے اسے اور عدن کو باہر ہی رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان دونوں کی گفتگو سے ان کی تعلق کی نوعیت بہت واضح طور پر پتہ چل رہی تھی۔

”ثناء! پلیز مجھ سے پرامس کرو کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔ یہاں تک کہ رطابہ کو میرے یہاں آنے اور سب کچھ سن لینے کی خبر بھی نہیں دو گی؟“ وہ اس سے وعدہ لے کر غنفر کے باہر نکلنے سے پہلے ہی واپس پلٹ گیا تھا۔ اس کے اس رد عمل پر ثناء ششدر رہ گئی تھی کچھ ہو جانے کا خطرہ اس کے دل کو ہلاتا رہا تھا اور اب شاید اس کا ہر ڈرچ ثابت ہونے والا تھا۔

”نازلی! میرا خیال ہے تم دوبارہ فون کر کے پوچھو کیونکہ اب تو واقعی بہت دیر

ہو گئی ہے۔“ کسی اور رشتہ دار نے بھی زور دیا تو وہ سر ہلاتی اپنے شوہر کی طرف بڑھ گئیں رطابہ کا رشتہ ان کے توسط سے اتنے اچھے گھرانے میں ہو جانے پر جہاں ان کی واہ واہ ہوئی تھی وہیں کسی گریڈ کے آثار محسوس ہوتے ہی سارا بوجھ بھی ان کے شانوں پر آپڑا تھا۔

”ہاں بھی نوشابہ! نازی بات کر رہی ہوں۔ کیا بات ہے تم لوگ ابھی تک پہنچے نہیں یہاں سب لوگ بہت بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ انہوں نے رابطہ ہوتے ہی کہا تھا۔

”کیا کہہ رہی ہوں؟“ جواباً نوشابہ نے جو کہا اسے سن کر ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔

”کیا ہوا نازی؟“ رطابہ کی امی اور پھپھو جو ان کے قریب ہی کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات اور لہجے کی پریشانی پر گہرا کر پوچھنے لگیں۔

”عدن سہ پہر کا گھر سے نکلا ہوا ہے ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔ نوشابہ کا پریشانی سے برا حال ہے۔ اس کے گھر میں بھی سارے مہمان موجود ہیں لیکن عدن کی کوئی خبر نہیں اس کا موبائل بھی آف ہے۔“ نازی کی زبان سے نکلے الفاظ بہت سنگین تھے۔ رطابہ کی امی چکرا کر گر پڑیں۔ بیٹی دلہن بنی بیٹھی تھی اور اس کو بیاہ کر لے جانے والا آنے سے پہلے ہی غائب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

”آپ ثناء ہیں؟“ عدن کے غائب ہونے کی اطلاع پر جو کھرام مچا تھا وہ اس سے گہرا کر الگ تھلگ آ بیٹھی تھی باقی لوگ چاہے جو بھی اندازے لگاتے لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کل عدن نے رطابہ اور غنفر کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے کے بعد ہی یہ قدم اٹھایا ہے اور اب وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اس صورت حال کے بارے میں کسی اور کو آگاہ کرے یا نہ کرے ایسے میں ایک اجنبی کے سوال پر حیران رہ گئی۔

”جی میں ثناء ہوں لیکن آپ کون ہیں؟“ اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ

ساتھ قدرے پریشانی بھی تھی۔

”مجھے عدن نے بھیجا ہے، آپ کی تصویر اس نے مجھے دکھائی تھی اور کہا تھا کہ یہ آپ تک پہنچا دوں۔“ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا۔

”عدن بھائی خود کہاں ہیں؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر لفافہ تمام لیا فی الحال کوئی بھی شخص اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

”آپ کو اپنے ہر سوال کا جواب اس سے مل جائے گا بہتر ہے کہ میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ اگر کسی نے میری یہاں آمد کے بارے میں پوچھ لیا تو فضول میں جھوٹے بہانے بنانا پڑیں گے۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا تیزی سے وہاں سے نکل گیا تھا۔
ثناء نے لفافے کو کھولا۔

”ثناء!“

”میرے اس طرح غائب ہو جانے پر یقیناً طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہوں گی لیکن اصل وجہ سے صرف تم واقف ہو۔ کل سے مسلسل سوچ رہا تھا کہ اس مسئلے کا حل کیسے نکالوں اور اب جو میرے ذہن میں آیا میں کر گزرا۔ میں اس وقت خود شدید شک کی حالت میں ہوں اس لیے اس شادی کو ملتوی کروانے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے اس طرح غائب ہونے سے ماما اور ڈیڈی بہت پریشان ہوں گے لیکن میں کیا کرتا؟ سامنے رہ کر اس وقت کوئی بہانہ بنانا مشکل تھا۔ ہماری عزت پر بن آتی اب بس اتنا ہو گا کہ جب میں ہفتہ پندرہ دن میں گھراؤں گا تو کسی حادثے کے بہانے کے ساتھ۔ رطابہ سے کہنا اس عرصے میں اپنی محبت کے حصول کے لیے کچھ کر سکتی ہے تو کر لے میں نے اس سے پہلی نظر میں محبت کی تھی اور شاید آخری سانس تک کرتا رہوں لیکن اس احساس کے ساتھ کہ وہ کسی دوسرے سے محبت کرتی ہے اسے اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتا۔“ ثناء نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کاغذ واپس لفافے میں رکھا وہی کچھ ہوا تھا بس کا اسے اندیشہ تھا لیکن وہ عدن کے مشورے کے مطابق رطابہ سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ رطابہ کے اختیار میں کچھ ہوتا تو یہ نوبت آتی ہی کیوں؟ وہ

مسلل سوچ رہی تھی۔ تب ہی اس کی نظر ٹمرہ پر پڑی۔

”ٹمرہ! تمہارے غنفر بھائی کہاں ہیں۔ کیا وہ یہاں آئے ہیں؟“

”کہاں؟ وہ تو گھر سے بلکہ اپنے کمرے سے بھی باہر نہیں نکلتے جب سے

واپس آئے ہیں چپ چپ سے ہیں۔“ ٹمرہ نے اس کے پوچھنے پر بتایا۔

”مجھے ان سے ملنا ہے ٹمرہ! بہت ضروری۔“ ثناء نے بے چینی سے کہا مگر پھر سامنے کھڑی اماں کو دیکھ کر چپ سی ہو گئی۔ پتہ نہیں کب وہ وہاں آکھڑی ہوئی تھیں۔

”کیا مسئلہ ہے بیٹا! مجھے بتاؤ؟“ گہری نظروں سے ثناء کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے نرمی سے پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ عورت جس کا رطابہ اور غنفر کو جدا کرنے میں بنیادی کردار تھا بھلا اعتبار کے لائق تھی۔

”تم شاید مجھ سے کہنا نہیں چاہتیں۔“ ثناء کو تذبذب میں دیکھ کر انہوں نے اندازہ لگایا اس پل ثناء نے انہیں سب کچھ بتانے کا ارادہ کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا لفافہ ان کی طرف بڑھا دیا۔

”آج اگر رطابہ کی بارات نہیں آئی تو اس میں کچھ نہ کچھ قصور آپ کا بھی ہے۔ اگر آپ اپنی غلطی کی تلافی کرنا چاہیں تو اس سے بہتر موقع کوئی نہیں ہو سکتا۔“ وہ جو سمجھانا چاہ رہی تھی اسے وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھیں۔ زندگی نے انہیں اپنے بیٹے کے لیے خوشیاں حاصل کرنے کا ایک موقع فراہم کر دیا تھا۔ ایسا موقع ہر ایک کو نہیں ملتا اور اگر اب قسمت سے انہیں ملا تھا تو وہ اسے ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ بھابھی؟“

غنی صاحب اماں کی بات پر دنگ رہ گئے تھے۔

”میں وہی کہہ رہی ہوں جو مجھے اس وقت کہنا چاہیے میں پہلے بھی ایک بار آپ سے رطابہ کے لیے بات کر چکی ہوں مگر اس وقت میرا انداز مانگنے والوں جیسا نہیں تھا آج میں اپنی اس غلطی کو مانتی ہوں میرے غنفر کے لیے رطابہ کا ہاتھ دیے دیجئے غنی

بھائی!“

وہ دامن پھیلا کر ان کے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔

”مجھے شرمندہ نہ کریں بھابھی! مگر میں اس طرح کیسے کر سکتا ہوں۔“

خدا خواستہ عدن کے گھر والوں نے بارات لانے سے انکار تو نہیں کر دیا۔ وہ بے چارے تو اپنے بیٹے کی گمشدگی سے پریشان ہیں اور ایسے میں میں رطابہ کا رشتہ کہیں اور کر کے انہیں مزید دکھ کیسے دے سکتا ہوں۔ اللہ جانے عدن کہاں گیا؟ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا؟ اور میں خود غرضی کا مظاہرہ کرتے صرف اپنی بیٹی کا سوچوں یہ میرے ضمیر کو گوارا نہیں۔“

غنی صاحب کا جواب بہت واضح تھا۔

”انکل! پلیز آپ میری بات سنیں۔“ ثناء انہیں لیے ایک کونے میں چلی گئی۔

”صورت حال آپ کے سامنے ہے آپ چاہیں تو غضنفر کے رشتے کے لیے ہاں کہہ کر رطابہ کو عزت سے رخصت کر سکتے ہیں ورنہ دوسری صورت عدن بھائی واضح کر چکے ہیں کہ وہ کسی صورت اس قبول نہیں کریں گے۔“

ثناء نے مختصر اساری تفصیل ان کے گوش گزار کر دی تھی۔ غنی صاحب سمجھ دار آدمی تھے حالات کا رخ جان کر جوش سے کام لینے کے بجائے دور اندیشی سے کام لیا اور غضنفر کے لیے ہاں کہہ دی انکار کی صورت میں وہ معاملہ جو ابھی خوش اسلوبی سے ختم رہا تھا آگے چل کر مزید سنگین ہونے کا اندیشہ تھا ان کے ہاں کہتے ہی اماں ابا اور غضنفر کے بہن بھائیوں کے چہرے پر خوشی کے رنگ اتر آئے آنا فانا وہ گھر کی طرف دوڑے نیند میں ڈوبے غضنفر کو ٹھنڈے پانی کا جگ ڈال کر جگایا گیا۔ احسن نے الماری

سے اس کا استری شدہ سوٹ نکال کر زبردستی اسے پہنایا اماں نے رطابہ سے رشتہ ہونے کی نوید سنائی تو نیند کا زور کچھ ٹوٹا۔ جھومتے جھومتے دولہا کو لے کر چند افراد مشتمل بارات پنڈال میں پہنچی۔ دولہا کی سرخ آنکھوں اور نیند بھگانے کی کوشش پر قاضی صاحب نے کچھ مشکوک نظروں سے اسے دیکھا بھی پھر فوراً ہی نکاح ہو گیا دولہا

صاحب کی غیر ہوتی حالت کے پیش نظر مزید کوئی رسم ادا کیے بغیر قنات رخصتی انجام پا گئی۔ یوں ہنگامی حالات میں گئی بارات حیران پریشان دلہن اور نیند سے بے حال ہوتے دولہا کو لے کر واپس لوٹ آئی۔

☆☆☆

”ہماری شادی کچھ فلمی سی نہیں ہو گئی۔“

اگلے دن وہ اپنے کمرے میں بیٹھا رطابہ سے کہہ رہا تھا۔

”کچھ نہیں بہت زیادہ فلمی ہو گئی اور کیوں نہیں ہوتی آخر آپ جیسے اداکار سے ہو رہی تھی۔“

رطابہ نے جملے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”ادا کار اور میں.....؟“ وہ حیرت سے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
”اور نہیں تو کیا؟ کیا ضرورت پڑی تھی ناکام عاشق کی ایکٹنگ کرنے کے لیے نیند کی گولیاں کھا کر اپنا حشر بگاڑنے کی غضب خدا کا کسی دلہن کے ساتھ پہلی بار ایسا ہوا ہوگا کہ دولہا صاحب رات بھر خرابے لے لے کر سوتے رہے اور بے چاری دلہن احمقوں کی طرح بیٹھی چہرہ نکلتی رہی۔“

”میری سچی محبت کو ایکٹنگ کا نام دے رہی ہوں تمہیں کیا معلوم میرے لیے وہ کتنے اذیت ناک لمحے تھے۔ یہ تصور کہ تم کسی اور کی ہونے جا رہی ہو میرے دماغ کی شریانوں کو پھاڑنے لگتا تھا ایسے میں فرار کے لیے سلیپنگ پلو کا سہارا نہ لیتا تو کیا کرتا شکر کرو کہ میں نے مایوسی میں پوری شیشی نہیں کھالی ورنہ آج بیٹھی میری لاش پر آنسو بہاتی۔“

اس کے جواب پر وہ دلیل کر رہ گئی۔

”اللہ نہ کرے غضنفر!“

”اللہ تو خیر ہمارا بھلا ہی چاہتا ہے جب ہی تو عدن بخاری کو اس روز تمہارے گھر بھیج دیا۔ ویسے وہ واپس اپنے گھر لوٹ آئے میں ایک بار اس کا شکریہ ادا کرنے

ضرور جاؤں گا۔“

اپنے ہونٹوں پر دھڑے رطابہ کے ہاتھ کو چومتے غضنفر نے کہا۔
 ”ویسے عدن نے ایک طرح سے بہت غلط حرکت بھی کی اس کے پیرئس اے۔
 اتنا چاہتے ہیں اگر خدا خواستہ پریشانی میں انہیں کچھ ہو جاتا تو۔“
 ”اسی لیے تو نازی آئی فوراً ہی خودنو شاہہ آئی کے گھر جا کر ان سے اصل بات
 کہہ آئیں۔ رشتہ داروں اور دوستوں کو انہوں نے جس طرح بھی ہینڈل کیا ہو مگر عدن
 کے صحیح سلامت ہونے کی اطلاع سن کر خود ان کے دلوں کو تو تسلی ہو گئی ہوگی۔“
 ”چلو جو بھی ہوا ہمارا کام تو ہو گیا۔“

اس نے ریلیکس ہوتے رطابہ کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔
 ”اے مسٹر! زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ابھی تک آپ نے مجھے نہ
 دکھائی نہیں دی ہے۔“

”وہ بھی دیں گے ذرا پاس تو آؤ۔“
 بھاگتی رطابہ کی صرف چوٹی اس کے ہاتھ میں آسکی۔
 ”اے تو میں پہلی فرصت میں کٹاؤں گی۔“
 وہ تکلیف سے جھنجھلا کر بولی۔
 ”خبردار! کبھی غلطی سے بھی ایسا نہ کرتا۔“

وہ اس کی چٹیا پکڑے پکڑے ہی اس کے قریب آکھڑا ہوا اسی پل دروازہ پر
 دستک ہوئی۔

”غضنفر بیٹا! رطابہ کو لے کر آ جاؤ۔ ناشتے پر سب انتظار کر رہے ہیں۔“
 اماں اسے پکار رہی تھیں۔

”اماں تو لگتا ہے ساری زندگی میرے لیے ولن کا رول ہی پلے کرتی رہیں

گی۔“

وہ اپنے رومانٹک موڈ کے غارت ہونے پر جھنجھلایا رطابہ نے موقع کا فائدہ

اٹھایا اور ہنستے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ جانے سے پہلے وہ اسے ٹھینکا دکھانا نہیں
 بھولی تھی۔ غضنفر اس کے بچکانہ انداز پر مسکرا دیا اور پلٹ کر ٹیبل سے اپنی رسٹ وائچ
 اٹھانے لگا رطابہ کی چوڑیاں بھی وہیں پاس رکھی تھیں ان پر نظر پڑتے ہی اس کا دل خوشی
 کے احساس سے سرشار ہو گیا وہ کمرہ جو کل تک ویران تھا اب وہاں ہر طرف رطابہ کے
 ہونے کا احساس پھیلا ہوا تھا خوشی سے معمور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے وہ بھی باہر نکل
 گیا۔

☆☆☆

ہاموں کے نعرے لگانے والوں سے۔“ وہ اب ایک نئی فکر میں مبتلا تھیں۔

”گھبراہٹیں مت بھابھی! بس ابھی آتا ہی ہوگا۔ لڑکے تو ویسے ہی اس موسم میں موج مستی کرتے پھرتے ہیں۔“ میٹھی لکیوں سے فارغ ہو اب وہ بیسن کے آمیزے کو کڑا ہی میں ڈال کر پکڑے تل رہی تھیں۔

”تم نے بھی اپنے آپ کو بکھیرے میں الجھا لیا ہے۔ کیا ضرورت تھی اتنا اہتمام کرنے کی میں بلاتی ہوں نہ کہ ذرا آکر تمہارا ہاتھ تو بٹائے۔“

آمنہ بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ امریکن اسٹائل کے کچن میں سہولت تھی کچن باقی گھر سے الگ تھلگ نہیں ہوتا سو وہ کتنی دیر سے کام کرتے ہوئے آمنہ بیگم سے باتیں کرنے میں مصروف تھی وہ دونوں دیورانی جھٹانی رہتے تو ایک گھر میں تھے لیکن پورشن الگ الگ ہونے کے علاوہ کچن بھی الگ ہی تھے نیچے کا پورشن آمنہ بیگم اور ان کی فیملی کے لیے اور اوپر کا ٹمرین کے لیے مخصوص تھا۔ آمنہ بیگم پچھلے چند سالوں سے جوڑوں کے درو کی تکلیف میں مبتلا تھیں اس لیے اوپر ذرا کم ہی آتی تھیں لیکن آج بارش شروع ہوتے ہی ٹمرین نے انہیں بھی مدعو کر لیا تھا اس طرح نہا، رامین اور بشری کو تا صرف آزادی سے بارش انجوائے کرنے کا موقع مل گیا تھا بلکہ ساتھ ہی موسم کے پکوان تلنے کی ذمہ داری بھی ٹمرین نے اپنے سر لے لی تھی وہ ایسی ہی تھیں دوسروں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھنے والی اسی لیے سسرال میں ہر دلچزین تھیں۔

”نہا..... رامین..... چلو اب نیچے آ جاؤ، آکر چچی کا ہاتھ بٹاؤ۔ بے چاری کب سے اکیلے لگی ہوئی ہے۔“ چھت کی طرف جاتے زینے پر دو تین اسٹیپ اوپر کھڑی وہ فردا فردا ان سب کو آواز دینے لگیں۔

ٹمرین تلے جانے والے پکڑوں کو کڑا ہی میں سے نکالتے ہوئے مسکرانے لگیں۔ اسے پتہ تھا اب ان سب کو ادھر کا رخ کرنا ہی پڑے گا۔ اچانک ہی ٹیلی فون کی بجتی کھنٹی نے اپنی طرف متوجہ کیا وہ چوہے کی آنچ بلی کرتی ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئیں۔

میرے مقدر کا چاند

دو گھنٹے سے مسلسل برسی بارش کا زور اب ٹوٹنے لگا تھا اور بارش نے ہلکی پھورا کی شکل اختیار کر لی تھی۔

”دیکھ رہی ہو ٹمرین! ان لڑکیوں کو۔ پہلی بوند کے ساتھ چھت پر چڑھی تھیں اور لگتا ہے جب تک بادل آخری قطرہ بھی نہ برسا دے گا تب تک یہ نیچے نہیں اتریں گی۔“ آمنہ بیگم نے کم ہوتی بارش کا کھڑکی کے شیشوں سے جائزہ لیتے ہوئے اپنی دیوارانی سے شکوہ کیا۔

”جانے دیں بھابھی! کراچی والوں کو اتنا ترسنے کے بعد تو یہ دن دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے میں خود بھی ایسی ہی دیوانی ہوتی تھی۔ اب تو بچوں کی خاطر دل پر جبر کرنا پڑتا ہے اور اکثر خالی غولی بارش کی آواز اور کھڑکی سے نظارہ کر کے ہی گزارا کر لیتی ہوں۔“

ٹمرین کا چھوٹا بیٹا جو ابھی صرف چار سال کا تھا سانس کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ ٹھنڈک اس مرض کو مزید بڑھانے کا سبب بنتی تھی، سو بیٹے کو بچانے کی خاطر وہ خود بھی دل پر جبر کرنے پر مجبور تھیں۔

”ارسلان بھی ابھی تک یونیورسٹی سے واپس نہیں آیا۔ پتہ نہیں اس بارش میں کہاں پھنسا ہوا ہوگا۔ یہاں تو سڑکوں کا حال بھی اتنا خراب ہے کہ اللہ ہی سمجھ ترقیاتی

جاتی نہیہا کے قدم بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔

”ارسلان بھائی آگئے۔“ ڈور بیل کی آواز سن کر راین باہر کی طرف دوڑی۔ اس وقت وہ سب لوگ نیچے کے پورشن میں بیٹھے ارسلان کا ہی انتظار کر رہے تھے۔

”تم فکر نہ کرنا نہیہا! میری دانیال سے ان کے موبائل پر بات ہوئی ہے۔ وہ اور بھائی صاحب ہاسپٹل پہنچ چکے ہیں۔ کاشان اب ہوش میں آچکا ہے۔“ اندر کمرے میں چپ چاپ بیٹھی نہیہا کو تسلی دینے کا فریضہ ٹمرین گاہے گاہے انجام دے رہی تھیں اس کی خاموشی کے باوجود ٹمرین اس کی اندرونی کیفیت سے اچھی طرح واقف تھیں۔

”چلو باہر چلتے ہیں میرا خیال ہے ارسلان آگیا ہے۔“ آوازوں سے اندازہ لگاتے ہوئے وہ اسے لے کر باہر نکلیں۔

”پتہ ہے مجھے سب کچھ میں بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔ جہاں تمہارے کاشان بھائی گل کھلاتے پھرتے ہیں۔“ جلدی جلدی تفصیلات بتانے کی کوشش کرتی راین کو ٹوک کر وہ بد اخلاقی سے بولا۔

”آخر ہوا کیا تھا، کچھ تو بتاؤ ہمیں بھی؟“ ٹمرین نے پوچھا۔

”ہونا کیا ہے، تھا کسی لڑکی کا چکر۔ ماننے والی پارٹی اس سے بڑھ کر بد معاش نکل۔ بس آگئے موصوف پہاڑ تلے۔ جیسی اس کی حرکتیں ہیں اس کے ساتھ یہی کچھ ہونا تھا۔“ ارسلان حسب معمول کاشان سے جلا ہوا تھا۔

”ابھی جانے دو یہ باتیں پہلے ہمیں ہاسپٹل لے چلو۔ بچے کی خیریت تو معلوم کریں جا کر۔“ آمنہ بیگم نے اسے ٹوکا۔

”ٹھیک ہے وہ ابھی ہاسپٹل سے ہی آرہا ہوں۔“

”تو تم گئے تھے ہاسپٹل؟“ ٹمرین کو حیرت ہوئی۔

”لازمی بات ہے سارے لوگ جانتے ہیں کہ ہم دونوں کزنز ہیں۔ جب مجھے پتہ چلا تو میں غیر بن کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا جانا پڑا اس کے ساتھ ہی ہاسپٹل۔“ ارسلان نے منہ بتاتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے ٹمرین! ایسے کیوں کھڑی ہو۔ ابھی فون کی بیل بجنے کی آواز آئی تھی کس کا فون تھا؟“ آمنہ بیگم واپس پلٹ کر آئیں تو ٹمرین کو ٹیلی فون اسٹینڈ کے پاس ساکت کھڑا دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔

ٹمرین کی پریشان نگاہ ان پر سے ہوتی ہوئی پیچھے کھڑے اپنے چھ سالہ بیٹے فرجاد بشری اور راین پر گئی اور پھر آخر میں کھڑی نہیہا کے چہرے پر جا ٹھہری آمنہ بیگم کے سوالات ان کی آنکھوں میں بھی رقم تھے۔

”بڑی آپا کا فون تھا بھابھی! کاشان کا یونیورسٹی میں کچھ لڑکوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ بات کافی زیادہ بڑھ گئی ان لڑکوں میں سے کسی نے گولی چلا دی۔ کاشان کے بازو میں گولی لگی ہے فی الحال وہ بے ہوش ہے اور ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔“ بالآخر ٹمرین کو بتانا ہی پڑا۔

”یا میرے اللہ.....!“ آمنہ بیگم یکدم ہی قریبی کرسی پر ڈھسے گئیں لیکن ٹمرین کی نظر ان سے زیادہ اس پر تھی چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ جیسے کسی نے ایک پل میں اس کی رگوں میں بہتا سارا لہو نچوڑ ڈالا ہو۔

”اب بتاؤ کیا کریں اس وقت تو گھر میں کوئی مرد بھی نہیں ہے اس خراب موسم میں ہم دونوں عورتیں تنہا تو ہاسپٹل بھی جاسکتیں۔“ آمنہ بیگم سخت پریشان تھیں۔

”آپ فکر نہ کریں بھابھی! میں دانیال کو فون کرتی ہوں۔ وہ بھائی صاحب کو لے کر آفس سے ہی ہاسپٹل پہنچ جائے گے۔ کم از کم آپا کو حوصلہ تو ہو گا پھر ارسلان آجائے تو ہم لوگ بھی اس کے ساتھ چلتے ہیں۔“ ٹمرین نے خود کو سنبھالتے ہوئے صورت حال کو ہینڈل کرنا شروع کر دیا۔

”راین، بشری! تم نیچے جا کر کپڑے چھینچ کر دو اور نہیہا! تمہارا ایک سوٹ یہیں اوپر رکھا ہوا ہے تم خود چھینچ کر کے فرجاد کو بھی چھینچ کر دو۔“ رے سیور ہاتھ میں لے کر نمبر ڈائل کرتے اس نے ہدایت کی تو ساکت کھڑے وجودوں میں حرکت پیدا ہوئی۔

دانیال سے بات کرتے ہوئے ٹمرین نے دیکھا بچوں کے کمرے کی طرف

”اچھا..... لیکن اب ہم لوگوں کو بھی تو لے چلو۔ اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر؟
چین نہیں آئے گا۔“ ثمرین نے اصرار کیا۔

”ایک تو آپ لوگ بھی..... اپنی بات منوائے بغیر تو رہیں گے نہیں۔ چلیں۔“
وہ چارونا چار راضی ہو ہی گیا۔

بھیگا ہوا موسم پیارا

بھلا کیسے بھولے دل وہ نظارا

بھیگا ہوا موسم پیارا

سر جھکا کر چلتی لڑکی کے ساتھ ایک گاڑی آہستگی سے رینگ رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھے لڑکوں کا گروپ سرملا کر بار بار گانے کے بول دہرا رہا تھا۔

بائیک پر پیچھے سے آتا کاشان اس منظر پر ٹھنک گیا۔ وہ لوگ اس وقت یونیورسٹی کے سامنے روڈ پر ہی تھے۔ لڑکی کو پہچاننے میں اسے کوئی وقت نہیں ہوئی۔ وہ ان ہی کے ڈپارٹمنٹ کی لڑکی تھی جسے کبھی اوٹ پناہ حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا تھا اس وقت بارش کے باعث بھگ جانے والے کپڑوں اور چادر کی وجہ سے وہ یقیناً پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی اس پر مستزاد ان آوارہ لڑکوں کا پیچھا کرنا اسے خوفزدہ کر رہا تھا۔

غصہ کی شدید لہر کاشان کے وجود میں دوڑی اور وہ بائیک ان لوگوں کی گاڑی کے سامنے لے آیا۔

”کیا پراہلم ہے مسٹر!“ گاڑی ڈرامیو کرتے لڑکے نے گاڑی روک کر پوچھا۔

”یہی سوال میں آپ لوگوں سے کرنا چاہتا ہوں۔“

ان لوگوں کو گھورتے ہوئے اس نے غصے سے کہا اور پھر پلٹ کر خوفزدہ کھڑی لڑکی سے مخاطب ہوا۔

”رابعہ! آپ جائیے میں ان لوگوں کو دیکھ لوں گا۔“

”ارے بھئی ہیرو ہے، اپنی ہیروئن کی خاطر سین میں انٹری دی ہے۔ چلو دیکھتے ہیں کتنا دم خم ہے اپنے ہیرو میں۔“ وہ لڑکے رابعہ کو بھول کر کاشان کی طرف متوجہ ہو گئے

تھے، انہیں تو یوں بھی کوئی شغل ہی چاہیے تھا۔ لہذا فوراً ہی گاڑی سے اتر آئے۔

”میرا مقصد آپ لوگوں سے لڑنا جھگڑنا نہیں بلکہ آپ کو ایک غلط کام سے روکنا تھا اور میرے خیال میں آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔“ کاشان نے ایک دین میں سوار ہوتی رابعہ کی طرف دیکھتے ہوئے اطمینان سے کہا،

”ارے واہ بھئی، یہ ہیرو تو بڑا ہوشیار ہے۔ ہیروئن کو بھی بچا نکالا اور ہاتھ پیر

بھی چلانے کو تیار نہیں لیکن بچہ! ایسا ہوتا نہیں ہے فائنٹ تو اس سین کی سب سے بڑی

ڈیمانڈ ہے۔“ کہتے کے ساتھ ہی ایک لڑکے نے کاشان کے منہ پر مکا دے مارا۔ اب

ہاتھ پیر باندھ کر کھڑے رہنے کا موقع نہیں تھا۔ سو کاشان نے بھی ان سے دو دو ہاتھ

کرنے کا فیصلہ کیا اس موقع پر اس کی پاؤں بلڈنگ کی مشقیں اور سیلف ڈیفنس کی

ٹریننگ خوب کام آئی۔ وہ لوگ تین تین ہونے کے باوجود اسے قابو نہیں کر پارہے تھے

چوہن کو اپنے حق میں نہ پا کر ان میں سے ایک لڑکا مڑا اور گاڑی میں رکھا اپنا ریوالور

نکال کر کاشان پر گولی چلا دی ارد گرد تماشا دیکھنے کی غرض سے جمع ہونے والے لوگ ابھی

صورت حال کو سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ وہ تینوں لڑکے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے فرار

ہو گئے۔

پولیس اور ایمبولنس کے موقع پر پہنچنے تک ارسلان کو بھی سارے ہنگامے کی خبر

ہو گئی تھی۔ کاشان سے ہزار اختلاف کے باوجود اس وقت نے اس کے ساتھ اپنا رشتہ

نبھایا تھا۔

☆☆☆

”آپ اور بھائی جان گھر جائیے آپا۔ میں اور نیہا ہیں یہاں۔ سنبھال لین

گے ہم آپ کے نالائق بیٹے کو۔ آپ دونوں کچھ دیر گھر جا کر آرام کر لیں پھر فریش ہو کر

یہاں واپس آجائیے گا۔“ دوسرا دن تھا کاشان کو ہسپتال میں ایڈمٹ ہوئے۔ آمنہ بیگم

اپنے جوڑوں کے درد کی وجہ سے روز روز ہسپتال کا چکر نہیں لگا سکتی تھیں اس لیے آج

ثمرین یہاں سے نیہا کو اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔

”دل نہیں مانتا اسے اس حال میں چھوڑ کر جانے کو۔“ انہوں نے انکار کرنا چاہا۔

”ممی پلیز! ماما ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آپ لوگ تھوڑی دیر کے لیے گھر چلے جائیں۔ جب تک یہ میرا خیال رکھ لیں گے۔ ویسے بھی دیکھیں ان کی صورت دیکھتے ہی مجھے کتنا افاقہ ہوا ہے۔“ وہ بظاہر شمرین کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اصل ہدف ان کے پیچھے کھڑی نیہا تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے ہم دو تین گھنٹے کے لیے گھر کا چکر لگا آتے ہیں۔“ ناصر احمد نے ہامی بھرتے ہوئے بیگم کی طرف دیکھا انہوں نے بھی رضا مندی دے دی۔

”بے شک آپ شام تک آجائیں بھائی جان! میرے دونوں بچے تو فی الحال اسکول گئے ہوئے ہیں اور واپس آنے کے بعد بھی راجین اور بشری انہیں دیکھ لیں گی اس لیے میں پوری بے فکری سے یہاں رہ سکتی ہوں۔“

شمرین نے خلوص سے کہا تو وہ لوگ مسکراتے ہوئے اطمینان سے وہاں سے روانہ ہو گئے۔

”ہاں تو برخوردار! ہمیں دیکھنے سے آپ کو افاقہ ہوتا ہے۔“ شمرین نند نندوئی کے باہر نکلتے ہی اس کے کان کھینچنے لگیں۔

”ارے میرے کان کوئی ہے جو بچائے یہ خاتون بڑی ہی دھوکہ باز ثابت ہوئیں۔ ابھی میری ماں کے سامنے کسی سویٹ بنی ہوئی تھیں اور ان کے جاتے ہی تشدد پر اتر آئیں۔ نیہا! تم ہی کچھ کرو میں بیمار اور مجبور آدمی کیسے ان ظالم حسینہ کا مقابلہ کروں گا۔“

”مجھے تو آپ بالکل بیمار نہیں لگ رہے۔ خواخواہ کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔“ اس کے واویلے کے جواب میں نیہا نے بے نیازی سے کہا۔

”دیکھ رہی ہیں ماما!

ان کو دیکھ کر جو آگئی ہے چہرے پر رونق یہ سمجھ رہی ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے شعر کو اپنے حسب مرضی ڈھال کر وہ گنگٹایا۔

”چچی! یہ جو سوپ لائے ہیں ہم لوگ اپنے ساتھ میں باؤل میں نکال دیجی ہوں۔ آپ موصوف کو پلا دیجئے گا کم از کم اسی بہانے کچھ دیر زبان تو بند رہے گی۔“ وہ مزے سے کہہ کر سوپ نکالنے لگی۔

یارب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات

دے ان کو دل اور جو نہ دے مجھ کو زباں اور

شمرین کے سہارے سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے وہ اس کے ہاتھ سے سوپ کا پیالہ لیتے ہوئے بولا۔

”برخوردار! ذرا خیال سے ہم یعنی کہ آپ لوگوں کے ایک عدد بزرگوار بھی اس وقت آپ لوگوں کے درمیان موجود ہیں۔“ شمرین شرارت سے کھنکھارتے ہوئے بولیں۔

”ماما یار! آپ تو اپنی دوست ہیں بزرگ کسی اور کی بن جائیے گا۔ ویسے بھی یہ تو آپ کا کارنامہ ہے کہ یہ محترمہ ہمارا احوال پوچھنے یہاں تک چلی آئی ہیں۔ ورنہ ان کی بے نیازی اور خاموشی سے تو لگتا ہے ہماری میت پر چار آنسو بہانے کے لیے بھی پہلے سو بار سوچیں گی کہ کہیں لوگوں میں ان کا ایجنڈا خراب نہ ہو جائے کہیں کوئی ان پر ہم جیسے برے شخص کی محبت کا الزام نہ دھر دے۔“ وہ طعنہ زنی کر رہا تھا نیہا کی آنکھوں سے یکدم ہی بہت سے آنسو چھلک پڑے وہ سوپ کا پیالہ اس کے سامنے رکھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

”بہت بدتمیز ہو تم! بے چاری کو رلا دیا۔“ شمرین نے کا شان کو گھورا۔

”اور وہ بے چاری جو مجھے اتنا ستاتی ہے وہ کچھ نہیں عرصے سے حسرت ہے کہ کبھی کوئی مہکتا ہوا جملہ سننے کو ملے لیکن وہاں تو بس گریز ہے اور اب ذرا کچھ کہہ دیا تو

آنسو بہانے بیٹھ گئیں۔“ وہ شکوہ کرنے لگا۔

”تمہیں ان سچے موتیوں سے بھی قیمتی آنسوؤں سے بڑھ کر کسی اظہار کی ضرورت ہے کا شان! لڑکیوں کا اظہار محبت تو بس ایسا ہی ہوا کرتا ہے گریز کی آڑ میں احتیاط کا دامن تھامے ہوئے اور پھر تم نے اسے ایسا کون سا رشتہ کا مان دے رکھا ہے جس کے آسرے پر وہ کھل کر اپنی چاہت کو ظاہر کر سکے۔ اچھی لڑکیاں اپنے جذبات کا اظہار بغیر کسی واضح رشتے کے نہیں کیا کرتیں۔“ ثمرین کی باتوں نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆☆☆

”کیا.....؟ پاپا نے اتنا بڑا فیصلہ مجھ سے مشورہ لیے بغیر کر دیا میں ان کی بڑی اولاد ہوں کیا ان کے نزدیک میری کوئی حیثیت نہیں۔“ آمنہ بیگم کی زبانی نیہا کے لیے کا شان کے رشتہ پر باپ کی ہاں سن کر ارسلان شدید صدمے سے دوچار تھا۔

”بیٹا! اپنوں میں رشتہ کرنے کے لیے کب کسی صلاح مشورے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑی آپا نے تمہاری چھوٹی پھپھی وانیال اور ثمرین کے سامنے رشتے کی بات ہمارے سامنے رکھی تھی سب لوگ خوشی کا اظہار کرنے لگے ہمارے پاس بھی کوئی انکار کا جواز نہیں تھا مگر کا دیکھا بھالا پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ تمہارے پھپھا پھپھی سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ اپنی نیہا کو چاہت سے رکھیں گے پھر ہم کس لیے انکار کرتے غیروں میں لڑکی دینے بیٹھیں گے تو دیکھ بھال کرنا پڑے گی۔“ آمنہ بیگم رسان سے اسے سمجھا رہی تھیں۔

”آپ کو کا شان میں کوئی عیب دکھائی نہیں دیتا۔ وہ جو پچھلے دنوں اتنا بڑا مسئلہ کھڑا ہوا تھا! اسے بھول گئے آپ لوگ۔“ وہ جھنجھلائے لگا۔

”تو بہ ہے تم سے بھی ارسلان! کتنا کھل کھلا کر تو آگئی تھی وہ بات سب کے سامنے اس لڑکی راجہ نے اپنے باپ کے ساتھ آکر ساری بات ہاسٹل میں بتائی تھی اس بچی کی عزت کی خاطر ہی تو تمہارے پھپھا اور کا شان نے پولیس والوں کو بھی مزید کارروائی سے روک دیا تھا اور تم ہو کہ ابھی تک وہی قصہ لیے بیٹھے ہو۔“ آمنہ بیگم نے

ماٹھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”آپ کچھ بھی کہیں میں کا شان کے ڈراموں سے متاثر ہونے والا نہیں۔ میرے دل میں اس شخص کے لیے رتی برابر بھی جگہ نہیں اور اسے بہن دینے کا مطلب ہے مجھے اس عزت بھی کرنا پڑے گی۔“ وہ اپنی بات کہہ کر پیر بیٹھتے ہوئے باہر نکل گیا۔

آمنہ بیگم سر پکڑ کر اپنی جگہ بیٹھی رہ گئیں۔ بچپن کا حسد جوانی کی عمر کو پہنچ کر کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ بڑی آپا کے گھر شادی کے پانچ سال بعد کا شان کی پیدائش ہوئی تھی ارسلان اس سے فقط دو ماہ ہی چھوٹا تھا۔ بڑی آپا کو یوں بھی سب بہن بھائی بہت چاہتے تھے۔ اس پر اتنے عرصے بعد اولاد کی خوشی ملی تو سب نے ہی ان کے بچے کو غیر معمولی اہمیت دی۔ پھر کا شان تھا بھی بڑا پیارا اور ذہین بچہ سو دن بدن اس کی محبت میں اضافہ ہوتا رہا اور ارسلان جو اس کا ہم عمر تھا قدرے نظر انداز ہوتا گیا۔

بڑوں کی اس معمولی لاپرواہی نے ارسلان کی سائیکس میں اتنی بڑی خرابی پیدا کر دی کہ وہ بچپن کے اس حسد کو اپنے دل سے نکال ہی نہیں پایا اور اب قدم قدم پر یہ حسد اسے ڈسنے لگا تھا کوئی اور اس بات کی حقیقت کو سمجھتا یا نہیں، آمنہ بیگم ماں تھیں ان سے ارسلان کی ذات کا یہ دکھ چھپا نہیں رہ سکا تھا۔

☆☆☆

نیہا نے ڈور بیل کی آواز پر بچن کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو حسب توقع بڑی پھپھو پھپھا جان اور کا شان کی صورتیں نظر آئیں۔ صبح پھپھو نے ٹیلی فون پر اپنی آید کی اطلاع دے دی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا تھا کہ چھوٹی پھپھو کا بھی ارادہ ہے آنے کا اس لیے نیہا رامین کو ساتھ لگائے رات کے کھانے کے لیے خصوصی اہتمام میں مصروف تھی۔

”یہ کا شان بھائی کے ہاتھ میں مٹھائی کا ٹوکرا کس خوشی میں دکھائی دے رہا ہے۔“ رامین کے کہنے پر اس نے توجہ دی تو نا صرف کا شان کے ہاتھوں میں مٹھائی کا ٹوکرا دکھائی دیا بلکہ پھپھو اور پھپھا بھی خاصے لدے پھندے دکھائی دیے۔

”گلتا ہے پھپھو! آج باقاعدہ آپ کی ”بگ“ کروانے تشریف لائی ہیں۔“
 رامین نے اندازہ لگایا۔

”تم اندازے لگانا چھوڑو جلدی جلدی یہ بادام پتے کاٹ کر دو پھر سلاڈ کے لیے سبزیاں بھی تم نے ہی کاٹنا ہیں۔“ اپنے دھک دھک کرتے دل کو سنبھال کر وہ ایک بار پھر چولہے کی طرف متوجہ ہو گئی ارسلان کی کا شان کے رشتے پر ناپسندیدگی اس کے علم میں آچکی تھی اور پھپھو کو اس قدر تیاری کے ساتھ آتے دیکھ کر اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی اگر ارسلان اس وقت اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا تو کافی بد مزگی پھیلنے کا خدشہ تھا۔

”لوگ کس قدر چالاک ہوئے ہیں چپکے چپکے مگنی طے کر ڈالی اور ہمیں خبر بھی نہیں۔“ اگلے چند منٹوں میں ثمرین کچن میں کھڑی اس کی کلاس لے رہی تھیں۔

”قسم سے چچی! ایسی کوئی بات نہیں پھپھو نے صرف ملنے آنے کا ذکر کیا تھا اس سارے سلسلے کی تو کوئی خبر ہی نہیں تھی ہم لوگوں کو۔“ نیہا روہانسی ہو کر صفائیاں پیش کرنے لگی۔

”ہوں بڑی آنکھیں خبر نہیں تھی سرالیوں کی خاطر مدارت کے لیے یہ بڑے بڑے دیکھے چڑھا کر بیٹھی ہیں۔ بریانی کو فٹے تیار کیے جا رہے ہیں اور دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہیں۔“ ثمرین چمک کر بولی۔

”اب آپ بھی ایسی باتیں کیا کریں گی؟“ آنسو آنکھوں سے ٹپکنے کو بالکل تیار تھے۔

”او خدا کے لیے بی بی! رونا مت شروع کر دینا میں صرف مذاق کر رہی تھی۔ ابھی یہ بتاؤ کہ کام کتنا باقی ہے آپا کے سر پر اترنے تو گڑ بڑا کر رکھ دیا ہے بھلا بتاؤ جس کی مگنی ہے وہی چولہوں کے آگے کھڑی پسینے بہا رہی ہے تیاری دیاری بھی تو کرنی ہوتی ہے۔ لہن کو کچھ پتا نہیں۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے خود ہی آگے بڑھ کر پتیلیوں کا جائزہ لینے لگیں۔

”ٹھیک ہے کافی کچھ تو کر لیا ہے تم نے باقی میں اور رامین مل کر دیکھ لیں گے

تم ایسا کرو جب تک اوپر والے پورشن میں جا کر ہاتھ لے لو میں ٹھوڑی دیر میں آکر تمہاری تیاری کرواتی ہوں۔“ ہاتھ پکڑ کر اسے باہر نکالتے ہوئے ثمرین نے ہدایت دی۔
 ”یعنی تو تیار ہی ہے۔ چاول میں نے بھگو دیے ہیں تم سلاڈ رائیڈ تیار کر کے خود بھی جو تیاریاں وغیرہ کرنی ہے کر لو۔ میں نیہا کو تیار کر کے آنے بعد یعنی میں چاول ڈال کر بریانی دم دے دوں گی۔

پھرتی سے کام سمیٹ کر وہ رامین سے کہتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

”تم ست لڑکی! نہا چکی تھیں تو یہ نہیں کہ ڈھائیر سے بال خشک کر لیتیں لیکن نا بھی یہ تو دلہنیا ہیں یہ کیوں ہاتھ پیر چلانے لگیں۔“ اپنے پورشن میں پہنچ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی نیہا کو دیکھ کر انہیں غصہ آ گیا۔

”مجھے کوئی شوق نہیں ہے لہن لہن بننے کا ہاتھ بھی اس لیے لیا ہے کہ کچن سے نکلنے کی وجہ سے بہت گرمی لگ رہی تھی۔“

”اچھا بس تم اپنی بے نیازی کے یہ مظاہرے کا شان کے سامنے ہی کیا کرو۔ آٹھ سال ہو گئے ہیں میری شادی کو اسکول میں پڑھتی تھیں تم اس وقت ایک ایک ادا سے واقف ہوں میں تمہاری دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں اور اوپر سے سنجیدہ بنی بیٹھی ہیں۔“ ثمرین نے اسے لتاڑا۔

”ج چچی! مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“ وہ یکدم ہی ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

”پاگل ہو گئی ہو نیہا! خوشی کے موقع پر یہ آنسو کیسے تم تو خوش قسمت ہو کہ جس شخص نے اوائل عمر سے بار بار تمہیں اپنی چاہت کا احساس دلایا آج وہ اس احساس کو حقیقت کا روپ دینے جا رہا ہے۔“ وہ اس کی پشت سہلاتے ہوئے سمجھانے لگیں۔

”ارسلان بھائی..... چچی آپ کو نہیں پتہ ارسلان بھائی کتنے ناخوش ہیں اسے شتے پر۔“ اس نے اپنی پریشانی انہیں بتائی۔

”ارسلان کی فکر تم چھوڑ دو بڑوں کے فیصلے کے سامنے اس کی ضد نہیں چل

سکتی۔“

اسے ڈرینگ ٹیبل کے سامنے بٹھا کر وہ ڈرائیور کی مدد سے اس کے بال خشک کرنے لگیں۔ ساتھ ساتھ سمجھانے کا فریضہ بھی انجام دیا جا رہا تھا۔
 ”آپ کی پسند بڑی لا جواب ہے۔ بہو بھی جن کر پسند کی ہے اور اس کے لیے چیزیں بھی چھانٹ کر ایک سے ایک لا جواب لائی ہیں۔“ آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد پھپھو کے لائے ہوئے جوڑے اور میچنگ جیولری سے سچی نیہا کو دیکھ کر شمرین بے ساختہ ہی بول اٹھیں۔

”مداخلت کے لیے معافی چاہتا ہوں لیکن می کے لیے بہو اور بہو کے لیے چیزوں کا انتخاب دراصل اس ناچیز کا کمال ہے جس کا کریڈٹ میں ہرگز کسی کو نہ ملے دوں گا۔“ اچانک ہی اسامہ کو گود میں اٹھائے کا شان کمرے میں داخل ہوا۔
 ”اے، تمہیں کس نے اجازت دی جو بے تحشے ٹیل کی طرح منہ اٹھائے یہاں گھس آئے ہو۔“ نیہا کو اپنی آڑ میں چھپاتے ہوئے شمرین نے اسے ڈنپا۔
 ”آپ کے شوہر نامدار نے بھیجا ہے مجھے فرماتے ہیں خدمت خلق سے کما فرصت ملے تو کچھ وقت اپنی ناہنجار اولاد کو بھی دے دیں۔ ویسے بھی آپ اپنے حصے کام کر چکیں باقی آگے کا کام میرا ہے۔“ شمرین کے شور مچانے کی پروا نہ کرتے ہوئے اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کن خیالوں میں ہو میاں! اگر سمجھ رہے ہو کہ نیہا کو انگوٹھی پہنانے کا آپ بہ نفس نفیس خود انجام دے سکیں گے تو یہ شخص آپ کی خوش فہمی ہے ابھی ہماری اتنی ماڈرن نہیں ہوئی لہذا یہ فریضہ تو آپ کی اماں جان کے ہاتھوں ہی انجام پائے گا شمرین نے اسے چھیڑا۔

”کیا دشمنوں پر نمک پاشی کی ہے دوست! ہم تو آئے تھے کہ کچھ آپ ہماری سفارش کر دیں گی لیکن اب جانا کہ آپ بھی ظالم سماج کے ساتھ ہیں۔“ وہ انہما بھرے لہجے میں بولا۔

”خبردار! جو مجھے دوست کہہ کر پکارا۔ مٹھائی کا ٹوکرا تھا مے اماں ابا کے ساتھ انگوٹھی پہنانے آئی اور مجھے خبر تک نہ دی۔ ارے کچھ نہیں تو تمہاری دلہنیا کو کچن کی شفقت سے ہی بچا لیتی۔“ شمرین کو اچانک ہی اس کی بے وفائی یاد آئی۔
 ”بس یہی تو ڈر تھا پیاری ماما! آپ کے ہاتھ کا کھانا کھا کر عین اپنی مٹھنی والے دن ہی مرحوم و مغفور ہونا مجھے گوارا نہ تھا۔ سو یہ سرپرائز کا ڈھونگ رچانا پڑا۔“ کاشان نے انہیں چھیڑا۔

”اچھا یہ بات ہے بیٹا! تو چلو نکلو یہاں سے بذائقہ کھانے پکائے والی ماما کی بد مزاجی بھی آج بلا حلقہ کر لو اب کرتی ہوں میں تمہارا یہ ارمان پورا۔“ شمرین دھکے دے دے کر اس کو باہر نکالنے لگیں۔

”معاف کر دیں پیاری امی! آئندہ آپ کی شان میں گستاخی نہیں کروں گا میری توبہ جو کبھی آئندہ آپ کے پکائے کھانے کی برائی کی بلکہ میں تو می سے کہہ دوں گا کہ میرے ویسے پر جو کچھ کچے اور جو بھی پکائے لیکن اس میں آپ کے مبارک ہاتھوں سے کفگیر ضرور چلویا جائے۔ آپ کا تو صرف ہاتھ لگنا ہی کھانے کے ذائقہ کو چار چاند لگا دے گا۔“ وہ دہائیاں دیتا رہا لیکن شمرین نے اسے باہر نکال کر ہی دم لیا۔ نیہا جس کا دم اتنی دیر سے خشک ہوا جا رہا تھا اب کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

☆☆☆

وہ رضا کے گھر سے نکل کر بہت آہستہ اسپید میں گاڑی چلاتا اس گنجان آبادی والے علاقے کی گلیوں سے گزر رہا تھا کہ اچانک ہی کچھ فاصلے پر لڑکھڑا کر گرتے بڑے میاں کو دیکھ کر اس کے قدم خود بخود ہی بریک پر جا پڑے۔
 دو پہر کا وقت ہونے کی وجہ سے گلیاں سناں پڑی تھیں۔

”بے چارے بے ہوش ہو گئے ہیں شاید۔“ گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکل آیا۔

”ارے یہ تو رابعہ کے بابا ہیں۔“ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر انہیں سیدھا کرنے کی

”بھائی تو میرا بہت چھوٹا ہے، آپ مجھے ایڈریس سمجھا دیں میں خود وہاں چلی جاؤں گی۔“

”اوہ!“ وہ ہونٹ سیکڑ کر رہ گیا۔ رابعہ کی والدہ کا پچھلے سال ہی انتقال ہوا تھا یہ بات تو وہ کلاس فیلو ہونے کی وجہ سے جانتا ہی تھا۔

”ٹھیک ہے پھر آپ آجائیں میرے ساتھ میں خود آپ کو کلینک تک پہنچا دیتا ہوں۔“ کاشان نے آفر کی تو وہ فوراً ہی اندر جا کر اپنی چادر اوڑھ آئی۔

”آج گاڑی لے کر نکلتا سو دمنہ ثابت ہوا۔ اگر بائیک پر ہوتا تو بڑی پریشانی ہوتی۔“ وہ کلینک کی طرف جانے والے راستوں پر گاڑی دوڑاتا یوں ہی اس کا دھیان لانے کے لیے باتیں کرنے لگا۔

”بابا کی طبیعت بہت زیادہ خراب تو نہیں ہے نا؟“ اس کی بات پر تبصرہ کیے بغیر وہ اپنی پریشانی میں گھری پوچھنے لگی۔

کاشان نے ایک نظر اس کے پریشان چہرے پر ڈالی۔

”ریلیکس رابعہ! میں نے آپ کو بتایا نا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ شاید گرمی کی وجہ سے آپ کے والد کا پی پی لو ہو گیا تھا اور وہ چکا کر گر گئے۔ میری ڈاکٹر سے بات ہوئی تھی ان کی حالت بالکل ٹھیک ہے میں تو صرف اس خیال سے کہ کہیں آپ لوگ ان کی طویل غیر حاضری پر پریشان نہ ہو جائیں آپ کو اطلاع دینے آ گیا ورنہ پریشانی کی بالکل بھی کوئی بات نہیں۔“ وہ اسے تسلیاں دینے لگا۔

”امی کی ڈیڑھ کے بعد ہم لوگ بہت خوف زدہ رہنے لگے ہیں ہم چاروں بہنوں کے لیے بابا کا سایہ ہی سب کچھ ہے بھائی تو ابھی صرف آٹھویں کلاس میں پڑھتا ہے۔ اپنے آپ کو بھی نہیں سنبھال سکتا ہم بہنوں کو کیا تحفظ دے گا۔“ آج پہلی بار رابعہ نے اعلیٰ تحصیل سے اپنے بارے میں بتایا۔

”آپ کے والد ثمن آباد کسی سے ملنے گئے تھے کیا؟“ اس نے یونہی اس کا

کوشش کی تو شکل سامنے آنے پر وہ چونک اٹھا۔ اسی بل اس کی نگاہ ان کی کپٹنی سے بڑ خون کی لکیر پر پڑی۔ یقیناً وہاں کسی پتھر پر گرنے کے باعث چوٹ آگئی تھی۔

ان کے دبلے پتلے ضعیف وجود کو بازوؤں میں بھر کر اس نے گاڑی کی پچھل سیٹ پر منتقل کیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ علاقہ کچھ زیادہ دیکھا بھالا نہیں تھا اس لیے اس نے گاڑی مین روڈ کی طرف ڈال دی چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مین روڈ پر اصفہانی میڈیکل کے نام سے ایک پرائیوٹ کلینک نظر آیا تو وہ انہیں وہیں لے گیا۔

”بی بی کافی لو ہے ان کا ہم نے سر کے زخم کی بینڈج کر کے انہیں ڈرپ ڈی دی ہے۔ ویسے تو کوئی بہت زیادہ تشویش کی بات نہیں لیکن مکمل ہوش میں آنے تک انہیں یہاں انڈر آبزرویشن رکھیں گے۔“ ایک نرس نے آکر اسے اطلاع فراہم کی۔

”مجھے ان کے گھر والوں کو انفارم کرنا چاہیے ہو سکتا ہے وہ لوگ پریشان رہے ہوں۔“ دل ہی دل میں سوچتا وہ رابعہ کے والد کی نزدیک جا پہنچا اور ان کی جیب سے والٹ نکال کر اس کا جائزہ لینے لگا جلدی ہی اسے ان کا شناختی کارڈ مل گیا شناختی کارڈ پر موجود ایڈریس کو دیکھنے پر اسے اندازہ ہوا کہ ان کی رہائش اس علاقے میں نہیں جہاں اس نے انہیں بے ہوشی کی حالت میں پایا تھا بلکہ وہاں سے کافی دور ان کا گھر تھا۔ نرس کو ان کا خیال رکھنے کی ہدایت کر کے وہ ایک بار پھر گاڑی سڑکوں دوڑاتا پھر رہا تھا کافی تاش بسیار کے بعد وہ مطلوبہ پتے پر پہنچنے میں کامیاب ہوا۔

”کاشان.....! آپ یہاں.....“ اس کی دستک کے جواب میں دروازہ کھولنے والی رابعہ تھی جو اسے اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر شدید حیران تھی۔

”جی اصل میں بات یہ ہے کہ میں رضا سے ملنے اس کے گھر ثمن آباد گیا تھا وہاں سے واپسی میں آپ کے والد ایک جگہ بے ہوشی کی حالت میں نظر آئے۔ انڈر ایک کلینک میں ایڈمٹ کروا کر میں یہاں آیا ہوں تا کہ آپ لوگوں کو انفارم کر سکوں۔ اگر گھر میں آپ کے بھائی وغیرہ کوئی ہیں تو انہیں بھیج دیں۔ میں انہیں کلینک کا پتہ دوں گا۔“ اس نے اپنی آمد کی وجہ بیان کی تو رابعہ کے چہرے پر پریشانی اور تشویش کی

”کیا بات ہے شکل پر بارہ کس لیے بچ رہے ہیں؟“۔ اپنے معمول کے کام

نہاتے ہوئے ثمرین نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہرپل ”کچھ ہونہ جائے“ کارڈ دل میں ہو تو شکل پر بارہ ہی بجا کرتے

ہیں۔“ کتن اپنے بازوؤں میں دو بوج کر وہ صوفے میں جھنس کر بیٹھ گئی۔

”یہ ارسلان کیا یونیورسٹی نہیں گیا آج روزانہ تو بھائی صاحب کے ساتھ ہی نکل

جاتا ہے لیکن آج ابھی تک اس کی آواز آرہی ہے۔“ ثمرین نے حالات کا اندازہ

لگانے کی کوشش کی۔

”ان ہی کا تو سارا مسئلہ ہے۔ ڈیڈی کے سامنے تو کچھ کہنے کی ہمت نہیں۔

مرا وقت امی کے کان کھاتے رہتے ہیں۔ لگتا ہے جب تک اپنی بات منوانا نہیں لیں گے

انہی سکون نہیں ملے گا۔“

”اب کون سی نئی خبر لے کر آئے ہیں صاحبزادے؟“ ثمرین نے پوچھا۔

”کل کاشان کے ساتھ گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر اس لڑکی رابعہ کو بیٹھا دیکھ لیا

ہے انہوں نے بس تب سے اپنی جان جلا رہے ہیں۔“ نیہا نے بتایا۔

”ارسلان کو تو لگتا ہے خط سوار ہو گیا ہے کاشان کا غلط ثابت کرنے کا حالانکہ

وہ اتنا اچھا سوفٹ سی پیچیر کا لڑکا ہے۔ خود ارسلان سے اس کے لیے دیے روپے کے

بادجود ہمیشہ ہنس کر ملتا ہے لیکن خیر! کیا کہہ سکتے ہیں۔“ ثمرین شانے جھٹک کر فلور کشنر

کی ترتیب درست کرنے لگیں۔

”ویسے نیہا! ایک بات بتاؤ اگر سچ ارسلان درست کہہ رہا ہو اور کاشان کو تم

خود کسی لڑکی کے ساتھ دیکھ لو تو تمہارا رد عمل کیا ہو گا؟“۔ اچانک ہی وہ اپنا کام چھوڑ کر

اس کے قریب آ بیٹھیں۔

”رد عمل کیا ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ کاشان کے ساتھ کوئی لڑکی موجود تو

نہر ہو سکتی ہے لیکن وہ لڑکی اس کے لیے نیہا نہیں ہو سکتی۔“

”واہ بھی واہ! بڑا ہی اندھا اعتماد ہے۔“ اس کے جواب پر ثمرین نے اسے

دھیان پٹانے کو پوچھا۔

”ہاں پھپھی رہتی ہیں وہاں ان سے ملنے گئے تھے۔ یقیناً انہوں نے ہی

کوئی بات کی ہو گی کہ بابا نے دل پر لے لی۔ اصل میں پھپھی کو میرے یونیورسٹی

پڑھنے پر سخت اعتراض ہے اور وہ اکثر ہی بابا کو اس سلسلے میں پریشان کرتی رہتی ہیں۔

”تو آپ کے بابا کو کیا ضرورت ہے ان کی باتوں کو دل پر لینے کئی۔ ایسے

داروں سے تو دور ہی رہنا چاہیے۔“ اس نے مفت مشورے سے نوازا۔

”بابا، پھپھی کو زبان دے کر پھنس گئے ہیں۔ اب ان کی الٹی سیدھی سننے

سوا چارہ بھی نہیں۔“ وہ آزدگی سے بولی۔ کاشان اس کی بات کا مفہوم واضح طور پر

سمجھ سکا چونکہ کلینک پہنچ چکے تھے اس لیے گفتگو کا سلسلہ وہیں ختم ہو گیا۔ رابعہ کے

کے ڈسچارج ہونے تک وہ وہیں رہا۔ کلینک کے ڈیوڑا کر کے انہیں واپس گھر

ڈراپ کرنے کی ذمہ داری بھی اس نے ہی سنبھال لی۔

”آپ کو اللہ تعالیٰ شاید اسپیشلی میری مدد کے لیے ہی ہر موقع پر بھیج

ہے۔“ اسے دروازے تک رخصت کرتے ہوئے رابعہ نے کہا تو وہ دھیرے سے

دیا۔

☆☆☆

”آخر آپ لوگوں کی آنکھوں پر بندھی پٹی کب کھلے گی؟ میں کہتا ہوں آ

اس سلسلے میں ڈیڈی سے بات کریں اپنی بہن کی محبت میں وہ نیہا کی زندگی کیوں داؤ پر

رہے ہیں ایسے شخص کو اپنا داماد بنانا جس کا کردار مشکوک ہو کہاں کی عقلندی ہے

ارسلان آج پھر ماں کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

”میں کسی سنی سنائی پر یقین کر کے آپ سے یہ سب نہیں کہہ رہا ہوں!

آنکھوں سے میں نے دیکھا ہے اسے اس لڑکی کے ساتھ سیر پائے کرتے ہوئے۔“ ا

کے کمرے سے مسلسل اس کی آواز آرہی تھی۔ برآمدے میں موجود نیہا چیزوں کی ج

پونچھ چھوڑ کر بیزار سی ہو کر خاموشی سے چچی کے پورشن میں جا پہنچی۔

”اگر اعتماد نہ ہوتا تو میری انگلی میں یہ انگوٹھی آپ کو دکھائی نہ دیتی۔“ اس رسان سے جواب دیا۔

”خدا تمہارے اس بھروسے اور اعتماد کو تا عمر قائم رکھے۔“ شرین نے دل گہرائیوں سے اسے دعا دی۔

☆☆☆

”مجھے اسرار صاحب سے ملنا ہے۔“ دستک کے جواب میں رابعہ سے ملنے چلا نقوش والی سترہ اٹھارہ سال کی ایک لڑکی نے دروازہ کھولا تھا۔

”آپ کا نام؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”کاشان، کاشان احمد۔“ اس نے بتایا تو لڑکی کے چہرے پر اپنائیت کے رنگ بکھر گئے۔

”اوہ، آپ..... آئیے اندر آجائیں۔ بابا ابھی کچھ دیر پہلے آپ کو ہی یاد کر رہے تھے۔“ جوش سے کہتے ہوئے اس نے کاشان کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

”ادھر اس کمرے میں چلے جائیں میں بابا کو آپ کے آنے کی اطلاع دیں ہوں۔“ اس نے کاشان کی رہنمائی کی تو وہ اس کے بتائے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ البتہ اس دوران وہ صحن میں ڈھیر بچوں کے درمیان گھری رابعہ کو دیکھ چکا تھا۔

”السلام علیکم اکل!“ لحوں میں رابعہ کے والد بیٹھک میں داخل ہوئے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر استرا تا کھڑا ہو گیا۔

”وعلیکم السلام۔ بیٹھو بھئی بیٹھو۔ ماشاء اللہ بڑی لمبی عمر ہے تمہاری ابھی میں بچوں سے تمہارا ہی ذکر کر رہا تھا اس دور میں تمہارے جیسے سبھے ہوئے اور دوسروں کا خیال رکھنے والے ہمدردو جوان کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔“ وہ اس کی آمد پر بہت خوش نظر آرہے تھے۔

”ارے نہیں اکل! آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہی سب کرتا آپ بتائیں اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہوں بیٹا! اصل میں کوئی جسمانی عارضہ نہیں ہے مجھے بس اس روز ذہنی طور پر اتنا ڈسٹرب تھا کہ خود کو سنبھال نہ پایا۔“ ان کے انداز میں ہلکی سی آزر دگی اتر آئی تھی۔

”اگر آپ چاہیں تو اپنی پریشانی کی وجہ مجھے بتا سکتے ہیں۔“ کچھ جھجکتے ہوئے اس نے ان سے پوچھا تو وہ ایک سردی آہ بھر کر رہ گئے۔

”ہمارے معاشرے میں چار بیٹیوں کے باپ کے حصے میں پریشانی کے سوا اتنا ہی کیا ہے مجھے اپنی بیٹیوں سے بہت پیار ہے اور ان کی ہر جائز خواہش میں اپنی بات کے مطابق پوری بھی کرتا ہوں۔ رابعہ کو بہت شوق تھا اکنکس میں ایم اے کرنے کا میں نے اسے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کی اجازت دے دی۔

میری بچی شریف ہونے کے ساتھ ساتھ سختی بھی بہت ہے۔ اپنی تعلیم کا سارا خرچہ خود اٹھاتی ہے لیکن پھر بھی دنیا کو اعتراض۔ غیروں سے کیا شکوہ سگی پھپھی جن کے بیٹے سے رابعہ کا رشتہ بچپن سے ملے ہے وہ بھی آئے دن رابعہ کو یونیورسٹی سے ہٹا لینے کا شورہ دیتی رہتی ہیں۔ اب بھی کہیں سے اڑتی اڑتی ان کے کانوں میں اس دن کے واقعے کی اطلاع پہنچ گئی ہے اس روز جب تم مجھے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے گئے تھے۔ میں ان ہی سے مل کر آ رہا تھا۔ انہوں نے صاف لفظوں میں دھمکی دی ہے کہ باؤمیں رابعہ کی یونیورسٹی چھڑوا دوں یا پھر وہ ہم سے ہر رشتہ ختم کر لیں گی۔

فی الحال تو میں نے اپنی طبیعت کی نرابی کے بھانے رابعہ کو یونیورسٹی جانے سے روکا ہوا ہے لیکن سوچتا ہوں میری بچی کو ڈیڑھ سال کی محنت ضائع ہو جائے گی اب ہر مہینے تو رہتے ہیں تم لوگوں کے فائل پیپر ہونے میں۔“ وہ یقیناً بہت زیادہ پریشان تھے جو اسے اپنا احوال سنارہے تھے۔

”معاف کیجئے گا اکل! لیکن مجھے آپ کی بہن بہت تنگ نظر لگیں۔ لڑکیوں کی

تعلیم تو ایک بہت اچھا عمل ہے رہا اس دن کے واقعے کا سوال تو ایسے چھوٹے مسائل تو ہمارے معاشرے میں باہر نکلنے والی لڑکیوں کو درپیش رہتے ہی ہیں۔ اصل میں تو رابعہ کی پھپھی کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کی بچھٹی کوئی کرپٹ لڑکی نہیں میں اس کا کلار فیلو ہو کر اس کے کردار کی گواہی دے سکتا ہوں تو کیا وہ سگی پھپھی ہو کر اس کے بارے میں نہ جانتی ہوں گی۔ میرے خیال میں تو آپ کو ان کی باتوں میں آکر رابعہ کی تعلیم پر رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہیے۔ وہ اگر اتنی تنگ دل ہیں تو کل کو کسی اور بہانے رشتہ ختم کر دیں گی اور اگر نہیں کرتیں تو شادی کے بعد ان چھوٹے موٹے واقعات کو بہانہ بنا کر اسے ستاتی رہیں گی۔ بہتر ہے کہ آپ ابھی بھی اچھی طرح سوچ لیں۔“

”بات تو تمہاری ٹھیک ہی لگ رہی ہے بیٹا!“ اس کی بات پر ان کے چہرے پر سوچ کی سی کیفیت چھا گئی۔

”کل بھیجوں گا میں رابعہ کو یونیورسٹی۔“

”لیکن میں اسی صورت میں جاؤں گی کہ آپ کی طبیعت بالکل سیٹ ہو۔“ اسی بل چائے اور لوازمات کی ٹرے تھاے رابعہ اندر داخل ہوئی۔

”طبیعت کی بالکل فکر نہ کرو میں اب ٹھیک ہوں کل میں خود بھی آفس جاؤں! اس لیے تمہارا گھر پر رکنا قطعی بے کار ہے۔“ وہ یقیناً کشمکش سے نکل آئے تھے۔

”اور کاشان!“ آپ کیسے ہیں۔ معاف کیجئے گا نیوش کے بچے آئے بیٹھے تھے اس لیے میں فوری طور پر آپ سے نہیں مل سکی ورنہ نادیدہ نے آپ کی آمد کی اطلاع تو دے دی تھی۔“ وہ کاشان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کوئی بات نہیں ویسے بھی انگل کی کمپنی میں مجھے وقت گزرنے کا پتہ نہیں چلا۔“ وہ مسکرا کر اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے بولا۔

”اچھا انگل اب چلا ہوں۔ یہ میرے گھر اور موبائل کے نمبرز ہیں۔ آپ کو جب کبھی ضرورت محسوس ہو بلا تکلف مجھے کال کر لیجئے گا۔“ چائے ختم کر کے وہ فوراً ہی واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسرار صاحب بھی اس کے ساتھ کھڑے ہونے لگے۔

”پلیز انگل! آپ بیٹھیں کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔“ اس نے ان کے شانوں پر دباؤ ڈال کر انہیں اٹھنے سے روکا۔

”تھینکس اگین کاشان!“ رابعہ دروازے تک اس کے پیچھے چلی آئی۔

”فارواٹ؟“ وہ چونک کر پلٹا۔

”میں نے آپ کی اور بابا کی باتیں سن لی تھیں آپ کی فیور نے میری مشکل دور کر دی۔“

”حق کا ساتھ دینا میری عادت ہے۔“ اس نے بے نیازی سے شانے اُٹکائے۔

”مجھے آپ کی اس عادت کا اندازہ بہت اچھی طرح ہو چکا ہے۔“ رابعہ نے دیرے سے ہنس کر کہا تو وہ بھی مسکراتا ہوا اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”چھوٹی آپا کے موبی کی شادی میں اب بس پندرہ ہی دن باقی ہیں اور ڈیروں تیاریاں ابھی رہتی ہیں۔ سوچ رہی ہوں کل نیہا یا رامین میں سے کسی کو ساتھ لے کر بازار کا چکر لگا لوں۔“ دانیال اور ثمرین بچوں سمیت نیچے کے پورشن میں تھے ثمرین نے آج کل کے سب سے اہم ٹاپک کو چھیڑ دیا۔

”بیوی! تمہاری تیاری مکمل ہونے تک مجھ غریب کی جیبیں بالکل خالی ہو جائیں گی۔ خدا کے لیے اب بس کرو ویسے بھی دو بچوں کی ماں کو اب کون غور سے دیکھے گا۔“ دانیال نے انداز میں مصنوعی خوف سموتے ہوئے دہائی دی۔

”کسی اور کو غور سے دیکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ دو بچوں کی ماں کو ان ہائل کا باپ دیکھے گا اور یہ میرے لیے کافی ہے۔“

آٹھ سال سے دیکھ دیکھ کر بیزار ہو گیا اب تو سوچتا ہوں منظر کچھ بدلنا چاہیے۔“ دانیال شوخی پر مائل تھے۔

”دیکھ رہے ہیں بھائی صاحب! یہ آپ کے بھائی تو بالکل ہی ہاتھوں سے

ٹکے جارہے ہیں۔“ شمرین نے خاموشی سے مسکراتے بلال صاحب کو متوجہ کیا۔

”بھئی مجھے تو معاف رکھو، مجھے معلوم ہے تم دونوں ہی ایک دوسرے کے کان کترنے میں ماہر ہو۔ البتہ تمہارے بازار جانے کی تجویز کی میں تائید کرتا ہوں۔ آمنہ اور تم دونوں ہی چلی جانا تاکہ مل جل کر پسند کر سکو۔ آمنہ کا ارادہ تو گولڈ کی کوئی چیز لینے کا ہے۔ یقیناً تم لوگ بھی ایسا ہی کچھ سوچ رہے ہو گے۔“

”جی اچھا بھائی صاحب! شمرین نے مؤدبانہ جواب دیا۔

”چچی! جیولرزشاپ تک جائیں گی تو کوئی اچھی سی گولڈ کی رنگ بھی لیتی آئیے گا۔“

”وہ کس لیے؟“ نیہا کی فرمائش پر انہوں نے پوچھا۔

”چاچو“ منظر بدلنے کا سوچ رہے ہیں تو پھر اس کی ضرورت تو پہلے مرحلے میں ہی پڑ جائے گی نا! نیہا کے معصوم بن کر بولنے پر شمرین اسے گھورنے لگیں مگر اس نے پہلے کہ کچھ کہیں ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ نزدیک ہونے کے باعث فون شمرین نے اٹھایا۔

”وعلیکم السلام نیہا سے بات کرنی ہے۔ ابھی بات کرواتی ہوں۔ یہیں بیٹھی ہے۔“ دوسری طرف کی آواز سن کر انہوں نے کہا اور پھر پلٹ کر نہایت اطمینان سے اسے پکارا۔

”نیہا! تمہاری دوست کا فون ہے۔“ نیہا جھٹ فون تک پہنچی۔

”ہیلو کون سنبل!“

”آہ..... ظالم.....! بیچانا تک نہیں حالانکہ یہاں تو یہ عالم ہے کہ۔“

اب دو عالم سے صدائے ساز آتی ہے مجھے

دل کی آہٹ سے تیری آواز آتی ہے مجھے۔

ریسیور میں سے سنائی دینے والی آواز نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا۔ اس نے پلٹ کر شمرین کی طرف دیکھا وہ اطمینان سے بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ انہوں نے نیہا کو

بڑے موقع سے پھنسیا تھا جانتی تھیں کہ سب کی موجودگی میں وہ یکدم فون رکھ کر مشکوک ہونا پسند نہیں کرے گی۔

”مامی کہتی تھیں نیہا سے اکتہار سننا ہے تو پہلے کوئی رشتہ قائم کرو لیکن میں تو مقفی کر کے اور بری طرح پھنسن گیا۔ نہ تم سامنے آتی ہو اور نہ ہی فون پر بات کرتی ہو۔“ وہ شکوے کر رہا تھا۔

”اصل میں وقت ہی نہیں ملتا۔“ اسے کوئی تو جواب دینا تھا۔

”ہاں تمہارے ہی شانوں پر سارے ملک کی ذمہ داریوں کا بار رکھا ہے تمہیں ہم جیسے معمولی لوگوں سے بات کرنے کا وقت کہاں ملتا ہو گا۔“ وہ تپا تپا سا بولا تو وہ اور گھبرا گئی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں بات کر تو رہی ہوں۔“

”جی یہ تو آپ کا بہت بڑا احسان ہے مجھ پر۔“ اس نے پھر طر کیا تو وہ چپ کد چپ کھڑی رہ گئی۔

”اچھا بتاؤ موبی بھائی کے مہندی کے فنکشن میں کس رنگ کے کپڑے پہنو گی؟“ وہ بات بدل کر پوچھنے لگا۔

”آف وہائٹ اور میرون کبھی نیشن کا سوٹ سلوایا ہے اس دن کے لیے شادی پر سلور گرے اور ویسے کے لیے ٹی پینک سلیکٹ کیا ہے۔“ اس نے آگے کی تفصیل بھی بتائی۔ کچھ تو بات نہ کرنے کا شکوہ دور ہو گا۔

”ویسے میں ٹی پینک مت پہننا۔“

”وہ کیوں؟“ اس کے منع کرنے پر وہ حیران ہوئی۔

”یار! یہ فکر میں نے اپنے ویسے کے لیے سوچ رکھا ہے نا۔“ وہ مزے سے بولا تو نیہا کے گالوں پر سرخی پھیل گئی۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم اتنی سی بات پر ہی بلش ہو گئی ہو گی۔ میں روزانہ جتنے منصوبے بناتا ہوں اور جتنے خواب دیکھتا ہوں اگر سارے تمہیں سناؤں تو تم نہ جانے کیا

کرو۔“

”میں فون رکھ رہی ہوں۔ ابھی مجھے کھانا بھی پکانا ہے رات کے لیے۔“ وہ واقعی گھبرا گئی تھی۔

”بس ہر چیز اہم ہے تمہارے لیے ہوائے میرے۔“ وہ پھر ناراض ہوا۔ نیہا کے پاس خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

”سوری نیہا! نہ جانے کیوں ایسا ہے کہ میں سب کا خیال رکھتا ہوں لیکن تمہارے معاملے میں دل چاہتا ہے کہ تم میرے خیرے اٹھاؤ میں تم سے روٹھوں اور تم مجھے مناؤ۔ قصور تمہارا نہیں میرا ہے جو میں تم سے ضرورت سے زیادہ توقعات وابستہ کر لیتا ہوں۔“ نیہا کی خاموشی نے اسے اس کی مجبوری کا احساس دلایا۔

”مجھے آپ کی یہی ادا سب سے زیادہ پسند ہے کاشان! کہ آپ ایک حساس انسان ہیں آپ کو ہر ایک کا خیال رہتا ہے بس ایک بار آپ کی زندگی میں شامل ہو جاؤں تو پھر آپ کے سارے خواب اور خواہشیں پوری کرنا میری سب سے پہلی ترجیح ہو گی۔“ خدا حافظ کہہ کر ریسور رکھتے ہوئے وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

”کیا ہوا چچی! آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ نیچے امی راین اور بشری تیار ہو کر آپ کا انتظار کر رہے ہیں جلدی گھر سے نکلیں گی تو ہی اطمینان سے شاپنگ ہو سکے گی۔“ امی کے کہنے پر وہ چچی کو بلانے اوپر آئی تھی انہیں بیڈ روم میں اسامہ کے پار بیٹھے دیکھ کر تشویش ہوئی۔

”یہ چھوٹا آج اسکول کیوں نہیں گیا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے اس کی؟“

”نہیں! کہاں ٹھیک ہے۔ رات کو کسی وقت بخار چڑھا بیٹھے صاحب! گھر میں دوائیں تھیں اس لیے میں نے فوری طور پر پلا دیں۔ اب بخار تو اتر گیا ہے لیکن میرا دا نہیں چاہ رہا ہے اسے چھوڑ کر شاپنگ کے لیے جانے کا۔“ ثمرین نے اپنی مجبوری بتائی

”آپ بھی تالیس ذرا ذرا سی باتوں پر پریشان ہو جاتی ہیں۔ میں ہوں گھر

دیکھ لوں گی آپ کے راج دلارے کو کیوں اسامہ! رہو گے نا آپنی کے ساتھ؟“ چچی سے کہتے کہتے وہ اسامہ سے مخاطب ہوئی۔

”ہاں ممّا! آپ جائیں میں نیہا آپنی کے ساتھ رہ لوں گا۔“ وہ نیہا سے کافی انچڑھا سو فائنٹ راضی ہو گیا۔

”بس چلیں اسامہ نے بھی منظور دے دی آپ تیار ہوں اور جا کر آرام سے شاپنگ کریں پہلے ہی اتنے کم دن ہیں تقریبات شروع ہونے میں۔“ اس نے ہاتھ پکڑا کر انہیں اٹھایا۔

”تم کیوں نہیں جا رہی ہو مارکیٹ کیا تمہیں کچھ نہیں لینا؟“ ثمرین نے جاتے جاتے پلٹ کر اس سے پوچھا۔

”میں نے راین کو لسٹ دے دی ہے اپنی چیزوں کی گھر پر بھی تو کسی کو رہنا ہی ہے نا۔ ویسے بھی میں تو آج کل فارغ ہوں پھر کسی دن بھی جاسکتی ہوں۔ راین اور بشری نے تو آج کی شاپنگ کے لیے خصوصاً جھنڈی کی ہے اس لیے وہ چلی جائیں یہی ٹھیک ہے۔“ وہ بی اے کے سپر زوے کر فارغ تھی اس لیے کافی ریلیکس بھی تھی۔

”نیہا! تم اسامہ کو لے کر نیچے ہی رہنا کوئی آئے تو دیکھ بھال کر دروازہ کھولنا۔ میں تو یقیناً کچھ دیر ہو جائے گی البتہ ارسلان ہو سکتا ہے جلدی لوٹ آئے۔“ گھر سے نکلے نکلے امی نے اسے ہدایات جاری کیں۔

”ٹھیک ہے امی! آپ بے فکر رہیں میں خیال رکھوں گی۔“ اس نے انہیں تسلی دی۔

”آجاؤ چھوٹا! تم میرے کمرے میں آرام سے لیٹ جاؤ۔“ اس نے اسامہ سے کہا۔

”آپنی! جنگل والی کہانی سنائیں جس میں بہت سارے جانور مل کر جنگل میں رہتے ہیں۔“ اسامہ نے اپنی فرمائش کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر اس کے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اس کی سن پسند کہانی سنانے لگی۔

”اوہو اسامہ کے بچے! تم نے مجھے باتوں میں الجھالیا۔ ابھی مجھے کھانا بھی پکانا ہے۔ ارسلان بھائی آئیں گے تو انہیں کیا کھلاؤں گی۔“

کافی دیر بعد اس کی نگاہ گھڑی پر پڑی تو وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔
”آپنی! مجھے سب کھانا ہے۔“ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس کے پیچھے کچن میں موجود تھا۔

”فرتج سے نکال لو فروٹ باسکٹ میں دھلے ہوئے رکھے ہیں۔“ شدید مصروفیت میں اس نے پیچھے مڑے بغیر جواب دیا۔ البتہ فرتج کھلنے اور بند ہونے کی آواز سے اسے اندازہ ہو گیا کہ اسامہ اپنی مطلوبہ شے حاصل کر چکا ہے۔ یوں بھی وہ اپنی فرمائش کے پورے نہ ہو سکنے پر خاموش بیٹھنے والا نہیں تھا۔

”گھر میں کتنی خاموشی ہو رہی ہے لگتا ہی نہیں کہ یہ ہمارا گھر ہے۔“ کافی دیر تک کچن کے کام سمیٹنے کے بعد وہ چادروں کو دم پر رکھ کر ذرا فراغت سے کھڑی ہوئی تو گھر میں چھائے سنائے کو محسوس کر کے اپنے آپ سے بولی۔

”اسامہ کو جا کر دیکھتی ہوں کافی دیر سے پلٹ کر نہیں آیا ٹی وی پر کارٹون لگا کر بیٹھ گیا ہوگا۔

وہ کچن سے باہر نکلی ٹی وی لاؤنج خالی پڑا تھا اس نے دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں جھانکا۔ اسامہ اسے اپنے بیڈ پر سوتا نظر آیا۔

”رات بھر بخار رہا ہے۔ بے چارہ سو نہیں پایا ہوگا۔ اچھا ہے اپنی نیند پوری کر لے جب تک میں اس کے لیے کسٹریڈ بنا دیتی ہوں بیماری کی حالت میں صبح رہے گا اس نے ایک بار پھر کچن کا رخ کیا کسٹریڈ تیار کر کے اس میں مطلوبہ فروٹس اور جیلی شامل کرنے میں اسے کچھ وقت لگا تھا لیکن وہ مطمئن تھی کہ سب کام مکمل ہو چکا اور اسامہ نے بھی یقیناً اپنی پسندیدہ ڈش دیکھ کر خوش ہو جانا ہے۔

”اپنی ماں کو اتنا تنگ کرتا ہے اور اب دیکھو کتنے مزے سے رہا ہے۔“ کمرے میں واپس آکر سوئے ہوئے اسامہ کو دیکھ کر اس نے سوچا اور اس کے قریب بیڈ

پر بیٹھ گئی۔

”اسامہ.....“ یکدم ہی اسے غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ بیڈ پر گھڑی بن کر سوتے ہوئے اسامہ کی سانس نادرل نہیں تھی۔

اسے سیدھا کر کے لٹانے کی کوشش کرتی نہیہ کی نظر سائڈ ٹیبل پر رکھی کولڈ ڈرنک کی بوتل پر پڑی۔ یقیناً وہ فرتج سے سیب نکالتے ہوئے چپکے سے کولڈ ڈرنک بھی نکال لایا تھا۔ طبیعت اس کی پہلے ہی ٹھیک نہیں تھی اس پر کولڈ ڈرنک کے استعمال نے اس کی سانس کی تکلیف کو بڑھا دیا تھا۔ نہیہ کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے اسے معلوم تھا اسامہ کو پڑنے والا یہ ایک اکثر شدید نوعیت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اس بل ڈور ٹیل کی آواز اسے غیبی امداد کی طرح لگی۔

”ارسلان بھائی آگئے۔“ وہ دوڑتی ہوئی دروازے پر پہنچی اور کھٹ سے لاک کھول دیا لیکن وہاں خلاف توقع کاشان کھڑا تھا۔

”کیا بات ہے نہیہ! اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ نہیہ پر نگاہ پڑتے ہی اسے گڑبڑ کا احساس ہوا۔

”اسامہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اور گھر پر میرے سوا کوئی نہیں۔“ وہ رو دینے کو تھی۔

”تم قنافت اسے لے کر آؤ میں گاڑی اشارٹ کرتا ہوں۔“ وہ فوراً الٹ ہو گیا۔

گاڑی اشارٹ کر کے اس نے پچھلا دروازہ کھلا جھوڑ دیا تھا۔ چند لمحوں میں ہی نہیہ اسامہ کو کاندھے سے لگائے باہر نکلی۔ آٹویک لاک سسٹم کی وجہ سے گھر میں تالا لگانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ سو وہ بہت تیزی سے اسپتال کی طرف روانہ ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

”جچی کیا سوچیں گی۔ وہ میرے مجرورے پر اپنے بچے کو چھوڑ کر گئیں اور میں ال کا خیال نہیں رکھ سکی۔“

”ڈاکٹر اسامہ کو ٹریسٹ دے رہا تھا اور باہر وہ کھڑی سوں سوں کر کے روتی
کاشان کو ساری تفصیلات بتا رہی تھی۔

”اچھا بس اب اتنی ہلکان نہ ہو شکر کرو کہ بروقت ہم اسے ہسپتال لے آئے۔
انشاء اللہ ابھی تھوڑی دیر میں اس کی طبیعت سنبھل جائے گی تم اپنے آپ کو سنبھالو میں
دانیال ماموں کے سیل پر انہیں کال کرتا ہوں۔“ وہ اسے دلا سے دے کر اپنے موبائل
سے دانیال کا نمبر ملانے لگا صرف پچیس منٹ بعد دانیال ہسپتال میں تھے اس دوران
اسامہ کی حالت بھی کافی سنبھل چکی تھی۔

”کاشان! تم یہاں کو لے کر گھر جاؤ اگر کوئی واپس گھر لوٹا تو پریشان ہو جائے
گا۔ اسامہ کے پاس میں ہوں سب سنبھال لوں گا۔“ انہوں نے کاشان سے کہا تو یہاں کو
احساس ہوا کہ کافی وقت ہو چکا ہے۔ یقیناً فرجاد اپنے اسکول سے اور ارسلان یونیورسٹی
سے واپس آچکے ہوں گے اور واقعی جب وہ لوگ گھر پہنچے تو ارسلان اور فرجاد گیٹ کے
باہر ہی انہیں ٹہلتے ہوئے دکھائی دیے۔

”کہاں چلی گئی تھیں تم کچھ ہوش بھی ہے کہ کیا وقت ہو رہا ہے۔ بے چارہ بچہ
بھی کب سے اسکول سے آکر دوپہر میں خوار ہو رہا ہے اپنے سیر سپاٹوں میں تمہیں اتنا
بھی خیال نہیں کہ سامنے آسیہ آئی کوہی گھر کی چابی دے جاتی ہیں۔“ ایک تو بھری دوپہر
میں انتظار کی کوفت اس پر سے اسے کاشان کے ساتھ دیکھ کر تو ارسلان کا پارہ بالکل ہی
ہائی ہو گیا اور وہ وہیں کھڑے کھڑے اسے باتیں سنانے لگا۔

”آپ کے پاس جو چابی ہوتی ہے وہ کہاں گئی؟“ اپنے ہاتھ میں پکڑی چابی
اس کے حوالے کرتے یہاں پہنچا۔

”گھر پر بھول کر چلا گیا تھا۔ اب مجھے کیا پتہ تھا کہ سب گھر والوں کی غیر
موجودگی میں تمہیں سیر سپاٹوں کی سوجھ جائے گی۔“ ارسلان کا لہجہ جتنا برا تھا بات اس
سے بھی کہیں زیادہ بری تھی یہاں گھڑوں پانی آگرا۔
”تم اس وقت شے میں ہو ارسلان! اس لیے تمہیں نہیں معلوم کہ تم کیا کہ

رہے ہو۔ اندر چلو پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔“

کی ہول میں چابی گھماتے ہوئے کاشان نے ارسلان کا شانہ تھپک کر رسان
سے کہا۔

”مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی میں اپنی بہن سے بات کر رہا ہوں اور اس
میں تمہیں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ کھٹاک سے گیٹ کھول کر اندر چلا گیا۔
”ابھی غصے میں ہیں موصوف جب اصل بات پتہ چلے گی تو خود ہی شرمندہ ہو
گا تم جاؤ اسے اور فرجاد کو کھانے وغیرہ کے لیے پوچھو میں ماموں کے پاس ہسپتال جاتا
ہوں۔“ اس کے چہرے پر چھائی سرنخی سے ظاہر تھا کہ وہ بہت ضبط سے کام لے رہا ہے
لیکن اتنی بڑی بات سن کر بھی اس نے جواباً کوئی غلط بات نہیں کہی تھی۔ ایک یہی چیز یہاں
کی نظروں میں اس کا وقار بلند کرنے کے لیے کافی تھی۔

☆☆☆

”بہت دن ہو گئے تمہارے مزاج کو برداشت کرتے کرتے۔ اگر میں تمہاری
ہر بات کو خاموشی سے برداشت کرتی رہی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم حد سے ہی
گزر جاؤ غضب خدا کا تمہیں ذرا شرم نہیں آئی اپنی بہن کے لیے ایسے جملے بولتے ہوئے
یوں بات کو جانے پر کھے بغیر الزام لگانے کا کام تو دنیا کرتی ہے سگے بھائی سے کون ایسی
بات سنا گوارا کرتا ہے۔ صدے سے بخار چڑھ گیا ہے میری بچی کو۔ رو رو کر آنکھیں
الگ سجالی ہیں اس نے اگر تمہارے باپ کو خبر ہو جائے تمہاری اس بدسلوکی کی تو ایسی
جھاڑ پلائیں گے تمہیں کہ ساری اکڑ بھول جاؤ گے۔“

وہ لوگ شاپنگ کر کے لوٹیں تو گھر سے اسامہ کی غیر موجودگی اور یہاں کی
حالت دونوں نے چونکا دیا۔ پوچھنے پر یہاں نے توفیق اسامہ کی طبیعت کی خرابی اور کاشان
کے ساتھ اسے ہسپتال پہنچانے کا قصہ ہی سنایا لیکن فرجاد جو آگے کے تمام واقعات کا عینی
شاہد تھا اپنی معصومیت میں من وعن ساری بات بتا بیٹھا اور اس بات نے آمنہ بیگم کو اتنا
نصہ دلایا کہ وہ بنا لحاظ کیے اپنے اکلوتے بیٹے کی کلاس لینے لگیں۔

”ہم سب تو خدا کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ اتفاقاً کاشان یونیورسٹی سے جلدی فارغ ہونے کے سبب یہاں چلا آیا اور اسامہ کو بروقت ہاسٹل پہنچا دیا اور تم وہ کہ بجائے اس کا شکریہ ادا کرنے کے اسے باتیں سنا بیٹھے۔ احسان تو رہا ایک طرف تم نے یہ تک نہ سوچا کہ وہ تمہارا ہونے والا بہنوئی بھی ہے تمہاری اس قسم کی باتوں کا اثر تمہاری بہن کی زندگی پر بھی پڑ سکتا ہے۔“

”میں نہیں مانتا اس رشتے کو۔“ کافی دیر سے سر جھکائے خاموشی سے ان کی باتیں سنتا ارسلان بگڑ کر بولا۔

”تمہارے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ تمہارے باپ کا ہے اور ان کے سامنے منہ کھولنے کی ہمت تم ساری زندگی نہیں کر سکتے۔“

آمنہ بیگم کی بات حقیقت پر مبنی تھی۔ بلال صاحب کا رعب اولاد پر واقعی اتنا تھا کہ نیہا اور کاشان کے رشتے پر شدید اختلاف کے باوجود ابھی تک ارسلان ان کے سامنے کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکا تھا سارا زور ماں پر ہی چلتا تھا۔ سواب بھی پیر شیخ کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”خیریت ہے رابعہ! آپ ابھی تک گھر کیوں نہیں گئیں۔“ وہ کتاب الیٹہ کروانے لائبریری آیا تھا۔ وہاں ایک ٹیبل پر سر جھکائے چپ بیٹھی رابعہ کو دیکھ کر حیران ہوا ان کی کلاسز آف ہو چکی تھیں اور تقریباً یونیورسٹی خالی ہو چکی تھی۔ وہ خود رضا کے ساتھ اپنا تھیسس ڈسکس کر رہا تھا اس لیے ڈپارٹمنٹ میں رکا رہا۔ لائبریری میں رابعہ کا موجودگی پر اسے اتنی حیرت نہ ہوتی اگر وہ کتابیں سامنے رکھ کر کچھ پڑھنے میں مصروف ہوتی۔ اس جیسی لڑکی کا بنا کسی وجہ کے یونیورسٹی میں رکنا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”بس سوچ ہی رہی تھیں واپس گھر جانے کا لیکن ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔“

اس کے چہرے کے تاثرات کے ساتھ لہجہ بھی الجھا ہوا تھا۔

”کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتائیں رابعہ! شینئر کرنے سے مسائل کا حل نکل

ہے۔“ کاشان کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خاصی ڈسٹرب ہے۔

”بابا نے بتایا تھا آپ کو میری پھپھی کے بارے میں آج صبح میرے یونیورسٹی کے لیے نکلنے سے پہلے ہی وہ گھر پہنچ گئیں۔ اپنے بیٹے سے وہ میرا رشتہ ختم کر دیں گی اس بات کے لیے تو میں ذہنی طور پر تیار ہی تھی لیکن انہوں نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا۔ چیخ چیخ کر مجھ پر ایسے غلیظ الزامات لگائے کہ میں آپ کو بتا بھی نہیں سکتی۔ ان کی چیخ و پکار پر محلے کے کئی لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ میری تو ہمت نہیں ہو رہی تھی گھر سے اہر قدم نکالنے کی لیکن بابا نے زبردستی مجھے یونیورسٹی بھیج دیا۔ سچ بتاؤں کاشان! اپنے ہی محلے گزرنے میں مجھے لگا کہ پل صراط سے گزر رہی ہوں۔ برسوں سے مجھے جاننے والوں کی نگاہوں میں میرے لیے شک تھا اور کیوں نہ ہوتا جب سگی پھپھی الزام لگا رہی ہو تو لوگ سوچتے ہیں کچھ نہ کچھ تو حقیقت ہوگی اس بات میں۔“

”یہ ساری وقتی باتیں ہیں رابعہ! آپ کے کردار کی مضبوطی بہت جلد لوگوں کے دل سے شک و شبہات دور کر دے گی۔ آپ حوصلے اور ہمت کے ساتھ یہ وقت گزار لیں اُنے والا کل خود آپ کے لیے گواہ بن جائے گا۔ اللہ نے ہر انسان کے حصے میں دشیاں لکھی ہوتی ہیں بس یہ ہے کہ بعض لوگوں کو اپنے حصے کی خوشیاں پانے کے لیے ٹوڑا انتظار کرنا پڑتا ہے۔“ وہ سخت اپ سیٹ تھی اور اسے اس ٹینشن سے نکالنے کے لیے اچھی امیدوں کا سہارا ہی دے سکتا تھا۔

”آپ بہت نائس انسان ہیں کاشان! آپ سے مل کر اچھائی کے وجود پر بن آئے لگتا ہے۔“ وہ ممنونیت سے بولی۔

”چلیں اب ختم کریں ان باتوں کو اور گھر جانے کے لیے اٹھ جائیں۔ وہ آپ کے لیٹ ہونے سے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“ اس نے رابعہ کو احساس دیا تو وہ کھڑی ہو گئی۔

”میں چھوڑ دوں آپ کو گھر؟“ باہر نکلتے ہوئے اس نے رابعہ سے پوچھا۔

”تاکہ صبح پھپھی کے لگائے ہر الزام کے تائید ہو جائے۔“ رابعہ تھوڑی سی تلخ

ہوئی۔

”اچھا..... چلو کسی قریبی اسٹاپ تک چھوڑ دوں گا۔ بس سے جانے میں آپ بہت وقت لگ جائے گا انکل کی طبیعت ٹھیک نہیں پریشانی میں مزید خراب نہ ہو جائے۔ اس نے آفر کی تو رابعہ کچھ سوچ کر راضی ہو گئی۔

”آج بائیک پر آئے ہیں آپ!“ اس کو موٹر سائیکل پارکنگ کی طرف پڑ دیکھ کر وہ بے ساختہ بولی۔

”ہاں، گاڑی تو کبھی بکھار ہی استعمال کرتا ہوں ورنہ مجھے بائیک ہی زیادہ پڑے۔“ وہ اتنا بے نیاز تھا کہ رابعہ جھجک محسوس کرنے کے باوجود اس کے ساتھ بائیک بیٹھنے سے انکار نہیں کر سکی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ کچھ نگاہیں ہیں جنہوں نے اس منظر بہت حسد اور رشک کے ساتھ دیکھا تھا۔

☆☆☆

”اور کیسی ہیں آپ؟ گھر میں سب ٹھیک ہیں۔“ آج اسے یونیورسٹی پہنچنے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیاں طے کر تھا۔ کہ سامنے سے آتی رابعہ کو دیکھ کر رک گیا۔

”سب ٹھیک ٹھاک ہیں مجھ سمیت اور آپ کو یاد کر رہے ہیں۔“ رابعہ کے اسے اچھے لگے تھے اور وہ محسوس کرتا تھا کہ ان حالات میں انہیں کسی تسلی دینے والا اشد ضرورت ہے سوا ایک دو بار ان سے ملنے رابعہ کے گھر جا چکا تھا۔

”آؤں گا کسی دن سب سے ملنے آپ بتائیں لائبریری جا رہی ہیں کیا؟“ ”ہاں“ پروفیسر مراد نہیں آئے آج میں نے سوچا کہ وقت ضائع کرنے بہتر ہے لائبریری جا کر کچھ پڑھ لوں۔“

”سرنہیں آئے۔ یہ تو میں آپ کو کلاس سے باہر دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا۔“ آپ جائیں لائبریری میں اپنے دوست سے ملنا ہوں۔“ سامنے سے آتے رضا کو اس نے گفتگو کا سلسلہ ختم کیا۔

”یہ رابعہ اسرار بڑی لفٹ کروانے لگی ہے تجھے۔“ ”تو“ تو کیوں جل رہا ہے۔“ اس نے اکثر رضا کی آنکھوں میں رابعہ کے لیے کچھ خاص رنگ دیکھے تھے سو جان بوجھ کر اسے چھیڑنے لگا۔

”میں کیوں جلنے لگا؟“ رضائے طرح دی۔ ”وہ تو میری جان! تیرے زبان سے کہے بغیر تیری آنکھیں بتا رہی ہیں۔ کوئی دوست سے۔ کسی لڑکی کی خاطر تیرے جیسے لہجے میں بات کرے تو بات صاف ظاہر ہے کہ اس لڑکی کی کچھ خاص اہمیت ہے۔“

”تو بہت خبیث آدمی ہے۔ دل کی بات بھی پڑھ لیتا ہے۔“ رضائے جھینپ کر اسے ایک مکا رسید کیا۔

”آپ خبیث کی جگہ ذہین کا لفظ استعمال کرتے تو یہ خطاب ہمارے شایان شان ہوتا۔“

”لیکن میں خبیث کو خبیث کہنے کے بجائے ذہین کیوں کہوں۔“ رضائے احتجاج کیا۔

”سوچ لے اگر تو نے آج مجھے ذہین تسلیم کر لیا تو آنے والے اتوار کو میں تیرا مسئلہ حل کروا سکتا ہوں۔“

”وہ کیسے۔“ رضا حیران ہوا۔

”اتوار کو ممی گھر پر ایک گیٹ ٹو گید رکھ رہی ہیں۔ تیری فیملی کو تو ہمیشہ ہی انویشن دیتا ہوں اس بار رابعہ کے گھر والوں کو بھی انوائٹ کر لوں گا۔ آئی پر رابعہ کے ریلیف اور اخلاق کی دھاک نہ بٹھادی تو کہنا۔“

”یار! یو آر ریلی آجینٹس مین۔“ رضائے بے ساختہ ہی اس کو سراہا اور دونوں دوستوں کے بلند قبضہ فضا میں بکھرنے لگے۔

☆☆☆

”کل فنکشن میں تم بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ کا شان نے تمہاری تعریف

تو ضرور کی ہوگی۔

کل پھپھو کے گھر سے واپس آنے کے بعد ارسلان نے کافی شور مچایا تھا ڈیڑا کے کانوں میں بھی بھنک پڑ گئی تھی لیکن انہوں نے صرف اتنا کہہ کر بات ختم کر دی کہ۔
”تم اپنی بہن کے لیے فکر کرتے ہو یہ اچھی بات ہے۔ لیکن اس فکر میں مجھ نظری کو شامل نہ کرو۔ یوں بھی ابھی میں زندہ ہوں اور فیصلے کا ہر حق میرے پاس ہے۔“
نیہا اس روز روز کے جھگڑے کو دیکھ کر بہت زیادہ اپ سیٹ ہو چکی تھی۔ اس وقت بھی پڑ مردہ سی کیفیت میں چچی کے پاس آ کر بیٹھی تھی اور انہوں نے وہی ٹاپک چھیڑ دیا۔

”کیوں بھئی اب کیا مجھ سے پردہ داری کرنے لگی ہو۔“ اس کی خاموشی کو بھرا دیکھتے ہوئے ثمرین چچی نے اسے چھیڑا۔

”کوئی بات ہوئی ہو تو آپ کو بتاؤں بھی اور کیا کا شان میری تعریف کریں بہت زیادہ ضروری ہے اکلوتے بیٹے ہیں وہ پھپھو کے سارے کام انہیں ہی دیکھنے ہوتے ہیں۔ انہیں اتنی فرصت کب تھی کہ وہ میری طرف توجہ دیتے۔“ اس نے قدرے جڑ کر جواب دیا۔

”ہاں مصروف تو بہت تھے موصوف! نہیں تو اتنی فرصت نہیں تھی کہ موبی اور اس کی دلہن جو اس محفل کے مہمان خصوصی تھے انہیں ہی ڈھنگ سے انٹرٹین کر لیتے۔ بس سارا وقت رابعہ یہاں آؤ رابعہ وہاں بیٹھو رابعہ ان سے ملو کی تکرار ہی ہوتی رہی۔ جو وقت بچا وہ رابعہ کے ابا اور بھائی بہنوں کی خاطر داری میں گزار دیا میں ہمیشہ ارسلان کا مخالف رہی ہوں۔ لیکن کس! اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تو مجھے بھی برا لگ رہا تھا کل پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ارسلان غلط نہیں ہے جب وہ کا شان کو اس لڑکی کے ساتھ دیکھتا ہوگا تو اسے بھی برا لگتا ہوگا۔ کلاس میں لائبریری میں گاڑی میں بائیک پر ہر جگہ جب وہ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھتا ہوگا تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی یہ بات میں کل ہی سمجھا ہوں۔“

”آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ سچ ہو ضروری تو نہیں۔“ نیہا نے احتجاج کیا۔
”جی ہاں! نہ آنکھیں سچ دیکھتی ہیں اور نہ کان صحیح سنتے ہیں۔ میں نے سنا تھا کا شان اپنے دوست رضا کی امی کو بتا رہا تھا کہ رابعہ بہت اچھی کلک اور ڈریس ڈیزائنر ہے۔ آخر اسے ایک بالکل غیر لڑکی کی اتنی خصوصیات کا علم کیسے ہوا۔ اس بات کا تو صاف مطلب ہے کہ وہ لوگ ناصرف یونیورسٹی میں ملتے جلتے ہیں بلکہ کا شان کا اس کے گھر بھی آنا جانا ہے۔ لڑکی کی ماں تو زندہ نہیں ہے۔ باپ یقیناً جاب کرتا ہوگا۔ بہن بھائی سارے اس سے چھوٹے ہیں۔ تو ان صاحبہ کو تو بالکل چھٹی ملی ہوئی ہوگی۔ جو دل چاہے کرتی پھریں۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا تو ہوگا نہیں گھر میں۔“ ثمرین کچھ زیادہ ہی جڑ گئی تھیں۔

”آپ تو بہت زیادہ جذباتی ہو رہی ہیں چچی! اس طرح کسی پر الزامات لگانا آپ کی نیچر تو نہیں۔“ نیہا حیران تھی۔

”یار! سچ بتاؤں۔ میں تمہارے سوا کا شان کے ساتھ کسی اور کو برداشت نہیں کر پارہی تم بات کرونا کا شان سے تمہارا حق ہے کہ تم اس سے پوچھو کہ وہ یہ سب کیا کرتا پھر رہا ہے۔“

”ایک بات بتاؤں چچی! میں محبت کو آزاد چھوڑ کر اپنا بتائے رکھنے کی قائل ہوں۔ زنجیروں میں بندھا شخص مجبور ہے۔ یا واقعی آپ کا اپنا کیسے پتہ چل سکتا ہے کا شان آزاد ہیں جو چاہیں کریں۔ میں کبھی پلٹ کر ان سے سوال نہیں کروں گی اگر وہ میرے ہیں تو ہمیشہ میرے ہی رہیں گے اور اگر ایسا نہیں تو میں زبردستی کچھ بھی حاصل کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“ وہ جو تھوڑی دیر پہلے خود بڑی اپ سیٹ لگ رہی تھی اب کو سمجھاتے سمجھاتے خود کو بھی بہت کچھ سمجھا گئی۔

”تم بہت پیاری لڑکی ہو نیہا! خدا تمہیں ہمیشہ ہر دکھ سے دور رکھے۔“ ثمرین نے بے ساختہ ہی اسے دعا دی۔

”السلام علیکم یا مای! کیا حال چال ہیں۔ میاں اور بچے خیریت سے ہیں۔

”اوہو! خیریت تو ہے یہ آج مامی کی یاد کیسے آگئی۔“ فون پر دوسری طرف سے سائی دیتی کاشان کی آواز پر ثمرین نے طنز اُپوچھا۔

”مامی کی یاد تو ہمیشہ مطلب سے ہی آتی ہے۔ اور آپ سے میرا کیا مطلب نکلتا ہے۔ یہ تو آپ جانتی ہی ہیں۔“ وہ ڈھٹائی سے ہنس کر بولا۔

”تو فون بھی نیچے کے نمبر پر کرنا تھا نا! تمہاری منگیت ہمارے گھر میں تھوڑا رہتی ہے۔“

”ایک گھنٹے میں دوبار کال کر چکا ہوں۔ پہلے بڑی ممانی نے فون اٹھایا۔ اس سے علیک سلیک کی پھر دوبارہ کیا تو رامین کو بھگتا پڑا لیکن اس سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ ہمارا ”مال“ آپ کے پاس ہے۔ ویسے بھی اس کے چوبیس میں سے بارہ گھنٹے آپ ہی نام ہوتے ہیں اب اگر آپ بات کروادیں تو بڑی مہربانی ہوگی بندہ تا عمر آپ احسان مند رہے گا۔“

”کروادیتی ہوں بات ویسے بائی داوے۔ تمہیں فرصت مل گئی اسے یاد کر۔ کی۔“ ثمرین نے طنز کیا۔

”اسے یاد کرنے کے لیے کسی فرصت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کی یاد سانس کی آمدورفت کے ساتھ جڑی ہے۔ بس فون وغیرہ اس لیے نہیں کرتا کہ وہ یاد کرنے میں ہچکچاتی ہے مجھے بھی اچھا لگتا ہے اس کا یہ انداز شادی سے پہلے کے ”پردے“ کا بھی اپنا الگ ہی چارم ہوتا ہے۔ ابھی تو اس لیے بات کرنا چاہ رہا ہوں پاپا مجھے ایک ہفتے کے لیے دینی بھیج رہے ہیں۔ سفر میں کب کیا حادثہ پیش آجائے کیا کم از کم بندہ اپنے ساتھ ایک خوشی تو لے کر جائے۔“

”اچھا اب زیادہ الٹی سیدھی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں جا دیتی رہے! اور باتیں ایسی ہیں جیسے جہاد کے لیے جارہے ہوں۔“

ثمرین نے خفا ہو کر کہا اور بچوں کے کمرے میں ان کے ساتھ مصروف بنا

آواز دینے لگیں۔

”فون ہے تمہارا۔ بات کر لو۔“ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اطلاع دی گئی۔

”کون ہے؟“ وہ کچھ مشکوک ہوئی۔

”میں نے پوچھا نہیں تم خود بات کر کے دیکھ لو۔“ وہ قصداً خود کو کسی کام مصروف ظاہر کر کے رخ موڑ گئیں تو نیہا کو ہولڈ پر رکھا ریسیور اٹھانا پڑا۔

”اتنی دیر کیوں لگائی آنے میں بہت لطف آتا ہے تمہیں مجھے تڑپانے میں۔“ اپنی پہلو کے جواب میں کاشان کی آواز سن کر پلٹی سامنے ثمرین کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

”آپ ہمیشہ میرے ساتھ دھوکا کرتی ہیں۔“ اس نے خفا ہو کر ریسیور ان کے ہاتھ میں واپس دے دیا۔

”لو بھیجی اس نے تو تم سے بات ہی کرنے انکار کر دیا اب کہو کوئی پیغام دینا ہو تو میں دے دیتی ہوں۔“ ثمرین بے تحاشا ہنس رہی تھیں۔

”کوئی بات نہیں تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ مئی سوچ رہی ہیں۔ عید کے بعد ڈیٹ فکس کرنے کا میرے ایگز امز بھی بس ہونے ہی والے ہیں۔ رمضان سے پہلے پہلے پاپا کا آفس جوائن کر لوں گا۔ ابھی کے لیے آپ بس اتنا کریں اس سے پوچھیں کہ دئی سے اس کے لیے کیا لے کر آؤں۔“ کاشان نے کہا تو ثمرین نے پلٹ کر نیہا کو اس کا پیغام سنا دیا لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر چپ چاپ بیٹھی رہی۔

”ہاں بھی کاشان وہ کہہ رہی ہے کچھ لانے کی ضرورت نہیں بس تم خود لوٹ کر آ جانا۔“ نیہا کے گھورنے کی پروا کیے بغیر انہوں نے اپنی مرضی سے کہا۔

”آپ نا صرف دھوکے باز بلکہ کافی سے زیادہ جھوٹی خاتون بھی ہیں۔“ کاشان سے مزید دو چار باتیں کر کے انہوں نے فون بند کیا تو نیہا نے خفگی سے کہا۔

”حد ادب لڑکی! یاد رکھو کہ میں تمہاری چچی ہوں۔“

”یہ ٹھیک ہے۔ جب اپنی مرضی کے کام کرنے ہوئے تو دوست بن گئیں اور جب ہمارے بولنے کی باری آئی تو آپ کو اپنا بڑا پن یاد آ گیا۔“ وہ منہ پھلا کر بولی تو

شرین بننے لگیں۔

”ویسے ایک بات ہے یہاں! کا شان سچ سچ تمہارا دیوانہ ہے۔“

”آپ کی رائے کا کوئی اعتبار نہیں۔ ابھی تھوڑے عرصے پہلے اس پر کافی شک کرتی رہی ہیں۔“ یہاں نے انہیں بتایا۔

”تو وہ حالات ہی ایسے تھے۔“ انہوں نے اپنا دفاع کیا۔

”اور اب صرف ایک فون کال سے حالات ٹھیک ہو گئے۔ صحیح کہتے ہیں چاہے ان کی زہرہ محترمہ کی کھوپڑی میں دماغ نام کی کوئی شے نہیں۔“ یہاں نے افسوس سے کہا تو وہ برامانے کے بجائے زور زور سے ہنسنے لگیں۔

☆☆☆

”ایکسکیوز می راجہ! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ آج وہ لوگ اپنا آخری پیرہ دے کر فارغ ہوئے تھے۔ لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ جاتی راجہ کو کا شان نے آواز دے کر روکا۔

”خیریت کوئی خاص بات ہے کیا؟“ راجہ رک کر پوچھنے لگی۔

”ہاں خاص ہی بات ہے آؤ وہاں بیٹھ کر آرام سے بات کریں۔“ وہ ڈپارٹمنٹ میں موجود بیٹیوں میں سے ایک کی طرف بڑھا۔ سوالیہ چہرہ لیے راجہ بھی اس کے ساتھ تھی۔

”میرے دوستوں میں سے رضا عابدی کو تو دیکھا ہی ہے آپ بھی کلاس فیلو ہونے کی حیثیت سے تھوڑا بہت واقف ہوں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔“

”ایچھے ذہین اور سو پر سنائی (Personality) کے مالک ہیں رضا لیکن آپ مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟“ وہ حیران تھی۔

”دوستی کی خاطر اس کی خواہش ہے کہ میں اس کے بارے میں آپ کی رائے معلوم کروں۔“ کا شان کے جواب نے راجہ کو بہت کچھ سمجھا دیا۔

”رضا کی فیملی سے تو اس روز میرے گھر میں آپ کی ملاقات ہوئی تھی اس کی امی اور بہنوں کو آپ بہت پسند آئیں وہ لوگ تو فوری طور پر رشتہ لے کر آپ کی طرف آنا چاہتے تھے لیکن رضانا نے روک دیا اس کا خیال تھا کہ آپ کا یونیورسٹی میں ایک اچھا بیچ ہے۔ اس رشتے کی وجہ سے کہیں کوئی اسکینڈل نہ بن جائے ویسے تو وہ بالکل مشرقی روایت کے مطابق اپنی فیملی کے ذریعے آپ کے والد صاحب سے ہی بات کرے گا لیکن اس کی خواہش تھی کہ آپ سے پہلے بات کر لی جائے تاکہ آپ بغیر کسی دباؤ کے اپنی رائے دے سکیں۔“ کا شان وضاحت سے اسے سب کچھ بتا رہا تھا۔

”میری رائے میرے بابا کی رائے سے مختلف ہرگز نہیں ہو سکتی اس لیے آپ کے دوست کو چاہیے کہ وہ میرے بجائے میرے بابا کی رائے جاننے کی کوشش کریں۔“ راجہ سنجیدگی سے جواب دے کر وہاں سے جانے لگی۔

”اچھا شرما کر بھاگ کیوں رہی ہیں۔ ذرا رکیں تو۔“ کا شان نے اسے پکارا لیکن راجہ کے جواب سے پہلے ہی کچھ شوخ قہقہے وہاں بکھر گئے۔

”آئے ہوا بھی۔ بیٹھو تو سہی۔“

جانے کی باتیں جانے دو۔

آئے ہوا بھی۔

کا شان نے پلٹ کر دیکھا۔ وہی تین لڑکے جو اس روز راجہ کو یونیورسٹی کے سامنے تنگ کر رہے تھے چہروں پر خبیث سی مسکراہٹ لیے گنگنا رہے تھے۔

”کا شان! پلیز ان سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں سے نکل چلیں۔“ راجہ جو چند قدم آگے بڑھ چکی تھی واپس پلٹ کر آگئی کا شان کے چہرے پر چھائی سرخی سے وہ اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگا سکتی تھی۔

مجھ سے محبت کا اظہار کرتی

کاش کوئی لڑکی مجھے پیار کرتی

ایک لڑکا سینے پر ہاتھ رکھے اسٹائل سے گانے لگا اور دوسرے نے اسے سہارا

کارخ بدلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

دے کر تسخرانہ انداز میں کہتا۔

”مبر کر میرے یار! یہ لڑکی تو اپنا ہیرو لے اڑا اب تو کہیں اور لڑائی مار۔“ یہ صورت حال کا شان کے لیے قطعی ناقابل برداشت تھی۔ وہ غصے میں بھرا ان سے چند قدم کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔

”یہاں کس لیے آئے ہو۔ تمہارا تعلق فزکس ڈپارٹمنٹ سے ہے تو اپنے ڈپارٹمنٹ کو چھوڑ کر یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”ہاں بھئی یہ تو غلط بات ہے۔ تم لوگوں کو صرف اپنے ڈپارٹمنٹ کی لڑکیوں پر نظر رکھنی چاہیے اکناکس کی لڑکی پر اکناکس والوں کو ہی حق ہے۔“ ان میں سے ایک نے پھر ٹھنڈول کیا۔

”تم لوگ شرافت کی زبان میں بات سمجھنے والے ہو نہیں۔ تمہیں تمہاری زبان میں ہی سمجھانا پڑے گا۔“ کا شان بھڑ گیا اور وہ لوگ تو شاید بہت دنوں سے ایسے ہی کسی موقع کی تاک میں تھے سو بات بڑھتی چلی گئی۔ معاملہ یونیورسٹی کے اندر پیش آیا تھا سلحوں میں بات پھیلی اور سکیورٹی پر تعینات پولیس والوں نے موقع پر پہنچ کر ان تینوں لڑکوں سمیت کا شان کو بھی گرفتار کر لیا۔

☆☆☆

”کا شان حوالات میں ہے۔“ یہ اطلاع سب سے پہلے ارسلان کے ذریعے گھر پہنچی اور سارے اہل خانہ حق و حق رہ گئے۔

”آخر ہوا کیا تھا کچھ معاملے کا علم بھی تو ہو۔“ آمنہ بیگم نے فوری شک سے سنبھل کر پوچھا۔

”میرے بتانے سے کیا حاصل آپ لوگ تو اب بھی ہمیشہ کی طرح جھٹلا کر اس کی ہی حمایت کریں گے۔“

”اب ایسا بھی اندھیر نہیں چا بات تھانے کچھری تک جا پہنچی ہے۔ تو یقیناً اس کے پیچھے کوئی وجہ بھی ہوگی ہم بے کار میں تمہیں ہرگز نہ جھٹلائیں گے۔“ آمنہ بیگم کی سوجھ

”سارا مسئلہ اس لڑکی رابعہ کا ہی ہے۔ پہلے اس کی خاطر گولی کھائی اور اب حوالات تک جا پہنچے آخر کوئی تو تعلق ہوگا کا شان کا اس لڑکی کے ساتھ جو اس کی خاطر اسے اپنی جان اور عزت تک کی پروا نہیں رہی میں صاف بتا رہا ہوں امی! میں ایسے شخص سے نہیہا کی شادی ہرگز نہیں ہونے دوں گا جو کسی اور لڑکی میں انوالو ہو۔

شادی کے بعد اس کی ان حرکتوں سے نہیہا کو تکلیف اٹھانا پڑے۔ اس سے جہر ہے کہ ہم ابھی یہ رشتہ ختم کر دیں۔“

اس بات سے ناواقف کہ وہ نہیہا سے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین رہا ہے۔ ارسلان اپنی بات کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ آج پہلی بار آمنہ بیگم بھی ارسلان کی باتوں سے قائل ہوئی تھیں شام تک کا وقت انہوں نے بڑی مشکلوں سے گزارا۔

”کچھ خبر ملی آپ کو اپنے بھانجے کے متعلق۔“ شام کو بلال صاحب کے آتے ہی وہ ان سے پوچھنے لگیں۔

”ہاں ارسلان نے آفس فون کر کے بتایا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے آفس میں ناصر بھائی سے فون پر بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے۔ کا شان کو گھر لے آئے ہیں وہ ان تینوں لڑکوں کی بھی پولیس نے کافی کھنچائی کی ہے اور معافی نامہ لکھوا کر انہیں تھانے سے جانے دیا ہے۔“ وہ تھکے تھکے سے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے بتانے لگے۔

”معاملہ تو رفع دفع ہونا ہی تھا۔ آخر اتنا پیسہ ہے ناصر بھائی جان کے پاس اولاد کے کارنامے چھپانے کے لیے کام میں نہ لائیں گے تو پھر کیا کریں گے اتنی دولت کا۔“

”کیا مطلب؟“ آمنہ بیگم کی بات پر وہ چونک کر سیدھے ہوئے۔

”مطلب صاف ہے میں چاہتی ہوں ہم کا شان کو اپنی بیٹی دینے کے فیصلے پر

نظر جانی کر لیں۔ ابھی صرف متنی ہوئی ہے کل کلاں کو شادی کے بعد بھی کاشان میاں کا یہی حال رہا تو ہم کیا بگاڑ لیں گے ان کا ابھی بیٹی اپنے گھر میں ہے بہتر ہے کہ ہم اس کے لیے کوئی صحیح فیصلہ کر لیں مانا کہ بڑی آپا اس سے بہت محبت کرتی ہیں اور ان کے گھر دنیا جہان کی آسائشات دنیا کو مل سکتی ہیں لیکن جب شوہر ہی ڈھنگ کا نہ ہو گا تو باقی چیزوں سے کیا حاصل۔“ وہ جیسے کوئی فیصلہ کر چکی تھیں۔

”لیکن ہم اتنی آسانی سے یہ رشتہ کیسے ختم کر سکتے ہیں آخر کو ہم نے بڑی آپا کو زبان دی ہے۔ اور یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں لڑکوں کی زندگی میں ایسے چھوٹے موٹے واقعات ہو ہی جاتے ہیں۔“ بلال صاحب تذبذب کا شکار تھے۔

”بیٹی کی زندگی برباد کرنے کے مقابلے میں ہر قدم اٹھانا آسان ہے اور جسے آپ چھوٹی بات سمجھ رہے ہیں۔ کاشان کی شخصیت کا پہلو وہ ہے جو ارسلان کے ہزار بار دکھانے کے باوجود میں نظر انداز کرتی رہی لیکن اب کسی کی ایک نہیں سنوں گی۔“

”وہ قطعیت سے بولی تھیں۔ اور واقعی انہوں نے اپنے کیے پر عمل کر دکھایا۔ بڑی آپا اور ان کے شوہر خود آئے ان سے بات کرنے چھوٹی بہن دانیال اور ثمرین کے ذریعے بھی سمجھانے کی کوشش کی۔ کاشان نے خود حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کی لیکن وہ اپنے فیصلے میں اتنی اٹل تھیں کہ دنیا کی آنکھوں میں بجھتے رنگ بھی انہیں دکھائی نہ دیے اس موقع پر بلال صاحب نے بھی خاموشی اختیار کیے رکھی بہر حال وہ بیٹی کے باپ تھے اور اپنی شریک سفر کی مرضی کے بغیر تنہا کسی فیصلے کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا کر آنے والے وقت میں پچھتانے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔

☆☆☆

”دنیا! یہ سب کیا ہے؟ اس طرح سے کوئی تمہیں مجھ سے چھین سکتا ہے۔“ بڑے دنوں کی ٹرائی کے بعد آج دنیا نے اتفاق سے فون ریسو کر ہی لیا۔ وہ جو اس صورتحال پر دیوانہ ہو رہا تھا اس کی آواز سن کر بکھر سا گیا۔

”وہ سب لوگ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ لیکن تم تو جانتی ہو نا دنیا کہ میرے

دل پر تمہارے سوا آج تک کسی اور کا سایہ تک نہیں پڑا۔“ وہ اس سے اپنی محبت کی گواہی مانگ رہا تھا دنیا کے لیوں سے بے اختیار ایک سسکاری نکلی۔

”مجھے معلوم ہے تم اپنی زبان سے کہو یا نہ کہو لیکن میرے طرح اس فیصلے پر تمہارا بھی دم گھٹ رہا ہو گا۔ پلیز دنیا! ایک بار میری خاطر تم ممانی جان سے بات کرو۔ انہیں بتاؤ کہ وہ ناصر ف مجھ پر بلکہ تم پر بھی ظلم کر رہی ہیں۔“

”نہیں کاشان! میں ایسا ہرگز بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے آپ کا ساتھ چاہیے لیکن پورے اعزاز اور وقار کے ساتھ میرے زور دینے پر امی راضی تو ضرور ہو جائیں گی لیکن ان کے دل میں گرہ پڑ جائے گی اور میں یہ نہیں چاہتی میں اپنی زندگی کے اتنے بڑے فیصلے میں ان کے دل کی پوری پوری آمادگی چاہتی ہوں۔“ خود پر قابو پاتے اس نے اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔

”اور میں میرا کیا ہو گا دنیا تمہارے بنا تو میں نے زندگی کے بارے میں کوئی تصویر ہی نہیں کیا۔“ وہ اس کا ضبط آزارہا تھا۔

”میرے پاس آپ کے اور اپنے لیے اچھے وقت کی دعاؤں اور امید کے سوا کچھ نہیں کاشان۔“ بالآخر وہ اپنا ضبط کھو بیٹھی۔

”میرے لیے یہ زادراہ بھی بہت ہے دنیا! اور اس کے بدلے میں تمہیں صرف یہ یقین دے سکتا ہوں کہ میں ہمیشہ سے تمہارا ہوں اور تمہارا ہی ہوں گا۔ میں نے کبھی ایک پل کے لیے بھی تمہارے ساتھ خیانت نہیں کی۔“

”مجھے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں کاشان! مجھے آپ پر پورا یقین ہے۔“

”تمہارا یقین مجھے ہمیشہ حوصلہ دیتا رہے گا۔“ وہ یکدم ہی ہلکا چمکا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”لو پھر عید کے بعد سہرا باندھنے کی تیاری ہے تمہاری۔“ وہ رضا کے ساتھ خوش حالی سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

”بالکل کنفرم یار! تو کری تو پہلے ہی ماموں نے میرے لیے تلاش کر رکھی تھی

لے جانا ہے۔ آپ کہیں کوئی کام تھا کیا؟“ یہاں نے مڑ کر جواب دیتے ہوئے ان سے پوچھا۔

”نہیں بس ذرا فراغت تھی بچے آج جلدی سو ہیں اور تمہارے چاچو اپنے کسی دوست سے ملنے گئے ہوئے ہیں میں اکیلی بور ہو رہی تھی تو سوچا تمہارے ساتھ وقت گزارا جائے۔“ وہ اندر آ کر ایک کرسی پر ٹنگ گئیں۔

”ارسلان کی نوکری کا کچھ بنا نہیں ابھی تک اس کا تو زلٹ بھی فوری طور پر آ گیا تھا۔ میرے خیال میں اب تک تو کئی جگہ انٹرویو د چکا ہے۔“ وہ یوں ہی بات سے بات نکالنے لگیں۔

”ہاں دیکھیں کب بات بنتی ہے۔ اکثر جگہوں پر تو ایکسپریٹس کا نہ ہونا انکار کا سبب بن جاتا ہے۔ ایک آدھ جگہ بات بنی بھی تو تنخواہ اس قدر کم تھی کہ ارسلان بھائی کو اپنی بایک کے لیے پیٹرول کا خرچہ بھی نکلتا دکھائی نہیں دیا۔ بس اب دیکھیں کب بات بنتی ہے۔ ارسلان بھائی تو بہت اپ سیٹ ہو گئے ہیں۔ روزانہ کی اس خواری سے۔“

”ہاں ویسے بھی ٹھوڑا نازک مزاج ہے۔“ ثمرین نے تبصرہ کیا اور پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اسے پکارا۔

”نیہا! کاشان نے تم سے دوبارہ رابطہ کیا؟“ نیہا کے ہاتھ پل بھر کر کے اور پھر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”میں نے خود ہی انہیں منع کر دیا تھا چچی! میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتی کہ جس سے میرے گھر والوں کا بھروسہ ٹوٹے۔ ارسلان بھائی کی ضد کتنی ہی غلط سہی میں ان کے مقابل کھڑی نہیں ہونا چاہتی وہ جو کچھ کر رہے ہیں میری محبت میں کر رہے ہیں اور میں ان کی محبت کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتی۔

اپنے کام میں مصروف اس نے جواب دیا تو ثمرین رشک سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ اس عمر کی لڑکیوں میں اتنی سمجھداری انہوں نے بہت کم ہی دیکھی تھی۔

اسی پل ارسلان تین چار ٹائیاں لیے چلا آیا۔

اس لیے روزگار کا کوئی مسئلہ نہیں اماں چاہ رہی ہیں کہ نازلی (رضا کی بہن) کی رخصتی ہو تو ساتھ ہی بہو بھی گھر لے آئیں تاکہ گھر میں بیٹی کی کمی کا احساس نہ ہو اور تیرا یا تو دل و جان سے تیار ہے۔“ رضا واقعی بے جد مسرور تھا۔

”دل کی خوشی پالینے کا خیال انسان کو کتنا سرشار کر دیتا ہے۔“ ہمیشہ سنجیدہ رہنے والے رضا کے ہونٹوں پر بار بار ہانکھرنے والے ہنسی کو دیکھ کر کاشان نے سوچا۔

”تم سناؤ تمہاری شادی کی کون سی ڈیٹ فکس ہو رہی ہے آنٹی نے ایک بار بتایا تو تھا کہ عید کے بعد وہ بہو گھر لانے کا ارادہ رکھتی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تاریخیں آپس میں ٹکرا جائیں۔“ رضا شکر ہوا۔

”ابھی فی الحال ایسا کچھ نہیں ہو رہا۔ تم بے فکر ہو کر اپنی شادی کی تیاری کرو۔“ کاشان نے اسے تسلی دی۔

”خیریت تو ہے کاشان! کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں تم دن بہ دن کچھ سنجیدہ سے ہوتے جا رہے ہو۔“ رضا نے ٹٹولتی نگاہوں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

”اٹس اوکے یار ایوری تھنگ از آل رائٹ۔ تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ کاشان نے اسے تسلی دی۔

”میں نے اس دن یونیورسٹی میں پیش آنے والا واقعہ اپنے گھر والوں سے چھپا لیا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ وہ لوگ کہیں راجہ کے بارے میں کچھ غلط نہ سمجھ بیٹھیں لیکن اب سوچ رہا ہوں تمہارا تو اپنا کزن میتھس میں ہوتا تھا یقیناً اسے اور اس کے ذریعے باقی گھر والوں کو بھی کچھ نہ کچھ خبر ملی ہوگی تو پھر ان لوگوں نے کیسے ری ایکٹ کیا؟“ رضا مسئلہ کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ کاشان نے گہرا سانس لیتے اسے مختصر ہر بات بتا دی۔

☆☆☆

”کیا کر رہی ہو نیہا! ثمرین نے دروازے سے جھانک کر پوچھا۔“

”ارسلان بھائی کے کپڑے پر لیس کر رہی ہوں کل انہیں کسی جگہ انٹرویو کے

”نیہا! دیکھو اس سوٹ کے ساتھ کون سی ٹائی صحیح رہے گی؟“
 ”نیہا خوش دلی سے ٹائی کے انتخاب میں اس کی مدد کرنے لگی۔“

☆☆☆

”پتہ نہیں کیوں؟ میرے ہی نصیب میں ناکامیاں لکھی ہیں۔“ انٹرویو کا نتیجہ کیا ہو گا وہ انٹرویو لینے والے صاحبان کے تاثرات سے ہی جان چکا تھا۔ راستے میں پڑے ایک گتے کے ڈبے کو ٹھوکر لگاتے اس نے قدم آگے بڑھائے۔ بایک بھی پچھلے چار دن سے خراب پڑی تھی۔ سوبسوں کی خواری نے اسے اور بھی چڑچڑا کر دیا تھا۔
 ”اور ایک کاشان ہے۔ ہمیشہ سب کی محبت اور توجہ سمیٹتا رہا اور اب بھی سنا ہے پھپھانے اس کے لیے الگ سے کہیں آفس سیٹ کر کے دیا ہے۔“ ایک اور سوچ نے اس کا دل جلایا۔

”اور مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ نیہا کاشان سے محبت کرتی ہے میں تو اسے ایک عام سی مگنی سمجھ رہا تھا لیکن اب جانا کہ ناصرف وہ کاشان کو پسند کرتی ہے بلکہ اس کا مقابلے میں مجھے غلط ہی سمجھتی ہے۔“ وہ اپنی ہی دھن میں سوچتا آگے بڑھ رہا تھا۔
 ”لیکن پھر بھی وہ تمہارا مان قائم رکھنا چاہتی ہے۔ کیا یہ بات اہم نہیں۔“ اس کے اندر سے صدا آئی اور وہ اس صدا کے زیر اثر یہ تک فراموش کر کے کہ وہ اس وقت ایک مصروف ترین شاہراہ کو کراس کر رہا ہے، اپنے اطراف سے کٹ گیا اور اس بل شاید خدا کو اس کی زندگی منظور تھی جو کسی نے پیچھے سے کھینچ کر تیز رفتار ٹرک کی زد میں آنے سے بچا لیا۔ ارسلان جیسے خواب کی کیفیت سے چونک کر جاگا۔ آس پاس سنائی دیتے گاڑیوں کے بریکس کی جڑ بڑا ہٹ نے کسی انہونی کا احساس دلایا۔ اس نے بے ساختہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کو بچانے والا خون میں لت پت سڑک پر پڑا تھا۔ یقیناً اسے بچانے کی کوشش میں وہ اپنے آپ سے غافل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”نیہا! بیٹا کہاں مصروف ہو صبح سے کچھ دیر بیٹھ کر سکون کا سانس بھی لے لو۔“

”بچن سے میلی صافیاں لے کر غسل خانے میں بھگونے کے لیے گئی تو آمنہ بیگم نے اسے آواز دی۔“

”بس امی! تھوڑا ہی کام رہ گیا ہے۔ سوچا بچن کی صفائی اچھی طرح کر لوں۔“
 ”آج چاند نظر آگیا تو کل سے ورنہ پرسوں سے رمضان کا آغاز ہے۔“
 ”ہاں بس اللہ سے یہی دعا ہے کہ اس بابرکت مہینے میں مجھے بھی اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنا نصیب ہو جائیں تمہارا کسی ڈھنگ کی جگہ رشتہ ہو جائے اور ارسلان کو اچھی سی نوکری مل جائے تو سمجھو میری آدھی پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ راین اور بشری تو خیر ابھی چھوٹی ہیں۔ ارسل اور تمہارا بیٹا ایک ساتھ کر دوں گی۔“ وہ مستقبل کے منصوبے اسے سنار ہی تھیں۔ نیہا بنا کوئی جواب دیے پلٹ کر بچن میں چلی گئی۔

”ارسلان ابھی تک واپس نہیں آیا۔“ راین اور بشری کے آنے کے بعد وہ کھانا لگا رہی تھی کہ آمنہ بیگم بولیں۔

”انٹرویو کے لیے گئے ہیں۔ پتہ نہیں اور کتنے لوگ آئے ہوں گے ایسے میں دیر سو رہی ہو ہی جاتی ہے۔ آپ آرام سے کھانا کھائیں۔ ارسلان بھائی آئیں گے تو میں انہیں کھانا دے دوں گی۔“ وہ پانی کا جگ رکھ کر خود وہاں سے جانے لگی۔
 ”تمہیں کھانا نہیں کھانا کیا؟“ آمنہ بیگم نے اسے ٹوکا۔

”جی ابھی بھوک نہیں بعد میں کھالوں گی۔“ وہ بتا نہیں سکی کہ دل بہت بوجھل ہو رہا ہے۔ آنسو بلاوجہ آنکھوں سے نکلنے کی ضد کر رہے ہیں۔ یہ شاید تھوڑی دیر پہلے آمنہ بیگم کی کہی بات کا اثر تھا۔

وہ اس کی شادی کا ذکر کر رہی تھیں اور وہ بھلا کاشان کے سوا کسی کا تصور کیسے کر سکتی تھی۔ اپنے کمرے میں آکر وہ تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

”نیہا! یکدم ہی دروازہ دھڑ سے کھلا تھا۔ شرین چچی کی پکار میں اتنا غیر معمولی پن تھا کہ اسے اپنے آنسو صاف کرنے کا بھی ہوش نہیں رہا۔“

”تمہیں معلوم ہو گیا کیا؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ چونکیں۔

”کس بات کا؟“ کسی انہونی کے خیال نے اس کے دل کو بری طرح بھیجا تھا۔

”ارسلان کا فون آیا ہے۔ کاشان کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ بہت سیریس قسم کا۔ ہم سب ہاسپٹل جا رہے ہیں تم بھی آ جاؤ۔“ مہیا کو لگا تھا اس کے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ اپنے بے دم وجود کے ساتھ وہ کس طرح ٹیکسی میں بیٹھی کیسے ہاسپٹل پہنچی اسے کچھ خبر نہیں تھی اس کے لب ہلے بغیر بھی ایک ہی دعا مانگ رہے تھے کاشان کی سلامتی کی دعا۔ آئی سی یو کے سامنے پایا دانیال چاچو ارسلان بھائی بے تحاشا روتی بڑی پھپھو اور ان کو دلاسہ دیتے چھوٹی پھپھی کی فیملی والے ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ساکت کھڑے پھپھا جان سب کو اس نے دیکھا تھا۔ لیکن دل صرف اس ایک چہرے کو دیکھنے کا خواہش مند تھا جس کے ساتھ اس کی ہر دھڑکن جڑی تھی۔

”ڈاکٹر زکوشش کر رہے ہیں۔ فی الحال تو کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا کافی فریکیز ہیں خون کافی زیادہ بہا ہے لیکن اصل تشویش سرکی چوٹ کی وجہ سے ہے۔ ایم آر آئی اور آئی سی ٹی اسکین کے بعد ہی تسلی ہو سکتی ہے۔ ارسلان کا بلڈ گروپ کاشان سے میچ کرنا ہے اس نے دو بوتل خون دیا ہے باقی بھی اس نے دوستوں وغیرہ کی مدد سے انتظام کر دیا ہے بس یہیں تک اختیار ہے انسان کا آگے اللہ سے دعا ہی مانگی جاسکتی ہے۔“ دانیال چاچو سستے ہوئے چہرے کے ساتھ دیرے دیرے شرمین چچی کو بتا رہے تھے آئی سی یو کے دروازے پر نظر لگائے کھڑی مہیا کا رواں رواں اللہ کے سامنے دعا گو تھا۔ جیسے جی موت کی تاریکی کو کیسے محسوس کیا ہے۔ مہیا بلال سے بڑھ کر آج یہ بات کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

”مہیا!“ آنکھوں میں سرخی لیے ارسلان اس کے برابر میں آکھڑا ہوا تھا۔

”کاشان کو کچھ ہو گا تو نہیں نا ارسلان بھائی؟“ وہ اپنے جذباتوں پر پردے

ڈال کر رکھنے والی بڑے بھائی کے سامنے عیاں ہو رہی تھی۔

”اسے کچھ ہو ہی نہیں سکتا مجھے یقین ہے تمہاری دعاؤں کی طاقت اسے تم سے

دور جانے نہیں دے گی۔“ اس کے کاندھے پر اپنا بازو پھیلا کر ارسلان نے اسے خود سے قریب کیا اپنے حسد کی آڑ میں وہ مہیا کے جذبات کو جلاتا رہا تھا اس بات کا اندازہ اسے آج ہی ہوا تھا۔

”میرا سانس رک رہا ہے ارسلان بھائی!“ مہیا کی ڈوبی ڈوبی سی آواز اس کی سماعت تک پہنچی اور اگلے ہی لمحے وہ اس کے بازوؤں میں جھول رہی تھی۔ اتنی دیر سے وہ بڑی ہمت کا مظاہرہ کر رہی تھی ذرا سا سہارا پاتے ہی ڈھے گئی۔

☆☆☆

”مہیا! شاپنگ کے لیے چلو گی؟“ ابھی کچھ دیر پہلے ہی چاند دیکھنے کا اعلان ہوا تھا وہ بنا کسی قسم کے جذبات کے صبح کی تیاری کے لیے کچن میں آکھڑی ہوئی تھی۔ ارسلان کے پوچھنے پر نفی میں گردن ہلا دی۔

”ابھی مجھے بہت کام کرنے ہیں۔“

”بعد میں کر لینا ابھی پوری رات پڑی ہے۔“ وہ اس کے ہاتھ سے سامان لے کر واپس سلیب پر رکھنے لگا۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا جانے کو آپ رامن اور بشری کو لے جائیں۔ وہ واقعی کہیں نہیں جانا چاہتی تھی۔“

”انہیں بعد میں لے جاؤں گا۔“ وہ زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کچن سے باہر لے آیا۔

”حلیہ کتنا خراب ہو رہا ہے تمہارا۔“ باہر نکل کر اس پر تنقیدی نظر ڈالی۔

”ہونے دیں بازو رہی تو لے جا رہے ہیں کون سا آپ کی سرال جانا ہے جو سولہ سنگھار کروں۔“ وہ جھنجھلائی ہوئی تھی۔

”میرے نہ سہی ہو سکتا ہے تمہارے سرال چلے جائیں۔“

”کیا کہا؟“ بایک اشارت ہونے کے شور میں وہ ارسلان کی بڑبڑاہٹ سن

نہ لگی تھی۔

”آخر آپ کو جانا کہاں ہے؟“ تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ ارسلان یوں ہی بے مقصد سڑکوں پر بائیک دوڑا رہا ہے۔
 ”کیا تم مجھے معاف کر دو گی نیہا!“ ہوا کے دوش پر لہراتی ارسلان کی آواز کے کانوں سے لکرائی تو وہ اس کی پشت گھور کر رہ گئی۔
 ”آخر آج آپ کو ہو کیا گیا ہے؟“
 ”چلو وہاں بیٹھ کر آئیں کریم کھاتے ہیں۔ اس کی بات کا جواب دیے بنا ایک جگہ بائیک روک کر کھڑا ہو گیا۔

”میں حسد کا شکار ہو گیا تھا بہت بچپن میں یا پھر پیدا ہوتے ہی میرے وجود میں اس جذبے نے جنم لیا اور پھر ہر روز بڑھتا ہی گیا۔ میں ہر روز خود سے سوال کرتا کہ آخر کاشان میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں۔ شکل صورت تعلیم رکھ رکھاؤ میں کوئی فرق نہیں تھی۔ میں مالی حیثیت میں فرق کو کاؤنٹ کرتا اگر تمہیں ملنے والی محبتیں میرے سامنے نہ ہوتیں تمہاری بھی وہی حیثیت تھی جو میری اس لیے کاشان کے مقابلے میں میرے انور ہونے کے وجہ کم از کم پیسہ تو نہیں ہو سکتا یہ بات میں نے جان لی لیکن اتنی ذرا سی بات نہ جان سکا کہ کاشان کے چاہے جانے کی اصل وجہ اس کی مہربان فطرت اور ہر ایک سے بے لوث کی جانے والی محبت ہے۔

اور شاید میں ساری زندگی یوں ہی بھٹکتا رہتا جو اس روز میرے ساتھ وہ حادثہ نہ پیش آتا۔ اس مصروف ترین سڑک کو کاشان کے خلاف سوچتے ہوئے کر اس کرتے ہوئے میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اللہ اسے وہاں میری زندگی کی ضمانت بنا کر بھیج دے گا مجھے معلوم ہے پیچھے سے مجھے کھینچ کر گاڑی کی زد میں آنے سے بچانے کی کوشش کرتے وقت اسے ہر گز نہیں پتا تھا کہ وہ میں ہوں۔ اس نے تو بس اپنی فطرت کے مطابق کسی ”ضرورت مند“ کی مدد کی تھی۔ اور ایسے میں پتا نہیں کیسے اس کا پاؤں مڑا اور وہ خود ایک گاڑی کی زد میں آ گیا۔ اسے وہاں اس حال میں دیکھ کر میرے دل پر کیا گزری تھی میں تمہیں لفظوں میں نہیں بتا سکتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ میرے وجود میں پتا

حد کا پودا جڑ سمیت جل کر خاک ہو گیا تھا۔

پھر میری ہاسپٹل میں رابعہ سے ملاقات ہوئی عین اس وقت جب تم بے ہوش ہو کر میرے ہاتھوں میں تھیں۔ اس نے ایک بل میں تمہیں پہچان لیا تھا۔ وہ خود بے تحاشا رو رہی تھی لیکن اسے تمہاری فکر تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ تم کاشان کے لیے کیا ہو۔ اور وہیں میں نے یہ بھی جانا کہ کاشان سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے۔

پہلے ایک کلاس فیلو اور پھر دوست کی ہونے والی بیوی کے حیثیت سے وہ کاشان کی بھابھی تھی اور میں نہ جانے ان دونوں کے لیے کیسے کیسے شک اپنے دل میں پاتا رہا۔ سچ پوچھو تو اس روز میں رابعہ کے سامنے مارے شرمندگی کے نظر نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ بھی ہے کہ میں تم سب کا مجرم ہوں امی کے دل میں کاشان کے خلاف برائی ڈالنے والا میں تھا۔ پھپھو کا اتنے ارمانوں سے جوڑا رشتہ تڑوا کر میں یہ جانے بغیر کہ وہ کتنی دیکھی ہیں اپنی کامیابی کا جشن مناتا رہا اور ان ہی کے بیٹے نے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر مجھے بچا لیا مجھے تو یہ تک نہیں معلوم تھا کہ کاشان کا آفس وہیں اسی علاقے میں ہے اور وہ لنچ کے لیے سامنے ہوٹل میں جا رہا تھا۔ اگر اس روز وہ نہ بچتا تو میرے پاس اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے تک کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اب کم از کم میں یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ نیہا! مجھے معاف کر دو۔“

مگک سی بیٹھی اس کی باتیں سنتی نیہا کو جھٹکا لگا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں ارسلان بھائی! آپ مجھ سے بڑے ہیں اور بڑے چھوٹوں سے معافی نہیں مانگتے۔“

”میری بہن بہت پیاری لڑکی ہے اسی لیے خدا نے اس کا نصیب بھی ایک بہت پیارے انسان سے جوڑا ہے۔“ ارسلان نے اپنی آنکھوں میں آنی نمی کو اپنے اندر اتارا البتہ نیہا نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ابتدائی دو چار دن کے بعد اس کے ہاسپٹل جانے پر پابندی لگ گئی تھی۔

کیونکہ کاشان کی حالت دیکھ کر اس کی اپنی حالت غیر ہو جاتی تھی۔ دو تین بار تو

وہ بے ہوش ہی ہو گئی۔ سوتب اسے کاشان اب ٹھیک ہو رہا ہے۔ اس کی طبیعت سنبھل گئی ہے وہ بہتر ہے جیسے جملوں میں اس کی خیریت تو پہنچاتے تھے لیکن ہاسپٹل لے جانے کے لیے کوئی رضا مند نہیں ہوتا تھا۔ پھر جب اسے پتا چلا کہ وہ گھر پر شفٹ ہو گیا ہے اسے تسلی ہوئی لیکن اب ڈیڑھروں شرم نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس کے دل کی حالت اب ٹی وی پر چلنے والے کسی اشتہار کی طرح سب کے علم میں تھی۔

”آئس کریم تو تم نے ساری پگھلا کر ضائع کر دی۔ چلو اب بیٹھو بائیک پر مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔“ ارسلان نے ڈپٹ کر کہا تو وہ اپنے خیالات سے نکل کر اس کے پیچھے بائیک پر سوار ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں ارسلان کی بائیک فرائے بھرتی جس جگہ جا کر رکی اس نے اسے بوکھلا دیا پھپھو کے گھر کا بڑا سا سفید گیٹ سامنے تھا۔

”یہاں کیوں لائے ہیں ارسلان بھائی! پھپھو کیا سوچیں گی پہلے ہم نے ان سے رشتہ ختم کیا اور اب خود ہی زبردستی تعلقات بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ وہ اندر جانے نہ جانے کی کنکش میں کھڑی تھی۔

”پھپھو تو ایسا کچھ سوچنے کے لیے یہاں موجود نہیں۔ وہ تو ہمارے گھر تمہاری عیدی لے کر گئی ہوئی ہیں۔ میں نے سوچا وہ جو گھر میں ایک لولا لنگڑا آدی پڑا ہے اور چاند دیکھنے چھت پر نہیں جاسکا اس کو ”چاند“ دکھا دوں۔“

”خبردار! جو آپ نے کاشان کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے۔“ وہ چلائی اور ارسلان ہنستا ہوا بائیک زن سے نکال کر لے گیا۔ نیہا نے ارد گرد دیکھا اندر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

”آجاؤ دروازہ کھلا ہے۔“

دستک کے جواب میں اندر سے کاشان کی کمزوری آواز سنائی دی تو وہ دروازہ کھو کر اندر داخل ہو گئی گردن تک چادر اوڑھے وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا نیہا ایک ٹک اسے دیکھنے لگی کتنی دعاؤں کے نتیجے میں خدا نے اسے یہ شخص لوٹا یا تھا۔

”اشرف پانی پلا دو مجھے۔“

کمزوری آواز سی استدعا کی گئی۔ نیہا نے سائنڈ ٹیبل پر رکھے جگ میں سے گلاس میں پانی اٹھایا اور اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

”ارے بھائی! اٹھ کر بیٹھنے میں بھی مدد دے دو۔ کیا ہر بار یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ میں تمہارا محتاج ہوں۔“

آواز میں کمزوری کے ساتھ ساتھ رقت بھی آگئی تھی۔ نیہا کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ گلاس واپس ٹیبل پر رکھ کر اس نے کاشان کی گردن کے پیچھے سے اپنا دایاں ہاتھ گزار کر اس کے بائیں بازو کو پکڑا اور بایاں بازو بائیں ہاتھ کی گرفت میں لے لیا۔

ذرا سی کوشش کے بعد وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا مگر کچھ اس طرح کے نیہا اپنا ہاتھ واپس کھینچنے میں ناکام تھی۔

”اف! آنکھیں کھول کر کیوں نہیں دیکھتے جاگتے میں آنکھیں بند کرنے کی کیا تک۔“

وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اپنے بائیں ہاتھ پر اس کے مضبوط ہاتھ کی گرفت محسوس کر کے اچھلی لیکن اسے سنبھلنے میں دیر ہو چکی تھی اس کی بے بسی پر محظوظ ہوتا وہ آنکھوں میں بے تحاشا چمک لیے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ کیا دھوکے بازی ہے؟“

وہ گڑبڑی۔

”دھوکا تو میرے ساتھ کیا ہے تمہارے بھائی نے۔ چاند دکھانے کا وعدہ کیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا کہ چاند اتنا میلا ہوگا۔“

وہ شرارت بھرے انداز میں اسے چھیڑ رہا تھا۔

”آپ کی صحبت کا اثر ہو گیا ہے میرے اتنے شریف بھائی پر اور کچھ نہیں تو تنہا آپ جیسے ناقابل بھروسہ انسان کے پاس اپنی بہن کو چھوڑ گئے۔“ وہ سچ مچ زچ ہو رہی تھی۔

”ایسے ہی نہیں چھوڑ گئے آپ کے بھائی صاحب اپنی کئی ہڈیاں تڑوا کر اور کئی لیٹر خون بہا کر یہ اعتبار قائم کیا ہے۔“

وہ اطمینان سے بولا اور جھک کر سائیز ٹیبل کی دراز کھولنے لگا۔ اس مقصد کے لیے اسے نیہا کا ہاتھ چھوڑنا پڑا تھا۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر دروازے کی طرف بھاگی۔

”کیا اس حالت میں مجھے چھوڑ کر جاسکو گی؟“

کاشان نے یکدم سے اپنے اوپر سے چادر کھینچی۔ پلاسٹر میں جکڑے اس کے بعد نے نیہا کے قدم روک لیے وہ آہستگی سے چلتی واپس آئی اور اس سے کچھ فاصلے پر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”یہ میں نے تمہارے لیے دہی سے خریدی تھی۔ اس وقت یہ تو نہیں معلوم تھا کہ مگنی ٹوٹ جائے گی اور دوبارہ کرنے کی نوبت آئے گی لیکن یہ حسرت ضرور تھی کہ مگنی کی انگوٹھی اپنے ہاتھ اپنے تمہیں پہناؤں۔“

وہ کیس میں سے انگوٹھی نکالتے ہوئے بولا تو نیہا نے خاموشی سے اپنا باباں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

تیسری انگلی میں انگوٹھی پہنا کر وہ کئی لمحوں تک اس کی خردلی انگلیوں والا ہاتھ اپنے ہاتھ کی گرفت میں لیے بیٹھا رہا۔

”میں ایک بات سوچ رہا ہوں نیہا!“

”وہ کیا؟“

نیہا جو اس کی نگاہوں کی وارفتگی پر سرخ پڑتی نکاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ آہستہ سے بولی۔

”یہ کہ انسان کی ہڈیاں کتنی بار ٹوٹ کر جڑ سکتی ہیں۔“

”وہ کس لیے؟“

نیہا حیران تھی۔

”یار! میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم شادی کے بعد بھی آسانی سے قابو

نہیں آنے والی چیز نہیں تو سوچ رہا ہوں جب تمہیں بے بس کرنا ہو اپنی ایک آدھ ہڈی تڑوا لوں گا۔ کم از کم تم اس طرح سامنے بیٹھ کر اپنے دیدار سے فیض یاب تو کرو گی۔“

”بس آپ کا دماغ چلنا شروع ہو گیا۔“

”کیوں نہ چلے رسم دنیا بھی ہے۔ موقع بھی ہے اور دستور بھی۔“

”اوہ! میں نے تو ابھی تک تم سے کہا ہی نہیں۔ عید مبارک نیہا!“ وہ جیسے ہوش دھواں میں واپس آیا۔

”آپ کو بھی عید مبارک۔“

نیا کی مطمئن ہنسی کمرے میں بکھرتی چلی گئی۔

☆☆☆

وہ شش و پنج میں پڑ گئی کہ کیا جواب دے۔ اگر یہ سوال انہوں نے اس کی آمد کی پہلے ایک دو ہفتوں میں کیا ہوتا تو وہ غافٹ کوئی بھی شاعر سا جواب دے دیتی لیکن اب چھ ماہ کی اچھی خاصی دوستانہ رفاقت کے بعد کسی قسم کا جھوٹ بولنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا اور سچ بولنا بھی کچھ آسان نہیں تھا۔

”چلیں آج میرے ساتھ میرے غریب خانے پر چل کر ناشتہ کر لیں۔“ ڈاکٹر فصیح نے شاید اس کے گریز کو محسوس کر لیا تھا۔ سوائے سوال کا جواب دینے پر اصرار نہیں کیا۔

نزہہ آفتاب نے بھی صورتحال کے ٹل جانے پر شکر کا سانس لیا اور ان کے سنگ ان کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر چل پڑی۔ ڈاکٹر نائلہ آج کل بہن کی شادی کے سلسلے میں چھیٹوں پر گئی ہوئی تھی اس لیے ڈاکٹر فصیح اور نزہہ اکیلے ہی ہوتے تھے۔

ڈاکٹر فصیح کے گھر بیڑی پر بیٹھ کر ماں جی کے ہاتھ کے بنائے پراٹھے اور لسی سے ناشتہ کرتے ہوئے نزہہ آفتاب بات بات پر تہقہ لگا رہی تھی۔ ڈاکٹر فصیح کی چھوٹی بہن مریم حسن بھی ان تہقہوں میں اس کی شریک تھی۔ ”دیکھیے بھائی! یہ نزہہ آپنی کتنے اچھے اور مزے کے جوک سناتی ہیں۔ اس نے ڈاکٹر فصیح کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہا۔ جو بڑے سے کچن کے سامنے موجود برآمدے میں کرسی پر براجمان تھے۔

نزہہ نے بھی ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ لیکن وہاں بلا کی سنجیدگی تھی جیسے کہہ رہے ہوں۔“ میں ان کھوکھلے تہقہوں سے بھلنے والا نہیں۔“ اس نے چپکے سے اپنی نظر کو واپس موڑ لیا اور لسی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

زلفیں تیری گھپ اندھیرا
ہو جا گئی کر دے سویرا

ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے بلال کی کوئی رگ تھی جو فائزہ کو دیکھتے

ابھی کچھ دن لگیں گے

”آپ نے یہ جاب کیوں کی نزہہ؟“

گاؤں کی خوشگوار سہانی صبح اور پرندوں کے نغموں کو انجوائے کرتے ہوئے مارننگ واک میں مصروف نزہہ آفتاب کو ڈاکٹر فصیح حسن کے اچانک سوال نے گڑ بڑا دیا۔ اندرون سندھ واقع اس چھوٹے سے گاؤں میں دارالشفاء کے نام سے واقع ہاسپٹل میں جاب کرتے ہوئے اسے تقریباً چھ ماہ ہونے کو آئے تھے اور ان چھ ماہ میں ایک دن بھی ایسا نہ گزرا تھا کہ اس نے اپنا معمول ترک کیا ہو کر اچی جیسے شہر میں بھی جہاں تازہ اور خالص ہوا میں سانس لینا محض دیوانے کا خواب ہی ہو سکتا ہے وہ کوشش کرتی تھی کہ خدا کی اس نعمت سے محروم نہ رہے۔ چنانچہ مارننگ واک اس کی روٹین کا ایک لازمی حصہ تھی اور اب جب کہ وہ اس چھوٹے سے گاؤں میں شفٹ ہو چکی تھی اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا بلکہ اپنے ساتھ ساتھ ڈاکٹر فصیح اور ڈاکٹر نائلہ جاوید کو بھی اس نے اس کا عادی بنا دیا تھا۔

وہ تینوں روزانہ صبح ساتھ ہی نکلا کرتے۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ گاؤں کی پگڈنڈیوں پر ٹہلتے سبزے کی ٹھنڈک سے آنکھوں کو سیراب کرتے اور آپس میں ڈھیروں باتیں کرتے لیکن کبھی کسی نے آج تک اس سے یہ سوال نہیں کیا تھا جو اس وقت ڈاکٹر فصیح حسن کے لبوں پر تھا۔

ہی پھڑک اٹھی تھی۔ سوکھٹ سے ذہن میں آئے شعر کو اس نے فٹ سے سنا ڈالا۔

فائزہ جو پشت پر پھیلے گھنے سیاہ بالوں کو برش سے ہلکے ہلکے سلجھاتے ہوئے ٹی دی دیکھنے میں محو تھی بری طرح تپ گئی اور ہاتھ میں پکڑا برش اسے کھینچ مارا۔

بلال جو اس کے عزیز از جان بالوں کو نشانہ بنانے کے بعد اس کی طرف سے کسی حملے کا منتظر تھا فوراً ہی جگہ سے ہٹ گیا لیکن شومی قسمت برش پھر بھی بڑی زور سے اس کی پشت پر آکر لگا تھا۔ اصل میں ایک دوسرے پر حملہ کرنے اور بدلے لینے کی دونوں کو ہی اتنی عادت ہو چکی تھی کہ ایک دوسرے کے رد عمل کو سمجھنا ان کے لیے مشکل نہیں رہا تھا۔ فائزہ نے بھی حملہ کرتے وقت پورا خیال رکھا تھا کہ برش کے وار سے بچنے کے لیے بلال یقیناً بائیں طرف پناہ لے گا کیونکہ دائیں جانب تو بڑا سا ایکوریم رکھا تھا۔ اس لیے اس نے بجائے برش کو سیدھا پھینکنے کے بائیں جانب ہی پھینکا تھا اس کی اس عقلمندی کا نتیجہ بڑا خاطر خواہ نکلا تھا اور اب بلال آفتاب ہائے وائے کرتا دہائیاں دے رہا تھا۔ اس کے نالے و فریاد اتنے بلند تھے کہ مجبوراً کونے کے صوفے پر بیٹھی کتاب میں غرقِ نزہتہ کو بھی سر اٹھا کر دیکھنا ہی پڑا۔

”کیا مصیب آن پڑی ہے تم پر؟“ یوں ڈسٹرب ہونے پر لہجہ خود ہی پھاڑ کھانے والا ہو گیا تھا۔

”ظلم ہے نا انصافی ہے بلکہ اندھیر ہے۔ یہاں آپ کی ناک کے نیچے آپ کے لاڈلے بھائی پر قاتلانہ حملہ کیا گیا اور آپ بجائے یہ کہ کوئی دوا دارو کریں مزید شتر چلا رہی ہیں۔ تف ہے آپ کی ڈاکٹری پر۔“

”لاڈلا بھائی، کون لاڈلا بھائی؟“ ساری درد بھری داستان سے ہٹ کر نزہتہ کی سوئی ”لاڈلے بھائی“ میں اٹک گئی۔

”ارے نزی آپنی! چوٹ مجھے لگی ہے اور دماغ آپ کا کام نہیں کر رہا۔ میرے یعنی بلال آفتاب کے علاوہ اور کون آپ کا لاڈلا بھائی ہو سکتا ہے۔“ اپنی تکلیف کو بھولے بلال اب اپنی بہن کی یادداشت واپس لانے کی فکر میں تھا۔

”اچھا اچھا“ تم ہو میرے لاڈلے بھائی۔ ٹھیک ہے کہتے ہو تو مان لیتی ہوں۔ اب مجھے پڑھنے دو۔“ بے نیازی سے کہتی نزہتہ آفتاب شانے اچکا کر ایک بار پھر اپنی کتاب میں غرق ہو گئی۔ البتہ ہونٹوں پر ایک دبا دبا سا تبسم تھا جسے چھپانے کو چہرہ مکمل طور پر کتاب میں جھکا لیا گیا۔

ادھر سے مایوس ہو کر بلال نے توجہ واپس دشمن کی طرف موڑ لی۔ جس کی بیٹی خوشی کے مارے نگلی ہی پڑ رہی تھی۔

”اندر کر لو اپنے دانت ورنہ نکل کر گر جائیں گے اس عمر میں دوسرے دانت نکلتا بھی ممکن نہیں۔“ جل کر مشورہ دیا۔

لیکن ادھر بھی فائزہ تھی سو مشورے کا اثر الٹا ہوا اور دانت پہلے سے بھی کہیں زیادہ باہر نکل آئے۔

بلال آفتاب نے جب دیکھا کہ اس کی دال یہاں گھنے والی نہیں تو وقتی طور پر پسپائی کا فیصلہ کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ البتہ جاتے جاتے منہ پر ہاتھ پھیر کر اسے ”دیکھ لوں گا“ کی مخصوص دھمکی دینا نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

آفتاب شیخ اور مہتاب شیخ دو ہی بھائی تھے بڑے آفتاب شیخ پیٹے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے ان کی وائف علیزہ آفتاب بھی ڈاکٹر تھیں۔ دونوں کی پسند کی شادی تھی اور مزاج کی ہم آہنگی کے نتیجے میں شادی کے بعد بھی یہ محبت برقرار رہی تھی۔ مہتاب شیخ نے ایم بی اے کے بعد اپنا ذاتی بزنس کرنے کو ترجیح دی تھی ان کی بیگم عازنہ کو ان کی والدہ خود اپنی پسند سے بیاہ کر لائی تھیں۔ عازنہ واقعی اتنی حسین و جمیل تھیں کہ جو ان کو ایک بار دیکھتا ہل بھر کے لیے تو ضرور مبہوت رہ جاتا۔ علیزہ آفتاب کی پروقاری شخصیت بھی ان کے سامنے ایک لمحے کے لیے ماند پڑ جاتی تھی۔ لیکن خود عازنہ کو اپنی شکل و صورت کا کوئی غور نہ تھا شاید اس کی وجہ ان کے حالات رہے ہوں ان کے والدین بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے اور رشتے کے ایک چچا نے ان کی پرورش کی تھی چچا کے گھر بچوں کی پوری

ایک فوج تھی لہذا عازرہ کے حصے میں چچا چچی کا بچا کچھا پیار بھی نہ آپاتا۔ سخت محنت جھڑکیوں اور طعنوں میں پروان چڑھی عازرہ کے اندر کسی غرور کے سراٹھانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا سرال آکر بھی ان کے مزاج کی سادگی اور عاجزی برقرار رہی حالانکہ یہاں ہر ایک ان کے حسن اور سلیقہ شکاری کے گن کا گاتا تھا۔

مہتاب شیخ تو گویا بیوی کے دیوانے تھے لیکن شاید ان کی فطرت ہی اتنی اچھی تھی کہ بڑی سے بڑی چیز پا کر بھی ان کا نفس نہ پھولا اور وہ ہمیشہ خدا کا شکر بجالاتی رہیں ان کے ہاں جوائنٹ فیملی سسٹم تھا لیکن ساس کی بہترین انتظامی صلاحیتوں اور دونوں جھٹانی دیوارنی کے سلجھے ہوئے مزاجوں کی وجہ سے کوئی مشکل پیش نہ آئی عازرہ کی شادی سے کئی سال پہلے آفتاب شیخ اور علیزہ کی شادی ہوئی تھی بلکہ شادی کے وقت ان کے تین بچے دانیال، نزہہ اور بلال موجود تھے چوتھی اولاد فیہ ان کی بیٹی فائزہ کے ساتھ کی تھی۔

زندگی کے دن بڑے پرسکون اور راحت بھرے گزر رہے تھے کہ ایک حادثے نے اس گھر کی خوشیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا مہتاب شیخ ایک دن آفس گئے تو واپس گھر نہ آ سکے ڈاکٹروں کے مطابق بڑا شدید ہارٹ ایٹک ہوا تھا جسے وہ سہار نہ سکے اور زندگی ہار گئے عازرہ کی تو گویا دنیا ہی اجڑ گئی تھی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تین سالہ فائزہ کو گود میں بٹھائے سب کے چہرے نکلتی رہتیں نہ جانے کب کوئی انہیں اس گھر سے نکال دے۔ یہ خوف ہر وقت ان کے اعصاب پر چھایا رہتا چچا چچی تو بمشکل دو گھڑی کے لیے اکر چلے گئے تھے۔ اگر اس گھر سے نکال دی گئیں تو کہیں کوئی سہارا دینے والا بھی نہیں تھا۔ ان کے اس خوف کو ان کی ساس نے باوجود شدید صدمے میں ہونے کے بھی بھانپ لیا تھا لہذا ایک دن بڑی بہو اور بیٹے کو سانسے بٹھا کر عازرہ کو اچھی طرح تشفی کروادی تھی کہ ان کا اب بھی اس گھر پر اتنا ہی حق ہے جتنا مہتاب کی زندگی میں تھا۔

آفتاب شیخ نے بھی ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر اعلان کیا تھا کہ آج سے عازرہ ان کی چھوٹی بھانج نہیں بلکہ بہن ہیں جن کی ہر ذمہ داری وہ اٹھانے کو تیار ہیں علیزہ نے بھی ان کے اس فیصلے کی تائید کی تھی عازرہ کتنی ہی دیر ان کی محبتوں

کا احساس کر کے روتی رہی تھیں ایسے ہی تو ان کا جیون ساتھی انہیں بچ منجھار میں چھوڑ کر نہیں گیا تھا انہیں بھی خبر تھی کہ ان کے بعد ان کی بیوی اور بیٹی کی خبر گیری دل و جان سے کرنے والے موجود ہیں۔

آفتاب شیخ نے جب چھوٹے بھائی کے کاروبار کی طرف توجہ کی تو ہٹا چلا کہ سب کچھ تباہ ہو چکا تھا اور شاید اسی ٹینشن نے مہتاب شیخ کی جان لے لی تھی بڑنس سنبھالنا یوں بھی آفتاب شیخ کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور اتنے دگرگوں حالات میں تو کچھ بھی کرنا محال تھا۔ انہوں نے عازرہ سے اجازت لے کر باقی ماندہ سرمایہ سمیٹ لیا اور رقم فائزہ کے نام سے بینک میں جمع کروادی عازرہ اپنے سرال والوں کی اعلیٰ ظرفی کی دل سے قائل تھیں جہاں انہیں اور ان کی بیٹی کو ایک پل بھی بے آسرا ہونے کا خیال نہ آتا تھا بلکہ فائزہ تو جیٹھ کے چاروں بچوں سے بھی زیادہ لاڈ پیار میں پل رہی تھی۔

☆☆☆

”آہا! عباد بھائی آئے ہیں۔ خیر سے کیسے رونق بخش دی ہمارے غریب خانے کو۔“

گھر میں داخل ہوتے عباد علی کو دیکھ کر بلال نے بڑے جوش سے ہانک لگائی اندر کپڑوں پر استری کرتی نزہہ کے کانوں تک بھی آواز پہنچی تھی۔ بے اختیار ہی اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی۔

”کیا فضول حرکت ہے یہ۔“ فوراً ہی اپنے دل کو ڈپٹ کر وہ دوبارہ تندہی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ عباد علی اس کے لیے کوئی اجنبی نہیں تھا۔ لڑکپن سے جوانی تک کی منزلیں ان لوگوں نے ساتھ ساتھ ہی گزری تھیں لیکن دل کی دھڑکنوں کو تال بدلنے کا یہ ہنر عباد نے نہ جانے کب چپکے سے سکھا دیا تھا کہ اب گستاخ دل نزہہ کے پہلو میں رہ کر بھی اس سے بغاوت پر تلا ہوا تھا۔

نزہہ جن دنوں نويس جماعت میں پڑھتی تھی تب ہی عباد کی فیملی ان کے پڑوس میں آکر آباد ہوئی تھی۔ چھوٹی سی فیملی تھی عباد کے امی ابو اور اس سے ایک سال بڑی طوبی

رہنا پسند تھا اور اس کے انداز بتاتے تھے کہ وہ ایک دن بڑا آرٹسٹ بن کر ہی رہے

۴۔

ایف ایس سی کے امتحانوں سے فارغ ہوتے ہی نزیبہ نے تو ایک کمپیوٹر سینٹر جوائن کر لیا تھا جب کہ عباد حسب معمول گاؤں چلا گیا تھا۔ ان کی فیملی کی یہ روٹین تھی کہ جیسے ہی موقع ملتا وہ گاؤں کی طرف بھاگتے ان لوگوں کی کمی تو سب کو ہی محسوس ہوتی تھی لیکن نزیبہ کا کیونکہ سب سے زیادہ آنا جانا تھا اس لیے وہ سب سے زیادہ بور بھی ہوتی ان ہی بور دنوں میں نزیبہ کو ایک دن گاؤں سے آنے والے عباد کے فون نے ہلا ڈالا۔

نزیبہ! بابا چلے گئے۔“ وہ فون پر ہی رونے لگا۔

نزیبہ کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے جتنے کرب سے عباد نے اسے پکار کر یہ خبر سنائی تھی وہ پورا کا پورا دکھ اس کے دل میں اتر گیا تھا۔

”مما! پاپا! دادی جان!“ چیخ چیخ کر اس نے پورا گھر ہلا دیا تھا چٹھی کا دن ہونے کی وجہ سے سب لوگ گھر میں ہی موجود تھے نزیبہ کی چیخوں پر سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔

”کیا ہو گیا نزی بیٹا؟“ آفتاب صاحب نے بڑھ کر اس کو گلے سے لگالیا۔

دانیال بھائی نے ریسور لے کر اپنے کان سے لگالیا جو ابھی تک اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا لیکن دوسری طرف لائن کٹ چکی تھی۔

”کیا ہوا ہے نزی! کس کا فون تھا۔ کچھ تو بولو۔“ سب کے اصرار پر اس نے ہنگیوں کے درمیان بمشکل احسان انکل کی موت کی خبر سنائی سب ہی سن کر افسردہ ہو گئے۔ آفتاب صاحب اسی وقت نوابشاہ جانے کی تیاری کرنے لگے نزیبہ ان کی بیگم اور عائزہ ان کے ساتھ جاری تھیں دادی جان کو بڑھاپے کی وجہ سے اتنی دور لے جانے کے لیے وہ لوگ تیار نہیں تھے۔

احسان صاحب کی اس اچانک موت کا اثر تو ان کے پورے گھر پر ہوا تھا لیکن عباد کی حالت سب سے تباہ تھی اس کا بکھرا بکھرا وجود ملگبجا حلیہ سرخ آنکھیں نزیبہ سے

آپا چونکہ دونوں ہی فیملیز ملتسار اور سادہ مزاج تھیں اس لیے بہت جلد ان کے درمیان دوستانہ مراسم قائم ہو گئے عباد بھی اس سال ناکھ کا ایگزٹام دے رہا تھا جب کہ طوبی میٹرک میں تھی۔ تینوں اکثر ایک جگہ بیٹھ کر کمپائن اسٹڈی کرتے تھے لہذا دوستی بھی تیزی سے بڑھتی گئی البتہ جتنی نزیبہ پڑھائی میں تیز اور سنجیدہ تھی وہ دونوں بہن بھائی نہ تھے شاید اس کی وجہ فیملی بیک گراؤ تھا نزیبہ کے امی پاپا دونوں ڈاکٹر تھے اس لیے اپنی اولاد کی تعلیم پر بھی بہت توجہ دیتے تھے جب کہ عباد کی امی ابو دیہاتی پس منظر رکھتے تھے ان کی نواب شاہ کے قریب زمینیں تھیں جس کی آمدنی پر ان کا گزارہ تھا۔ کراچی آنے کا فیصلہ انہوں نے بس شوق میں کر لیا تھا کیونکہ ان کے اکثر رشتے دار گاؤں چھوڑ کر شہروں میں اٹھ آئے تھے سوانہوں نے بھی پیچھے رہنا گوارا نہ کیا۔

اگرچہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم دلوار ہے تھے لیکن ان پر سختی نہیں تھی ان کے خیال میں ان کے بچوں کو کون سی نوکریاں کرنی تھیں جو وہ انہیں پڑھائی کو ہوا بنا کر ڈراتے رہتے سوچ کا یہ فرق بھی دونوں خاندانوں کے تعلقات کے درمیان آڑ نہ بنا اور اول روز سے ہونے والی دوستی گزرتے وقت کے ساتھ پختی ہی رہی عباد کے والد احسان علی تو اکثر و بیشتر زمینوں پر ہی رہتے تھے لہذا اکثر ان کے گھر کی بھی بہت سی ذمہ داریاں ڈاکٹر آفتاب اٹھالیا کرتے تھے۔

میٹرک میں تو عباد نے جوں توں بی گریڈ لے ہی لیا تھا لیکن ایف ایس سی کے رزلٹ سے اسے بالکل بھی اچھی توقعات نہیں تھیں طوبی آپا تو میٹرک کے بعد ہی گھر بیٹھ گئی تھیں اور اب گھر بیٹھ کر اپنی سلیقہ شعاری سے چار چاند لگاتی رہتی تھیں نزیبہ کا معاملہ البتہ مختلف تھا اسے پڑھائی کا جو شوق وراثت میں ملا تھا وہ اسے نکلا بیٹھنے ہی نہ دیتا تھا اسے پوری امید تھی کہ وہ اے ون گریڈ ہی لے گی اپنے امی پاپا کی طرح وہ بھی ڈاکٹر ہی بننا چاہتی تھی بلکہ شاید ان کی پوری فیملی کو ڈاکٹر ہی بننے کا شوق تھا۔ دانیال بھائی تو میڈیکل میں پہنچ ہی چکے تھے فائزہ اور فیصہ کے ارادے بھی اسے یہی نظر آتے تھے البتہ بلال کا مزاج کچھ مختلف تھا اسے رنگوں اور برش کی دنیا میں کم

میں باپ مرا ہے۔ لیکن کوئی کندھا نہیں جس پر سر رکھ کر میں اپنے آنسو بہا سکوں۔“
ضبط کی انتہا پر پہنچا سرخ آنکھیں لیے وہ اس سے سوال کر رہا تھا۔

عباد! میں تمہاری دوست ہوں نا مجھے دے دو اپنے آنسو۔“ نزہہ نے یوں
جوت سے چور لہجے میں پکارا تھا کہ عباد علی سسک اٹھا اس کی آنکھوں نے دریا بہا دیا اور
نزہہ کا آنکھل سمندر بن گیا تھا جس نے اس کا ہر آنسو اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔
اور شاید وہی لمحہ تھا جو محبت کی دیوی نے بنا دستک دیے ان کے دلوں پر محبت کو
اتارا تھا لیکن دونوں ہی انجان تھے۔

☆☆☆

”دیکھو عباد! میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ تمہیں آگے پڑھنا ہے تو بس پڑھنا
ہے۔“

”لیکن نزی! تم یہ بھی تو دیکھو کہ میرے مارکس کتنے کم آئے ہیں۔ مجھے کہیں
ایڈمیشن نہیں ملے گا۔“ عباد نے عاجز آ کر کہا۔

پچھلے آدھا گھنٹہ سے عباد اور نزہہ کے درمیان اس موضوع پر بحث ہو رہی
تھی۔ دو دن پہلے ہی ان کا ایف ایس سی کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا نزہہ نے حسب توقع
اے ون گریڈ ہی لیا تھا جب کہ عباد بمشکل پاس ہوا تھا۔ عباد کا دھیان یوں بھی پڑھائی کی
طرف اتنا زیادہ نہیں تھا اور اب احسان انکل کے انتقال کے بعد تو اس نے جیسے طے ہی
کر لیا تھا کہ تعلیم کو خیر باد کہہ کر اپنی زمینیں سنبھالے گا دوسری طرف نزہہ تھی جس کی
زندگی میں تعلیم ایک لازمی جز کی طرح شامل تھی عباد کے ہزار انکار کے باوجود بھی وہ
مسئل اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح وہ راضی ہو جائے۔

”عباد! میری کتنی انسلٹ ہوگی جب میں اپنی دوستوں کو بتاؤں گی کہ میرا
بیٹ فرینڈ انٹر تک پڑھا ہوا ہے۔ پلیز مان جاؤ نا میری بات اچھا ایسا کرو بی کام کر لو
پرائیوٹ۔“ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر التجا کی تھی۔

”یار! یہ تمہارے نزدیک ڈگری کی اہمیت اتنی زیادہ کیوں ہے۔ چلو تمہاری

دیکھی نہ جاتی تھیں ماما پاپا اور عازہ چچی تو جنازے میں شرکت کر کے دوسرے ہی در
واپس چلے آئے تھے۔ البتہ نزہہ کو طوبی نے روک لیا تھا۔

”پلیز انکل! نزی کو یہیں رہنے دیں۔“ آنسو بہاتی آنکھوں سے جب ار
نے درخواست کی تو آفتاب شیخ انکار نہ کر سکے۔

نزہہ بھی ان کے غم میں یوں الجھی تھی کہ اسے اپنے کمپیوٹر کورس کی بھی کوئی فکر
نہیں رہی تھی۔

سوئم کے دوسرے دن صبح فجر کی نماز سے فارغ ہو کر وہ حویلی کی پھت پر چل
آئی صبح واک پر جانا اس کی عادت تھی لیکن یہاں ایک اجنبی گاؤں میں اکیلے نکلنے کی
اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی اور گھر والے غم سے اتنے نڈھال تھے کہ ان سے کچھ کہنا اس
نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔

چھت پر ٹھہرتے ہوئے وہ جب دوسرے کونے پر پہنچی تو حیران رہ گئی۔ عباد
گھٹنوں میں سر دیے ٹھنڈے فرش پر بیٹھا تھا۔ وہ بھی اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ
گئی۔

عباد نے ایک جھپٹکے سے سر اٹھایا۔ ”نزی تم!“
نزہہ نے دیکھا اس کی آنکھیں سرخ انگارا ہو رہی تھیں اس سے زیادہ دیر نظر
ملانے کی تاب اپنے اندر پیدا نہ کر سکی۔

”اٹھو عباد! کیا حال کر لیا ہے اپنا۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا۔
”نہیں نزی! پلیز مجھے یہیں بیٹھنے دو۔ آنسوؤں نے میرے اندر انکارے بھر
دیے ہیں شاید یہاں کی ٹھنڈک ہی کچھ سکون دے دے میرے دل کو۔“

”عباد! اگر تم یوں حوصلہ ہارو گے تو آئی اور طوبی کو کون دیکھے گا۔“ نزہہ نے
اسے سمجھانا چاہا۔

”یہی باتیں ہیں جو مجھے رونے بھی نہیں دیتیں تم بتاؤ نزی کیا دکھ صرف
عورتوں کو ہوتا ہے کیا مردوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا مجھے دیکھو میں بھی دکھی ہوں میرا

جلدی جلدی اسے ہدایت دیتی وہ خود طوبی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

”پانی، پانی، پانی، آف مر گیا۔ کوئی ہے.....؟“

”طوبی کے برابر بیٹھ کر باتیں کرتی نزیبہ عباد کی چیخ و پکار پر گھبرا کر کھڑی ہو گئی وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی عباد کے گاؤں پہنچی تھی۔

عباد کی فیملی آج کل طوبی کی شادی کے سلسلے میں گاؤں میں ہی مقیم تھی شہری بود باش اختیار کرنے کے باوجود وہ لوگ گاؤں کی مٹی سے اپنا رشتہ بڑی مضبوطی سے قائم رکھے ہوئے تھے۔ ہر خوشی اور غم اپنی آبائی حویلی میں ہی مناتے تھے سوطوبی کی شادی بھی یہیں سے کی جا رہی تھی نزیبہ کے فرسٹ ایگزام ہو رہے تھے لہذا وہ مایوں میں شریک نہ ہو سکی تھی اس کی وجہ سے فائزہ اور فیجہ کا بھی پروگرام ملتوی ہو گیا تھا چنانچہ جیسے ہی وہ آخری Viva دے کر فارغ ہوئی تینوں نے گاؤں جانے کی ضد شروع کر دی می پاپا اور عازہ چچی کا پروگرام تو عین بارات والے دن ہی آنے کا تھا اس لیے وہ لوگ بلال کے ساتھ گاؤں پہنچ گئی تھیں۔ جب وہ حویلی پہنچے تو سب لوگ دولہا کے گھر مہندی لے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

فائزہ فیجہ اور بلال تو فوراً ہی خود بھی ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن نزیبہ جو پہلے ہی امتحانوں کی وجہ سے تھکی ہوئی تھی اور اب اتنا لمبا سفر کر کے آنے کی وجہ سے بالکل ہی نڈھال ہو رہی تھی طوبی کے پاس رک گئی اس کی اور طوبی کی اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ تھی اور اب بھی وہ اس کے پاس بیٹھی بڑی شد و مد سے گفتگو کر رہی تھی کہ عباد کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ عباد مہندی کے ساتھ نہیں گیا تھا کیونکہ اسے ابھی کل بارات کے لیے بہت سے انتظامات کرنے تھے ملازمہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی انہیں بتا کر گئی تھی کہ اس نے ڈائننگ روم میں کھانا لگا دیا ہے۔

”عباد صاحب بھی وہیں بیٹھے ہیں آپ کو بھی بلارہے ہیں۔“ لیکن نزیبہ نے اس پیغام کو ان سنی کر دیا تھا وہ عباد سے بہت ناراض تھی کیونکہ اس نے اسے وعدے کے

خاطر کہیں سے جلی ڈگری بٹالیتا ہوں تھوڑے پیسے بھی خرچ ہوں گے لیکن تم خوش ہو جاؤ بلکہ ایسا کرنا کہ ڈگری اپنے ہی پاس رکھ لینا اور جب کوئی دوست ملنے آئے تو اسے درشن کرو دینا کہ دیکھو یہ بی کام کی ڈگری ہے جو میرے بیٹ فرینڈ عباد علی نے بڑی محنت سے حاصل کی ہے۔“

عباد کے اس انداز پر نزیبہ غصے سے واک آؤٹ کرنے لگی تو وہ جھٹ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”ہٹو جانے دو مجھے جب میری بات نہیں سنی تو کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے روکنے کی۔ روٹھے لہجے میں کہتی نزیبہ نے اس کا ہاتھ جھٹک کر باہر نکلنے کی کوشش کی تو عباد نے فوراً ہی اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”اچھا بابا جیسا تم چاہو گی ویسا ہی ہو گا۔ بھجوا دوں گا میں پرائیوٹ بی کام کا فارم اب تو موڈ ٹھیک کر لو غضب خدا کا ابھی تو صرف میڈیکل میں ایڈمیشن لینے جا رہی ہو تو تمہارا یہ عالم ہے جب پوری ڈاکٹر بن جاؤ گی تو مجھ غریب پر ایم بی اے کرنے کی شرط لگا دو گی۔“

نزیبہ نے ایک مسروری نگاہ جھنجھلاتے عباد پر ڈالی اور دل ہی دل میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”ہاں عباد علی! میں چاہتی ہوں تم ایک تعلیم یافتہ اور مہذب شخص کے روپ میں ڈھل جاؤ تاکہ جب کوئی تمہارا اور میرا موازنہ کرے تو تم میں کوئی کمی محسوس نہ ہو ہمارے درمیان دوستی کے علاوہ جو ایک اور ان کہا رشتہ ہے اسے کسی مضبوط ڈور سے بائند کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تمہارا اور میرا سوشل اسٹیٹس کسی بھی طرح مختلف نہ ہو۔“

”اے.....! کہاں گم ہو گئیں۔؟“ عباد نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ چونک کر اپنے خیال سے باہر نکلی۔

”کچھ نہیں چلو میرے ساتھ گھر میں تمہیں اور طوبی کو لینے آئی تھی می نے بلوایا ہے۔ میری کامیابی کی خوشی میں آج گھر میں کچھ ہلاکلا کرنے کا پروگرام ہے۔“

مطابق بی کام کا امتحان نہیں دیا تھا طوبیٰ نے اصرار کر کے نہ بلوایا ہوتا تو وہ شادی میں ہر گز شریک نہ ہوتی لیکن اب مجبوراً آگئی تھی تو عباد سے بچنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں طوبیٰ کا کمرہ ہی سب سے اہم پناہ گاہ تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہاں کوڑا مرد قدم نہیں رکھے گا۔ ان کے خاندان کا رواج تھا کہ باپوں بیٹھنے کے بعد دلہن کا کھل پردہ کروایا جاتا تھا یہاں تک کہ سکے بھائی اور باپ کو بھی دلہن کا چہرہ شادی سے پہلے دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔

عباد کی چیخ و پکار نے وقتی طور پر اسے اپنی ناراضی بھلا دی وہ بھاگ کر ڈانگہ روم میں پہنچی تھی۔ جہاں عباد ابھی تک مسلسل ہائے دائے کر رہا تھا۔

”کیا ہو گیا عباد! خیریت تو ہے؟“ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

”اف بہت تیز مرچیں ہیں سالن میں ذرا پانی تو دینا۔“ لہجے میں بڑی چارگی سمو کر التجا کی گئی۔

”حد ہوتی ہے عباد! بالکل سامنے تو پڑا ہے پانی کا جگ اور گلاس یہ نہیں کہ خوا لے کر پی لو۔ اتنا شور مچا رکھا ہے جیسے پتا نہیں کیا مصیبت آگئی ہو۔“

”بڑبڑاتے ہوئے نزہہ نے گلاس بھر کے پانی اس کی طرف بڑھایا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے عباد نے گلاس کے بجائے اس کی کلائی تھام لی۔

”مصیبت تو آگئی تھی نزی ڈیر! تم چار گھنٹے سے یہاں پہنچی ہوئی ہو اور اب تک مجھے اپنے دیدار سے محروم رکھا ہوا تھا۔“

”اف چھوڑو میرا ہاتھ کپکے چار سوئیس ہو تم۔ باتیں ہزاروں بنا لیتے ہو۔ لیکن بات کوئی نہیں مانے۔“ نزہہ نے چڑ کر اپنا ہاتھ چیرنے کی کوشش کی۔

”ایک شرط پر چھوڑ دوں گا ہاتھ یہاں میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔“

”ارے ایسے ہی کھالوں کھانا میں تو انتظار کر رہی ہوں طوبیٰ کے سسرال۔ واپسی میں دلہن کے لیے کھانا بھیجا جائے گا میں تو وہی کھاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے بیٹھ جاتی ہوں کیا یاد کرو گے۔“ انداز بڑا احسان جتانے والا تھا عباد اس کی اس ادا پر مسکرا کر رہ گیا۔

”ناراض ہو؟“ لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا تھا۔

”کیوں؟ میں کیوں ہونے لگی تم سے ناراض۔ میرا تمہارا کیا واسطہ ہے میری بلا سے تم کچھ بھی کرتے رہو پڑھو نہ لکھو بس یہاں بیٹھ کر اپنے مزارعوں پر رعب جھاتے رہو۔“ نہ نہ کر کے بھی وہ اس پر اپنی خفگی کی وجوہات ظاہر کر گئی تھی۔ عباد بھی سمجھ گیا کہ امتحان نہ دینے کی خبر ہو گئی ہے اس لیے اتنی غصے میں ہے۔

”دیکھو نزی! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو جب پڑھائی کی طرف میری دلچسپی نہیں ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہم جدی پشتی زمین دار لوگ ہیں ہمارے خون میں اپنی زمینوں کی محبت رچی ہوئی ہے۔ میں بھی اپنے اصل سے نہیں ہٹ سکتا مجھے یہ سب اچھا لگتا ہے تمہاری خواہش پر میں نے کوشش کی تھی کہ دلچسپی لوں پڑھنے میں لیکن نہ اکاؤنٹنگ میرے بس کا روگ ہے اور نہ ہی بیکنگ انکناکس تو بالکل ہی میرے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہے اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ اگر میں تم سے کہوں کہ میڈیکل کی موٹی موٹی کتابیں چھوڑ کر کھیتوں میں فصل کی کٹائی میں حصہ لو تو کیا تم کو لوگی یہ سب نہیں تا تو بس میں بھی نہیں کر سکتا بی کام دی کام۔“ اپنے تئیں اہم دلیل دے کر وہ اسے ٹال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

نزہہ نہ جانے اس کی بات سمجھی یا نہیں لیکن خاموش ہو گئی۔

”دیکھو! یار میں جو ہوں جہاں ہوں جیسا ہوں کی بنیاد پر مجھے قبول کر لو یوں کی محبت میں شریں ورطیں کچھ اچھی نہیں لگتیں۔“ اب اس کا لہجہ کچھ شرارتی ہو گیا تھا۔

”اوہ! شاید طوبیٰ مجھے آواز دے رہی ہے۔“ نزہہ کے اندر اس کے اس لئے لہجے کو سہنے کی تاب نہ تھی سو بہانہ بنا کر اٹھ گئی۔

پچھلے عباد اس کے اس گھبرائے انداز اور جھکی پلکوں سے محفوظ ہو کر بڑے لہر طریقتے سے مسکرایا اور منگٹانے لگا۔

نگاہوں میں میری صورت ہے تیری
زندگی یہ میری امانت ہے تیری
دھڑکتے اس دل میں محبت ہے تیری
محبت یہ تیری عبادت ہے میری

☆☆☆

نزیہہ آپ! آپ کو بھائی بلا رہے ہیں باہر۔“

بچی سنوری مریم نے آکر پیغام دیا تو نزیہہ جو بیٹھی سندھی زبان میں گائے
جانے والے شادی بیاہ کے مخصوص مدھر اور میٹھے نغموں سے لطف اندوز ہو رہی تھی اٹھ کر
باہر کی جانب چل دی آج وہ لوگ ڈاکٹر نائلہ کی بہن کی شادی میں شرکت کرنے آئے
ہوئے تھے یوں تو مختلف شفتوں میں ان میں سے ہر ایک کی باری باری ڈیوٹی ہوتی تھی
لیکن اسپتال کے مالک احمد عثمانی صاحب نے شادی میں شرکت کے لیے ان لوگوں کو چند
گھنٹوں کی خصوصی اجازت دے دی تھی۔ ان کی عدم موجودگی میں ذمہ داریاں سنبھالنے
کے لیے پیرامیڈیکل اسٹاف موجود تھا۔ کسی ایمرجنسی کی صورت میں ڈاکٹر فصیح نرس سے
کہہ آئے تھے کہ موبائل پر رابطہ کر لے اس وقت مریم نے اسے ڈاکٹر فصیح کا پیغام دیا
وہ یہ بھی سمجھی کہ شاید اسپتال سے کوئی فون آیا ہوگا۔

”یس ڈاکٹر فصیح!“ زنانہ حصے سے نکلنے ہی وہ اسے سامنے کھڑے نظر آئے

تھے۔

”ارے بھی اتنی فارل کیوں ہو رہی ہیں۔ شادی کا گھر ہے اور آپ نے انداز
بالکل ہاسپٹل والا اپنایا ہوا ہے۔“ انہوں نے ڈل گولڈن جارجٹ کے سوٹ پر کانولا
میں ہمیشہ موجود رہنے والی سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیوں سے سجے اس کے سر اپنے کو دیکھتے
ہوئے ٹوکا۔ آج بھی اس نے روزانہ جیسا ہی حلیہ بنا رکھا تھا۔

”سوری.....! میں سمجھی ہاسپٹل سے کوئی کال آئی ہے۔ اس لئے آپ نے بلا

ہے۔“ اس نے جلدی سے وضاحت کی۔

”نہیں کال نہیں آئی بلکہ میں آپ کو کچھ دینا چاہتا تھا۔ اس لیے بلوایا تھا انہوں
نے ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

”کیا ہے اس میں؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔

”گجرے چوڑیاں تو آپ کبھی پہنتی نہیں ہیں۔ میں نے سوچا آپ کو یہ گجرے
ہی پہنچا دوں۔“ انہوں نے کچھ شوشی سے کہا۔

دوسری طرف نزیہہ کے اندر جیسے کوئی طوفان آگیا تھا۔

”سوری میں گجرے بھی نہیں پہنتی۔“ نہایت خشک لہجے میں کہہ کر وہ اندر کی
طرف مڑ گئی تھی۔ دوسری طرف ڈاکٹر فصیح اس کے لہجے کی تبدیلی کو محسوس کرتے اپنی جگہ سن
ہو گئے۔

آخر کیا پر اہلم تھا اس لڑکی کا یوں تو سب سے بے تکلف ہو کر ملتی تھی۔ لیکن
جیسے ہی کوئی اس کے تھوڑا قریب ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ تو سنگلاخ چٹانوں کی سی سختی
لہجے میں سولیتی تھی۔

☆☆☆

میں نے اپنے ہاتھوں

دل کی کوکھ میں اتر کر

خود کو قتل کیا

لبو اچھل کر میری آنکھوں میں جا پڑا اور دل ایڑیوں میں

میں نے اپنی بجھتی آنکھوں میں

کتے ہی دم توڑتے عکس دیکھے

آنکھوں میں اترتی نمی نے رات کے اندھیرے میں نظر آئے گاؤں کے دھند
لے دھندلے منظر کو اور بھی دھندلا دیا تھا۔ آج جس طرح کا رویہ اس نے ڈاکٹر فصیح حسن
سے اپنایا تھا۔ اس پر خود اسے بھی افسوس تھا لیکن وہ کیا کرتی یوں لگتا تھا دل کی زمین
بالکل بخر ہو گئی ہو گا یوں کا پیغام دینے والا ہر شخص اسے اجنبی لگتا تھا۔

”مجھے معاف کر دیجئے گا ڈاکٹر فصیح! آپ بے شک بہت اچھے انسان ہیں لیکن میرے پتھر دل سے کوئی نہر نکالنا شاید آپ کے بس کی بات نہ ہو۔“

دل ہی دل میں وہ ان سے مخاطب تھی۔

نرم مزاج صلح جو گھور سیاہ آنکھوں والے ڈاکٹر فصیح واقعی ایسے تھے کہ کوئی بھی لڑکی ان کی تمنا کر سکتی تھی لیکن نزیبہ آفتاب لئے دل نے تو جیسے ہر تمنا کو خود سے جدا کر دیا تھا ورنہ شاید وہ کبھی اتنے اچھے شخص کو یوں نہ مایوس کرتی ایک انسان کی حیثیت سے وہ ان سے بہت متاثر بھی تھی ڈاکٹر فصیح گاؤں کے منشی کے بیٹے تھے جنہوں نے اپنی محنت اور جوانمردی سے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے شہر میں رہتے ہوئے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی تھی ان کا تعلیمی ریکارڈ اتنا شاندار تھا کہ انہیں یقیناً شہر میں ہی کوئی اچھی جاب مل جاتی لیکن وہ اپنے لوگوں کی خدمت کا جذبہ دل میں لیے اپنے گاؤں لوٹ آئے تھے گاؤں کے وڈیرے شاہ احمد عثمانی بڑے نیک دل انسان تھے انہوں نے ڈاکٹر فصیح کے جذبے کو بے حد سراہا تھا اور نہ صرف ان کی حوصلہ افزائی کی تھی بلکہ مالی امداد بھی کی تھی ان ہی کی مہربانیاں تھیں کہ ڈاکٹر فصیح آج اس لائق ہوئے تھے کہ اپنے چھوٹے سے کلینک کو دارالشفاء جیسے اسپتال کے درجے تک لے آئے تھے ابتداء میں تو وہ اکیلے ہی سب کچھ سنبھالتے تھے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور ذمہ داریاں بڑھتی گئیں ویسے ویسے وہ اپنے اسٹاف میں بھی اضافہ کرتے گئے پہلے سسٹر سارہ پھر ڈاکٹر نائلہ اور اب ڈاکٹر نزیبہ اور سسٹر عابدہ بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔

سسٹر سارہ تو ڈاکٹر فصیح کی طرح اسی گاؤں کی رہائشی تھیں جب کہ ڈاکٹر نائلہ اور سسٹر عابدہ قریبی شہر سے یہاں آئی تھیں نزیبہ کو پروفیسر عتیق نے اس ہسپتال کے بارے میں بتایا تھا ان ہی کے توسط سے اس نے یہاں جاب کی تھی اگرچہ اسے یہاں اتنی زیادہ تنخواہ یا مراعات حاصل نہیں تھیں لیکن نزیبہ کو بھی اس سے کوئی غرض نہیں تھی اس کا تو اصل مقصد کراچی سے فرار حاصل کرنا تھا سو وہ سب کے ہزار روکنے اور سمجھانے کے باوجود بھی یہاں چلی آئی تھی لیکن ماضی کی یادیں گویا اس کے تعاقب میں تھیں ہزار

دامن جھکتی لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی بھگی یاد آکر اس کے دامن سے لپٹ جاتی تھی۔

☆☆☆

”اف می! میری میچنگ کی چوڑیاں کہیں نہیں مل رہیں آپ نے دیکھی ہیں کہیں!“

نیک سک سے تیار آف وائٹ غرارہ جس کی موٹ اور قمیض کی آستینوں دامن اور گلے پر سرخ رنگ کی پٹی لگا کر خوبصورت کام کیا گیا تھا، پہنے نزیبہ جھنجھلائی پھر رہی تھی آج وہ لوگ بری لے کر دانیال بھائی کے سسرال جا رہے تھے نزیبہ مکمل طور پر تیار تھی لیکن اس کی میچنگ کی چوڑیاں عین وقت پر نہ جانے کہاں کھو گئی تھیں۔

نزی بیٹا! آپ کو سنبھال کر رکھنی چاہیے تھیں نا اپنی چیزیں اب عین وقت پر کیسے ملیں گی آپ کی چوڑیاں۔“ می نے الٹا اسی کو ذمہ داری کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

”می! میں نے ابھی یہیں ٹی وی ٹرالی پر لا کر رکھی تھیں سوچا تھا جاتے جاتے ہاتھ میں ڈال لوں گی پتہ نہیں کس بدتمیز نے چھپا دیں۔“ اب کے وہ روہانسی ہو گئی تھیں۔

”بلال! یہ تمہارا کارنامہ تو نہیں ہے؟“ می نے اپنا روئے سخن فوراً ہی بلال کی طرف موڑ لیا جو اطمینان کے ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا اور آتی جاتی فائزہ کی تیاریوں پر بھی وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی فقرہ اچھال دیتا تھا می کے یوں ڈائریکٹ ایک پر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”بائے گاؤمی! میں نے ان کی چوڑیوں کو دیکھا تک نہیں آپ بلا وجہ ہی مجھ پر شک کر رہی ہیں“ اس نے جلدی سے اپنے صفائی پتھر کرنے کی کوشش کی۔

”تو پھر کس پر شک کروں۔ دانیال اپنے کمرے میں ہے پچہ یہاں کوئی ہے نہیں۔ تم اور عباد بھی یہاں بیٹھے ہو اب میں عباد جیسے سنجیدہ بچے پر تو اس قسم کا شک کرنے سے رہی۔“ می نے ایک طرح سے اس کے مجھ ہونے پر مہر لگا دی۔

”یہ اچھا ہے۔ جو بدنام ہو اسی پر الزام لگاؤ۔“ بلال چڑ کر کمرے سے باہر

ایک بل کے لیے تو زبیہ بالکل مگمگ ہو گئی۔

کیا ہوا اچھے نہیں لگے؟“ اس کی خاموشی سے گھبرا کر عباد نے پوچھا۔

”نہیں بہت خوبصورت ہیں بلکہ اس سوٹ پر تو چوڑیوں سے زیادہ اچھے لگیں
مے تھینک یو عباد!“ جلدی جلدی کہتی وہ کنگن ہاتھ میں ڈالتی بیرونی دروازے کی طرف
بڑھ گئی تھیں۔

مہندی کی پوری تقریب میں زبیہ پر ایک سرشاری کی کیفیت طاری رہی تھی
گلاب اور موچے کے پھولوں سے اشقی خوشبو اور پھولوں کے لمس کے ساتھ کسی کی چاہت
کالمس محسوس کرتے ہوئے اس کی روح تک میں طمانیت اتر آئی تھی۔

☆☆☆

”خیریت ڈاکٹر زبیہ! آپ اس وقت یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟“

نہر کے شفاف پانی میں حیر ڈالے ہاتھ سے پانی کو ہلکورے دیتی وہ جانے کن
خیالوں میں گم تھی کہ ڈاکٹر فصیح کی آواز نے چونکا دیا۔

وہ اس کے پیچھے کھڑے حیرت سے سوال کر رہے تھے سورج کب کا غروب ہو
چکا تھا ماحول میں تاریکی در آئی تھی ایسے وقت جب عموماً لوگ اپنے گھروں کو لوٹ جاتے
ہیں زبیہ کا اکیلے یہاں نہر کے کنارے بے نیازی سے بیٹھنا انہیں حیرت میں ڈال گیا
تھا آج آف ہونے کی وجہ سے ہاسپٹل نہیں گئے تھے اور اس وقت بھی رات کا کھانا
کھانے کے بعد چہل قدمی کرنے نکلے تھے تو ان کی نظر زبیہ پر پڑ گئی تھی۔

زبیہ کو بھی ارد گرد کا ماحول دیکھتے ہوئے خوف محسوس ہوا۔

ہاسپٹل سے ڈیوٹی آف ہونے کے بعد وہ سنام کو یہاں نہر کے کنارے آکر
بیٹھ گئی تھی۔ یہ گوشہ اس کی سب سے زیادہ پسندیدہ جگہ تھی جہاں وقت گزرنے کا احساس
نہ ہوتا تھا آج بھی نہ جانے وہ کن خیالوں میں گم تھی کہ ارد گرد پھیلتی تاریکی کو محسوس
نہیں کر پائی۔

”چلیں میں آپ کو ہاسپٹل تک چھوڑ آؤں۔“ اسے خاموش کھڑے دیکھ کر

نکل گیا۔ می بھی اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں اب ان آخری لمحات
میں جب تقریباً سب ہی تیار ہو چکے تھے وہ زبیہ کی چوڑیوں میں الجھ کر اپنا وقت ضائع نہ
کرنا چاہتی تھیں۔

مایوس ہو کر زبیہ بھی وہیں ایک صوفے پر ٹپک گئی لیکن بیٹھنے کے ساتھ اس کی
نظر سامنے عباد کی طرف اٹھی تو اسے مسکراتے دیکھ کر تھلا گئی۔
”یہ تمہیں کیا ہوا ہے جو دانت باہر نکلے پڑ رہے ہیں۔“ اپنا غصہ نکالنے کے
لیے اس وقت وہی اسے ہاتھ لگا تھا۔

لیکن دوسری طرف عباد پر بھی کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ اطمینان سے بیٹھا مسکراتا رہا
پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔

”ایک بات بتاؤں زبی!“

”کیا.....؟“

”تمہاری چوڑیاں یہ رہیں۔“ اپنی پشت پر سے ہاتھ آگے لاتے ہوئے اس
نے زبیہ کے سامنے پھیلا دیا جس پر اس کی کانچ کی چوڑیاں دھری تھیں۔

”تم عباد یہ تم تھے بدتمیز ابھی می کے سامنے کیسے فرمانبردار بنے بیٹھے تھے اور
اپنی تعریفیں سن رہے تھے خواخواہ میرے معصوم بھائی کو ڈانٹ پلادی۔“ اس نے جھپٹ
کے اس کے ہاتھ سے چوڑیوں کا پکٹ چھیننا چاہا لیکن عباد نے فوراً ہی ہاتھ پیچھے کر لیا۔

”زبی! آج تم یہ مت پہنو!“ عجیب فرمائش تھی جسے سن کر زبیہ مزید چپ گئی۔
”کیا مطلب ہے تمہارا کیوں نہیں پہنوں اتنی چاہت سے اس سوٹ کی میچنگ
کی خریدی تھیں میں نے یہ پہوڑیاں۔“

”خریدی ہوں گی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ چاہت سے میں تمہارے لیے یہ لایا
ہوں۔“

نہ جانے کہاں سے برآمد کر کے موچے اور گلاب سے بنے کنگن اس نے زبیہ
کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

جسے تمہاری طلب رہی ہے
 اداس راتوں کا ہم سفر ہوں
 جسے خوشی کی رہی تمنا
 جو شب کے اندھیروں میں ڈھونڈتا ہے
 نشان تمہارے ہی راستے کا
 بدل دے شاید جو زندگی کو کسی بھی صورت
 یہ سارا منظر ہی خوف کا ہے
 ہر ایک لمحہ میں سوچتا ہوں
 تمہاری ہستی کے تابع رہ کر
 نہ جانے کیا کیا تم کروں گا
 نہ جانے کن کن کو انا کی خاطر
 میں شب کی ظلمت میں لوٹ لوں گا
 مگر میں تم سے جو دور جاؤں

جو دور جاؤں

تو جاؤں کیسے

تمہاری ہستی میرا مکاں ہے

لطم پڑھتے ڈاکٹر فصیح و رطہ حیرت میں تھے۔ یہ کارڈ ایک فائل تلاش کرتے
 ہوئے ملا تھا کارڈ اگر کسی لفافہ میں ہوتا تو وہ کبھی اسے نہ کھولتے لیکن سفید پھولوں سے سجا
 یہ ہاتھ ڈسے کارڈ جو اپنے اندر کافی اداسی سموئے ہوئے تھا انہیں چونکا گیا تھا۔ اور
 بال فائیکوں کے درمیان اس کی موجودگی بھی عجیب تھی وہ ایک بے اختیاری کی کیفیت میں
 تھا اس کارڈ کو کھول بیٹھے تھے۔

نزیہہ کے نام یہ کارڈ کسی عباد علی نے بھیجا تھا۔ اس ایک لطم کے علاوہ کارڈ پر
 کچھ نہیں لکھا تھا البتہ عباد علی کے دستخط کے نیچے 2 فروری کی ڈیٹ اس بات کو ظاہر کر رہی

انہوں نے سنجیدگی سے کہا تھا ان کا لہجہ گواہ تھا کہ اس وقت اس کی یہاں موجودگی انہیں
 اچھی نہیں لگی۔

خاموشی سے ان کے ساتھ ساتھ چلتی وہ ہسپتال تک آگئی تھی جہاں اس کے اور
 دوسرے دور دراز سے آئے ہوئے لوگوں کیلئے ایک سائیڈ میں رہائشی کمرے بنے
 ہوئے تھے۔

ہسپتال کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے اس نے انہیں خدا حافظ کہا تو وہ بے
 اختیار ہی اسے آواز دے بیٹھے۔

”نزیہہ! بات سنیں!“

”جی.....!“ پلکیں جھکائے جانے وہ کیا چھپانے کی جدوجہد میں تھی۔

”کوئی پر اہم ہے آپ کے ساتھ۔“ وہ لہجے میں فکر سموئے پوچھ رہے تھے۔

”نہیں ڈاکٹر فصیح!“ وہ کہہ کر چھپاک سے اندر داخل ہو گئی لیکن ان غلٹ

بھرے لمحوں میں بھی اس کی آنکھوں میں چمکتا پانی ڈاکٹر فصیح کی نظروں سے پوشیدہ نہیں
 رہا تھا۔

☆☆☆

تمہاری ہستی رہی ہمیشہ

نظر کے آگے نظر کے پیچھے

تمہاری ہستی میں جی رہا ہوں

نہ کوئی آہٹ

نہ آس کوئی

نہ زندگی کے ہی راستے ہیں

جو تم سے چاہا

نہ مل سکا وہ

تمہاری ہستی کا میں مکیں ہوں

تھی کہ یہ کارڈ کل ہی کی تاریخ میں آیا تھا کارڈ کو دیکھتے ہوئے یکدم انہیں کل رات اندھیرے میں منہر کے کنارے بیٹھی نزیہہ اور اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتا دکھ یاد آگیا۔

”کچھ ہے اس لڑکی کے ساتھ کوئی ایسی بات جو اسے ہر دم بے قرار رکھتی ہے۔ کوئی ایسا دکھ ہے اس کے اندر کہ وہ ہنستی ہے تو اس کی ہنسی میں ٹوٹنے کا جھجک کی صدا سنائی دیتی ہے۔“

برتھ ڈے کارڈ ہاتھ میں پکڑے ڈاکٹر فصیح نہ جانے کیا کیا سوچ رہے تھے انہیں تو بھیجے والے کے نام پر بھی حیرت تھی کیونکہ نزیہہ نے اپنے گھر کے ہر فرد کا غائبانہ تعارف کروا رکھا تھا۔ اور اس میں عباد علی نام کی کسی شخصیت کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

”السلام علیکم ڈاکٹر فصیح!“ روم میں داخل ہوتی نزیہہ نے بڑے خوشگوار سے انداز میں انہیں سلام کیا تھا لیکن دوسرے ہی پل ڈاکٹر فصیح کے ہاتھ میں موجود برتھ ڈے کارڈ دیکھ کر اس کے مسکراتے لب ساکت ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر فصیح بھی اس اچانک صورتحال پہ گڑبڑا گئے۔ بالکل انجانے میں ہی از سے ایک اخلاقی جرم سرزد ہو گیا تھا۔

”سوری مس نزیہہ! میں بی بی زاہدہ کے کیس کی فائل ڈھونڈ رہا تھا تو یہ کارڈ میرے ہاتھ آگیا۔ آئی ایم ویری سوری۔“ وہ نہایت پشیمان سے وضاحت پیش کر رہے تھے۔

”کوئی بات نہیں ڈاکٹر فصیح! میں کل جلدی میں یہاں سے نکل گئی تھی شاید میں نے بے خیالی میں اسے فائل میں رکھ دیا تھا اس لیے جاتے ہوئے ساتھ لے جانا یاد نہیں رہا۔ اپنی دے یہ کوئی اتنا خفیہ یا اہم نہیں ہے۔“ بے نیازی سے کہتی نزیہہ نے کارڈ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

اگلے ہی لمحے ڈاکٹر فصیح یہ دیکھ کر بھونچکے رہ گئے کہ اس نے کارڈ ٹکڑے ٹکڑے

کر کے ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا۔

☆☆☆

”چلیں بھی آپ سب لوگ ذرا ٹیبل سے دور ہٹ کر کھڑے ہو جائیں۔“ بلال کے حکم پر سب نے زور سے ”کیوں“ کی صدا بلند کی تھی۔

آج فائزہ کا برتھ ڈے تھا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ سب کچھ اس کے دشمن نہرون بلال نے ارنج کیا تھا یہاں تک کہ لاؤنج میں ٹیبل اور غبارے تک اسی نے لگائے تھے۔

بلال کا انداز بالکل کسی ہدایت کار جیسا تھا کس کو کہاں بیٹھنا ہے اور کہاں کھڑے ہونا ہے یہ بھی اسی نے بتایا تھا سب لوگ اس کی ہدایات پر یہ سوچ کر عمل کر رہے تھے کہ یہ ایک آرٹسٹک ذہن رکھنے والے شخص کے آئیڈیاز ہیں یقیناً کوئی اچھوتا ہی خیال اس کے ذہن میں ہو گا فائزہ بھی اپنی خوشی میں مست اس کی ہدایات پر بلا جوں چرا عمل کر رہی تھی۔

”اچھا ابھی سب کچھ ریڈی ہے۔ فائزہ! تم اکیلی ہی کھڑے ہو کر آج کیک کاٹو گی اور فیجہ! تم سن لو جیسے ہی میں کیڈنڈر روشن کرنے کے بعد ایک دو تین کہوں گا تم لائٹس آف کر دو گی اور فائزہ تم کیک کاٹو گی فائزہ خوشی خوشی ہاتھ میں چھری لیے کھڑے تھی۔ سرت سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

”ون ٹوتھری۔“ کی آواز کے ساتھ جیسے ہی فیجہ نے لائٹس آف کیں فائزہ نے کیک پر چھری پھیر دی کمرہ تالیوں اور پپی برتھ ڈے ٹوپوں کی آوازوں سے گونجنے لگا۔ اچانک ان آوازوں کے ساتھ ٹھانک ٹھانک اور ٹرچ ٹرچ کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ فائزہ کے پیچھے چلانے پر فیجہ نے گھبرا کر لائٹس آن کیں تو یہ دیکھ کر سب کی ہنسی نکل گئی کہ بلال ہاتھ میں بچوں کی پستول لیے کھڑا تھا اور اس پستول سے تاک تاک کر غباروں کے نشانے لے رہا تھا پستول کے نوکیلے چھرے جب کسی غبارے سے ٹکراتے تو غبارہ ایک زور دار آواز کے ساتھ پھیٹ جاتا اور ساتھ ہی اس میں سے ڈھیر ساری

افشاں گرتی جس کا شکار یقینی طور پر فائزہ ہی ہوتی کیونکہ غبارے لگائے ہی اس ترتیب سے گئے تھے کہ فائزہ کے علاوہ کوئی اور اس بارش میں بھیگ نہیں سکتا تھا حفظ مانتقم کے طور پر دوسرے تمام لوگوں کو ویسے ہی اس سے دور کھڑا کیا گیا تھا۔

لائس آن ہوتے ہی بلال نے نشانہ بازی کی مہم چھوڑ کر کانڈھے پر لٹکا کیمرو اتار لیا تھا اور اب دھڑا دھڑا فائزہ کی تصویریں اتار رہا تھا جس کی ساری تیاری افشاں کے اس طوفان میں برباد ہو گئی تھی فائزہ منہ پر ہاتھ رکھے اس کے کیمرے کی زد میں آنے سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”دیکھیں بڑے ابو! بلال نے میری برتھ ڈے خراب کر دی۔“ سب کو اپنی ہنسی اڑاتے دیکھ کر فائزہ روہانسی ہو گئی اور فوراً ہی اپنے سب سے بڑے حمایتی آفتاب صاحب سے رجوع کیا۔

آفتاب صاحب نے اگرچہ خود بھی بلال کی شرارت کو انجوائے کیا تھا لیکن اب فائزہ کے شکوے کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے چنانچہ لیوں پر ہنسی دباتے ہوئے چہرے پر سنجیدگی اختیار کر لی اور بلال کو ڈانٹنے لگے۔

لیکن بلال بھی جیسے آج ان کی ڈانٹ کو خاطر میں لانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ بظاہر بڑی فرمانبرداری سے سر جھکائے ڈانٹ سنتا رہا لیکن ساتھ ہی اشاروں اشاروں میں فائزہ کو ”کیا خوب لگ رہی ہو“ اور ”زبردست لگ رہی ہو“ جیسے جملے بول کر تپاتا بھی رہا۔ فائزہ نے جب دیکھا کہ اس ڈھیٹ بڑی پر کوئی اثر نہیں ہونے والا تو احتجاجاً خود ہی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔

”تم نے اسے ناراض کیا ہے۔ جاؤ منا کر لاؤ۔“ نزیبہ نے قریب آ کر اس کے کان کھینچے تو وہ بڑی فرمانبرداری سے اس کے کمرے کی طرف چل دیا۔ پیچھے باقی بیک پارٹی بھی تھی۔

”چھوڑ دیار! اتنا سا مذاق براشت نہیں کر سکتیں۔ اگر اتنی کم ہمت تھیں تو فرسٹ اپریل کو پیدا ہونے کی ضرورت کیا تھی ایک دن آگے پیچھے پیدا ہو جاتیں۔ کچھ

نہیں تو دنیا میں آنے سے پہلے مجھ سے مشورہ ہی کر لیتیں کم از کم آج تمہارا یہ حال تو نہیں ہوتا۔“ بلال دھپ سے اس کے سامنے جا بیٹھا تھا۔

”اے تم اسے منا رہے ہو یا مزید تنگ کر رہے ہو۔“ اس کے منانے کے بے تک انداز پر قمر بھابی نے اسے ٹوکا۔

”منا ہی رہا ہوں بھابی! لیکن یہ کبھی میری بات سمجھتی ہی نہیں۔“ بلال کی آنکھوں میں اس پل ایک چمک سی لہرائی تھی لیکن پھر فوراً ہی وہ اپنے سابقہ انداز میں واپس آ گیا تھا۔

”فائزہ! بلیومی۔ جتنا اہم تحفہ تمہاری برتھ ڈے پر میں تمہیں دینے والا ہوں کوئی اور ہرگز نہیں دے گا۔“

”کیا..... کیا دینے والے ہو تم اسے؟“ سب کی آوازوں میں تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ خود فائزہ بھی روتا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”تم بھارت جانا چاہتی تھیں نا! شاہ رخ خان سے ملنے۔“ بڑے پیار سے پوچھا۔

”ہائیں بلال بھیا! ایسا کیا کر دیا ہے آپ نے؟“ اب کے فنیجہ بھی پر جوش ہو کر اس کے قریب چلی آئی تھی۔

”یہ دیکھو مائی لٹل سسٹر اینڈ مائی دشمن نمبر ایک میں تم لوگوں کے لیے یہ ایروپلین لایا ہوں جب دل چاہے اس میں بیٹھ کر شارخ سے ملنے چلی جانا۔“ کہتے کے ساتھ ہی بلال نے اپنی جیب سے ایک کھلونا جہاز نکال کر فائزہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

فائزہ کے تو مانو پیچھے ہی ٹٹ گئے یوں جہاز کو اپنے ہاتھ سے جھٹکا جیسے کوئی بچھو ہو۔

بھابی دانیال بھائی اور نزیبہ تو اس چویشن کو انجوائے کر رہے تھے لیکن فائزہ اور فنیجہ کے چہرے یوں بے وقوف بنائے جانے پر پھول کے کپا ہو گئے تھے۔

”شریر!“ دانیال بھائی نے ایک دھول اس کی پشت پر لگائی اور فائزہ کے پاس

”بہت پسند ہے آپ کو یہ جگہ؟“

نزیہہ نہر کے کنارے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی تھی کہ ڈاکٹر فصیح بھی وہاں چلے آئے اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے بڑی نرمی سے سوال کیا تھا۔
 ”بہت..... بہت زیادہ پسند ہے مجھے یہ جگہ بلکہ پسند کا لفظ شاید چھوٹا ہے مجھے
 و عشق سا ہو گیا ہے یہاں سے۔“
 ”ارے! ایسا کیا ہے یہاں؟“ ڈاکٹر فصیح حیرت سے بولے۔

”یہاں سکون ہے خاموشی ہے اس نہر کے بہتے پانی میں جس کا چاہوں اس کا عکس دیکھ لیتی ہوں۔ ان پرندوں سے میں جو چاہوں وہ بات کہہ دیتی ہوں اور یہ اتنے وفادار ہیں کہ کسی اور سے کہتے بھی نہیں ہیں۔ آپ کو پتا ہے یہاں جو درخت ہیں ان کی چھاؤں اتنی ٹھنڈی ہے کہ ماں کی مانتا کا احساس ہوتا ہے۔ یہ نہر اس کے کنارے بڑے پتھر ہریالی اونچے اونچے درخت آسمان پر اڑتے پرندے اور ڈوبتا سورج یہ سب مل کر اتنا مکمل منظر بناتے ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ اگر بلال یہاں ہوتا تو ضرور برش اور رنگ لے کر بیٹھ جاتا۔“ وہ جیسے کسی خواب کی کیفیت میں بول رہی تھی۔

”نزیہہ! گھر والے یاد آرہے ہیں تو جا کر ایک بار ان سے مل آئیے۔“ ڈاکٹر فصیح کی آواز جیسے اسے خواب سے باہر لے آئی تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے اگر مجھے ان کی یاد آئی تو میں فوراً چھٹی لے کر چلی جاؤں گی۔“

”چاہے آپ کچھ بھی کہیں میں آپ کی بات پر یقین نہیں کر سکتا اگر آپ کو ان لوگوں کی یاد نہیں آ رہی ہوتی تو آپ کبھی اس نہر کے پانی میں ان کے عکس دیکھنے کی کوشش نہ کرتیں پرندوں سے اپنے دل کی بات نہیں کہتیں اور یوں درختوں کی چھاؤں میں مستاً کو تلاش نہ کرتیں۔ حقیقت کو مان لینے میں آخر حرج ہی کیا ہے نزیہہ! آپ ہوں میں ہوں یا کوئی اور..... ہم کبھی اپنے اصل سے ہٹ کر خوش نہیں رہ سکتے ڈاکٹر نائلہ کو ہی دیکھیے ہر مہینے کم از کم ایک چکر ضرور لگاتی ہیں وہ اپنے گھر کا میں بھی جب پڑھائی کے

بیٹھ کر اسے منانے لگے۔“

”تم نے میری بہنا کا دل دکھایا ہے اس لیے تمہاری سزا ہے کہ تم آج ہم سب کو پیرا کھلانے لے جاؤ گے۔“ انہوں نے بارعب لہجے میں بلال کو حکم دیا۔
 ”ارے فکر ہی نہیں کریں بھائی! مجھے پہلے ہی سے پتا تھا اس ندیدی ملی کے بارے میں اس لیے میں بندوبست کر کے آیا تھا۔ کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پیرا حاضر ہے۔“

کہتے کے ساتھ ہی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر آیا تو اس میں ربر سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا خوبصورت پیرا موجود تھا۔ ربر سے بنا ہونے کے باوجود یہ اتنا خوبصورت تھا کہ ایک بل کے لیے بالکل اصلی محسوس ہوتا تھا۔
 ”باز نہیں آؤ گے بلال! تم اپنی حرکتوں سے۔“ فائزہ کو منہ بناتے دیکھ کر اب کے بھابھی نے اس کے کان کھینچے۔

”کیا کروں بھابھی! آپ کے سرتاج بھی تو اتنی مشکل مشکل سزائیں تجویز کر رہے ہیں اب میں بے چار اسٹوڈنٹ پیرا ہٹ جانے اور وہاں آپ سب کو بھی لے جانے کا خرچہ کیسے افورڈ کر سکتا ہوں۔“

”کر تو بیٹا جی تم بہت کچھ سکتے ہو۔ پاپا سے جو بہانے بہانے سے رقم لے لے کر جمع کرتے ہو کوئی ہم سے چھپی ہوئی تو نہیں ہے لیکن کیا یاد کرو گے کہ کس سخی بھائی سے تمہارا رشتہ ہے۔ چلو آج فائزہ کی سالگرہ کی خوشی میں میں تم لوگوں کو لے چلا ہوں۔“ دانیال بھائی بڑے خوشگوار موڈ میں تھے سب کو تیار رہنے کا حکم دے کر خود بزرگ پارٹی کو اطلاع دینے نیچے چلے گئے۔

نزیہہ اس دوران خاموشی سے کھڑی بس چپکے چپکے مسکراتی رہی بلال زبان سے اظہار نہ کرتا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں فائزہ کے لیے جو محبت کے رنگ تھے وہ نزیہہ کی نظروں سے چھپے ہوئے نہیں تھے۔

”بھئی صاف صاف بات ہے دوستوں میں راز داری نہیں ہوتی ایک دوست کا غم اور خوشی دونوں اس کے دوسرے دوست کی امانت ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص اپنی کوئی پر اہم کوئی خوشی غم کوئی بھی بات دوست سے چھپاتا ہے تو اس کا مطلب ہے وہ دوستی میں خیانت کرتا ہے۔“

بڑی خوبصورتی سے وہ اس کا گھیراؤ کر رہے تھے۔

”کچھ ایسا خاص نہیں ہے میری زندگی میں لیکن آپ اصرار کر رہے ہیں تو کسی دن ضرور بتاؤں گی۔ ابھی تو مجھے ہاسپٹل پہنچنا ہے۔ ڈاکٹر نائلہ کی ڈیوٹی ختم ہونے والی ہے مجھے جا کر چارج سنبھالنا ہے۔“ اس نے ایک بار پھر فرار کی راہ اختیار کی۔

”میں کل یہیں آپ کا انتظار کروں گا تیاری سے آئیے گا۔“ پیچھے سے آواز لگا کر انہوں نے احساس دلایا تھا کہ اب وہ اس سے اس کی زندگی کے راز اُگلوا کر ہی رہیں گے۔

”کوئی دنیا سے بہت الگ اور انوکھی داستان نہیں ہے میری دنیا میں نہ جانے کتنے لوگ ہر روز ایسا درد سہتے ہوں گے لیکن جب کوئی حادثہ اپنے ساتھ ہو تو لگتا ہے پہلی بار قدرت نے اس ستم کے لیے ہمارا دل چنا ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے تاکہ میڈیکل سائنس دل کو انسان کے وجود کا مضبوط ترین عضو تسلیم کرتی ہے اور انسان کے وجود میں سب سے زیادہ ٹوٹ پھوٹ بھی یہیں ہوتی ہے بہت خوار کر داتا ہے انسان کو یہ دل پتا نہیں کہاں کہاں سے خواہشیں اور امنگیں آ کر یہاں جمع ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب ان خواہشوں کو دنیا کے تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو انسان میری طرح ہی دنیا سے فرار حاصل کر لیتا ہے آسان نہیں ہوتا یوں انہوں سے فرار حاصل کرنا بہت درد ہوتا ہے لیکن حالات مجبور کر دیتے ہیں میں ان سب کے بغیر اداس ہوں اور وہ سب میرے یہاں آنے پر ناراض اتنے مہینے ہو گئے کسی نے مجھ سے رابطہ تک نہیں کیا حالانکہ میں جانتی ہوں وہ مجھ سے بے خبر نہیں ہوں گے۔“

وہ ڈاکٹر عتیق جو ہر ہفتے فون کر کے مجھ سے میری خیریت پوچھتے ہیں تو کیا

سلسلے میں کراچی میں رہتا تھا موقع ملے ہی یہاں گاؤں بھاگا چلا آتا تھا اور اگر آنا ممکن نہیں ہوتا تھا تو خط ضرور لکھتا تھا۔

مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کسی چیز سے فرار حاصل کرنے کے لیے یہاں آئی ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ اپنے گھر والوں سے ملنے جاتیں یا کم از کم انہیں خط ضرور ہی لکھتیں۔ آپ نے ایک بار بتایا تھا کہ آپ کے گھر میں ہر فرد کا برتھ ڈے بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے پھر کیا وجہ تھی کہ آپ کا برتھ ڈے یوں خاموشی سے آکر گزر گیا اور اس اجنبی نام والے کارڈ کے سوا آپ کے لیے آپ کے گھر سے کوئی کارڈ کوئی خط نہیں آیا اپنے برتھ ڈے کی شام آپ نے اس نہر کے کنارے اندھیرے میں بیٹھ کر بتادی اور کسی کو خبر بھی نہ ہونے دی میں نے مانا کہ ہم سب الگ الگ شہروں سے تعلق رکھنے والے فرد ہیں۔ لیکن جب ہم ایک ٹیم کی طرح کام کرتے ہیں تو ہمیں حق حاصل ہے کہ ایک دوسرے کی خوشی غمی میں بھی شریک ہوں اگر آپ کو ہمارے درمیان رہنا ہے تو ہمیں اپنا سمجھنا بھی ہوگا اور اگر ایسا کرنا آپ کے اختیار میں نہیں ہے تو لوٹ جائیے ان لوگوں کی طرف جو آپ کے اپنے ہیں۔“

ڈاکٹر فصیح مسلسل بول رہے تھے۔ ان کے لہجے سے واضح خفگی ظاہر ہو رہی تھی۔

”سوری ڈاکٹر فصیح! میری وجہ سے آپ ہرٹ ہوئے لیکن یقین کریں میں آپ سب لوگوں کو بالکل اپنا سمجھتی ہوں یہی وجہ ہے کہ آج تک کوئی جھوٹی بات کہہ کر آپ لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش نہیں کی کم بتایا اپنے بارے میں لیکن سچ بتایا آپ ماں ماجی مریم ڈاکٹر نائلہ آپ سب ہی تو یہاں میرا خاندان ہیں میں نے کبھی آپ کو اپنا کوئی گھر نہیں بلکہ ہمیشہ اپنا دوست سمجھا ہے۔“

”اگر دوست سمجھا ہے تو..... دوستی کا تقاضا پورا کریں۔“ فوراً ہی انہوں نے اس کا جملہ پکڑا تھا۔

”کیسا تقاضا؟“ وہ انجان بن کے نظریں چرانے لگی۔

لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ فرق بھی نظر نہیں آتا تھا کیونکہ اس نے تو خود ابھی انٹر کا امتحان ہی دیا تھا دونوں کی عمروں کا فرق بھی یہی کوئی پانچ چھ سال تھا جو کہ ہمارے مشرقی معاشرے میں نہایت مناسب سمجھا جاتا ہے۔

آفتاب صاحب نے عباد کی امی سے رسمی طور پر سوچنے کا ٹائم لے لیا تھا ورنہ ان کی نظر میں تو رشتہ اتنا مناسب تھا کہ انکار کرنا بے وقوفی ہوتی البتہ عازرہ چچی کچھ جھجک کا شکار تھیں ان کے خیال میں نزہہ بڑی تھی اس کے ہوتے ہوئے پہلے فائرہ کا رشتہ کر دینا کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔

لیکن آفتاب صاحب اور علیزہ نے ان کے اس اعتراض کو قبول نہیں کیا تھا بقول ان کے نزہہ ابھی اپنا ہاؤس جاب کر رہی ہے لہذا اس کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں یوں بھی جس کا جب وقت آتا ہے تب ہی اللہ تعالیٰ اس کا جوڑ بھیج دیتا ہے بڑی کے بچے چھوٹی کو بٹھائے رکھنا اور اس کے اچھے رشتے نکال دینا کچھ مناسب نہیں تھا۔

نزہہ کو جب اس رشتے کے بارے میں خبر ملی تو ایک پل کو اسے لگا کہ اس کی سماعتوں کو دھوکا ہوا ہے۔ عباد کی امی اس گھر میں نزہہ کے علاوہ کسی اور کے لیے سوالی بن کر کیسے آسکتی تھیں؟ لیکن جب اس نے ہر ایک کی زبان سے یہی قصہ سنا اور بلال کو اپنے کمرے میں پناہ لیتے دیکھا تو اس کو اس انہونی کا یقین کرنا پڑا لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی یقین تھا کہ آنٹی یہ سب کسی غلط فہمی کی بنیاد پر کر رہی ہیں۔ عباد سے اصل بات جاننے کی خواہش میں وہ اس کے گھر کی طرف چل دی۔

”یہ آپ لوگ کیا کر آئے ہیں؟“ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی لیوینگ روم کے ادھ کھلے دروازے سے آتی عباد کی آواز نے اسے باہر ہی قدم روکنے پر مجبور کر دیا۔

”کیا کر آئے ہیں؟ تم سے کہہ کر تو گئے تھے کہ آفتاب صاحب کے ہاں تمہارے رشتے کی بات کرنے جا رہے ہیں اس وقت تو تم نے کوئی اعتراض نہیں کیا اب گھرے دکھا رہے ہو۔“ جواب آنٹی نے بڑے کرارے انداز میں دیا تھا۔

”آفتاب صاحب کے گھر رشتہ لے جانے کے لیے کہا تھا آپ نے لیکن یہ تو

میں نہیں جانتی کہ ایسا وہ پاپا کے کہنے پر کرتے ہوں گے۔ ان سب کو مجھ سے محبت ہے لیکن میری ہٹ دھرمی نے انہیں بے گانگی پر مجبور کر رکھا ہے۔ آج اگر میں ایک بار انہیں فون کر دوں تو وہ اڑ کر میرے پاس آجائیں گے۔ لیکن میں جان بوجھ کر ان سے رابطہ نہیں کرتی کیونکہ مجھے پتا ہے کہ ایک بار بھی کسی کی آواز میرے کانوں تک پہنچ گئی تو میں ضبط نہ کر سکوں گی خود پر۔ ان کی محبت مجھے واپس کھینچ لے گی اپنی طرف اور یہی میں نہیں چاہتی۔ محبت کے بڑے تقاضے ہوتے ہیں محبتیں قرض ہوتی ہیں ہماری جان پر جنہیں سود سمیت دوسروں کو لوٹانا ہوتا ہے اگر کسی نے ایک بار بھی اپنی محبت کا واسطہ دے کر مجھے پکار لیا تو مجھے واپس پلٹنا ہوگا۔ اور میں اس بے درد شہر میں واپس نہیں جانا چاہتی جہاں کی ہوائیں بھی مجھے سکھ سے نہیں رہنے دیتیں۔

نہر کے پانی پر نظریں جمائے وہ یوں ہولے ہولے بول رہی تھی جیسے یہ سب کچھ پانیوں پر لکھا دکھائی دے رہا ہو ڈاکٹر فصیح اس کے ہلتے لیوں پر نظریں جمائے اس کا ایک ایک لفظ یوں سن رہے تھے کہ جیسے کوئی لفظ اگر ان کی سماعتوں میں نہ آتا تو نہر کی گہرائی میں ڈوب جائے گا۔

خوشیاں قہقہے ہنگامے محبتیں بس یہی لفظ تھے جن سے آفتاب شیخ اور علیزہ شیخ نے اپنی فیملی کو متعارف کروایا تھا اس گھر کی درود یوار نے غم تو دیکھے تھے لیکن قہقہوں میں گونجتے نوحوں سے یہ درود یوار یکسر نا آشنا تھے بلال کی شرارتوں میں چھپی فائرہ کی محبت پر اس گھر کا چپہ چپہ مسکراتا تو نزہہ کی عباد سے خاموش محبت کے گواہ بھی یہی درود بام تھے بالکل تو اس گھر کی پرسکون فضاؤں میں جب ہوئی تھی جب عباد کی امی اور طوبی آپا اچانک بنی سباز کے لیے فائرہ کا رشتہ لے کر چلی آئی تھیں جہاں سب اس رشتے پر حیران تھے وہاں خوش بھی بہت تھے۔

بہر حال عباد کا رشتہ اتنا اچھا تھا کہ کوئی بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا عباد لاکھوں کی جائیداد کا مالک تھا ہینڈسم تھا خاندانی تھا اور سب سے بڑھ کر نہایت اچھے اخلاق و اطوار کا مالک تھا اس کا واحد مانس پوائنٹ اس کی تعلیم کی کمی تھی لیکن فائرہ کے

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ طوبی آپا! اتنے عرصے سے جانتی ہیں آپ نزی کو۔ کیا کبھی دیکھا ہے آپ نے اس کے اندر کوئی گھٹیا پن؟“

عباد جانے نزیبہ کی وکالت میں کیا کیا کہہ رہا تھا لیکن نزیبہ کو تو آنٹی اور طوبی کے الفاظ نے ہی زخم زخم کر دیا تھا عباد کی وکالت ان زخموں کا مرہم ہرگز نہیں ہو سکتی تھی وہ ان کبھی محبت جس نے کبھی ان کے درمیان اخلاقیات کو گرنے نہیں دیا تھا آج اتنی بری طرح رسوا ہوئی تھی کہ نزیبہ کے لیے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوتا جا رہا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی آنٹی ہیں جن کی ذرا سی تکلیف پر وہ دوڑی جاتی ہے جو اس کی خدمت پر خوش ہو کر اسے دُعائیں دیتی ہیں اور یہ وہی طوبی ہے جس کے سنگ اس نے لڑکپن سے جوانی تک کا سفر طے کیا ہے۔

اپنے بے دم ہوتے وجود کو سنبھالتی وہ بمشکل گھر لوٹی تھی اس کی حالت اس وقت ایسی ہو رہی تھی کہ وہ چاہتی تھی بنا کسی کی نظروں میں آئے سیدھی اپنے کمرے میں چلی جائے لیکن لاؤنج میں ہی عازنہ چچی سے ٹکراؤ ہو گیا۔

”نزی بیٹا! ادھر آؤ۔“ وہ خاموشی سے گزر جانا چاہتی تھی لیکن انہوں نے آواز دے کر روک لیا۔

”جی چچی!“ بمشکل خود پر قابو پاتی وہ ان کے نزدیک چلی آئی۔

”بیٹا! تمہیں تو پتا ہی ہو گا کہ فائزہ کے لیے عباد کا رشتہ آیا ہے یوں تو اعتراض والی کوئی بات نہیں لیکن میں چاہتی ہوں تم فائزہ سے اس کی مرضی معلوم کر لو میرے سامنے شاید وہ جھجک کی وجہ سے کہہ نہ سکے تم سمجھ دار بھی ہو اور فائزہ تم سے قریب بھی بہت ہے اس لیے میرے خیال میں تم سے وہ کس کر اپنی رائے کا اظہار کر سکے گی۔“

ایک اور کوہ گراں تھا جو عازنہ چچی نے اس کے کندھوں پر رکھ دیا تھا لیکن اسے تو ہر حال میں یہ ذمہ داری پوری کرنی ہی تھی چاہے کیسے بھی کرتی۔ سو اپنے بے حال ہوتے دل کو سنبھالتی فائزہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

فائزہ کمرے میں تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ فیجہ بھی موجود تھی جو فائزہ کے

نہیں کہا تھا کہ فائزہ کے لیے لے کر جا رہی ہیں رشتہ میں تو یہی سمجھا رہا کہ نزیبہ بڑی ہے آپ اسی کے لیے بات کرنے جا رہی ہوں گی۔“ تیز لہجے میں بولتا عباد بے چینی سے کمرے کے چکر کاٹ رہا تھا۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے عباد! میں کیوں لے جاتی اس نزیبہ کے لیے تمہارا رشتہ۔ غضب خدا کا کوئی جوڑ بنتا ہے تمہارا اور اس کا۔ تمہاری ہم جماعت تھی عمر میں تمہارے برابر بلکہ شاید تم سے دو ایک مہینے بڑی ہی ہوگی اوپر سے شکل و صورت بھی بس یوں ہی سی ہے تمہارے برابر کھڑی ہوگی تو بالکل ہی دب جائے گی اگر اتنی معمولی شکل و صورت کی بہو ہی لانا ہوتی مجھے تو خاندان سے ہی نہیں لے آتی۔ میں تو دعویٰ کر کے آئی ہوں تمہارے چچا تایا کے گھر والوں کے سامنے کے عباد کی دلہن اتنی خوبصورت لاؤں گی کہ سب دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔ فائزہ کو دیکھا ہے تم نے بالکل اپنی ماں جیسی ہے۔ اتنی اجلی کہ اگر زیادہ غور سے دیکھو تو میلی ہو جائے۔“

”فار گاڈ سیک امی جان! یہ کیا آپ شکل و صورت کے قصے لے کر بیٹھ گئی ہیں۔ شادی انسان کی انڈر اسٹینڈنگ کی وجہ سے کامیاب ہوتی ہے عمر یا شکل کی وجہ سے نہیں نزی جیسی بھی ہے مجھے پسند ہے اور مجھے صرف اور صرف اسی سے شادی کرنی ہے۔“

”نوبہ ہے عباد! کیسی باتیں کر رہے ہو شرم نہیں میرے اور امی جان کے سامنے اپنی محبت کے قصے سناتے ہوئے غضب خدا کا دوستی کے نام پر تم لوگ ہماری ناک کے نیچے عشق و محبت کا کھیل کرتے رہے اور ہمیں خبر ہی نہیں ہوئی اور ان نزیبہ بیگم کو دیکھو یوں تو لگتا ہے جیسے پڑھنے لکھنے کے سوا کوئی کام نہ ہو لیکن چلتروں میں پوری ہیں صحیح ہے بھی یہ شہر کی لڑکیاں تو لڑکوں کو پھنسانے میں ماہر ہوتی ہیں۔“ اپنے دو سالہ بیٹے کو تھپک تھپک کر سلاتی طوبی نے درمیان میں لقمہ دیا۔

طوبی کے اس انداز پر جہاں باہر کھڑی نزیبہ سن پڑ گئی وہاں عباد کو بھی پچھ لگ گئے۔

نے مجھے بھیجا ہے کہ تمہاری رائے معلوم کر لوں۔“

اور فائزہ کی رائے تو اس کی لرزتی ہلکوں اور سرخ پڑتی رنگت ہی سے عیاں تھی۔

پھر بھی جانے کیوں نزہہ کو اپنی بصارت پر بھروسہ نہیں ہوا اس نے یکدم ہی فائزہ کے شانے پکڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

”فائزہ پلیز..... میری بات کا جواب دو۔“ ایک تڑپ تھی اس کی آواز میں جسے اگر فائزہ سمجھ سکتی تو کبھی زبان سے ہاں نہیں کہتی۔

”میں بہت خوش ہوں نزی آپ! بہت خوش میں نے چپکے چپکے ان کی تمنا تو بار بار کی تھی لیکن کبھی انہیں پاسکوں گی یہ نہیں سوچا تھا آج میرا دل چاہتا ہے پرندوں کے رنگ آسمان پر اڑنے لگوں ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتا دوں کہ عباد علی نے مجھ سے مجھے مانگا ہے۔“

فائزہ نزہہ کے گلے سے لگی جذبات سے بوجھل لہجے میں کہہ رہی تھی دوسری طرف نزہہ کا دل کسی پاتال میں گرا جا رہا تھا۔

اتنی سیدھی سادی زندگی میں خدا کتنی پیچیدگیاں پیدا کر دیتا ہے کسی کا دل کسی سے جوڑ دیتا ہے اور رشتہ کسی سے عباد نزہہ کا طلب گار تھا تو اسے فائزہ مل رہی تھی فائزہ کو عبادل رہا تھا لیکن عباد کے پاس اس کی چاہت کا جواب چاہت سے دینے والا دل نہیں تھا بلال کا دل فائزہ کا سوالی تھا اور فائزہ اس سے انجان تھی اور خود نزہہ تھی جو شاید ایک سچ بول کر خود کی عباد کی اور بلال کی خوشیوں کو بچا سکتی تھی لیکن وہ ایک سچ بولنا ہی بہت مشکل تھا کیا وہ کبھی فائزہ سے کہہ سکتی تھی کہ تم عباد علی کی تمنا چھوڑ دو کہ میرا دل برسوں سے اس کا تمنائی ہے کیا وہ اجڑے دل والی فائزہ کو بلال کی زندگی میں شامل کر کے تقدیر سے ان کے لیے خوشیاں مانگ سکتی تھی کبھی نہیں اسے تو ہر حال میں سچ کو چھپانا تھا اپنے درد دل کو جسم کی تاریک قبر میں دفن کر عباد کی محبت سے دامن چھڑا کر اور بلال کی ملگتی نظروں سے آنکھیں چرا کر فائزہ کو اس کے دل کی خوشی دینی تھی۔

ساتھ سر جوڑے نہ جانے کن سرگوشیوں میں معصوف تھی فائزہ کے گالوں پر گلاب کھلے جا رہے تھے نزہہ نہ جانے کتنی دیر گھڑی اس کی جانب دیکھتی رہی جھیل جیسی گہری آنکھیں گلاب کی پتی سے نازک لب ستواں ناک شہابی رنگت گھٹاؤں جیسی زلفیں اور ہنستے ہوئے گالوں پر پڑتے دو ڈھیل بندہ آخر نظر چرائے تو کس کس چیز سے وہ تو سراپا قیامت تھی کلیں سی نزاکت تھی اس میں بلال اس کا خاموش بچاری تھا تو برحق تھا عباد کی ماں بہن کو اس کے سامنے نزہہ نظر نہیں آئی تھی تو بالکل درست تھا وہ تو ایک چمکتا سورج تھی جس کے سامنے کسی کا چراغ جلنا ممکن ہی نہیں تھا۔

”ارے نزی آپ! آپ یوں دروازے پر گھڑی کیا دیکھ رہی ہیں اندر آئیں نا۔“ اچانک ہی فحشہ کی نظر اس پر پڑ تھی۔

”میں تو آئی رہی ہوں اندر لیکن تم ایسا کرو یہاں سے چلتی پھرتی نظر آؤ۔ مجھے فائزہ سے ضروری بات کرنا ہے۔“

”تو میرے سامنے کر لیں نا مجھے پتا ہے آپ نے کون سی بات کرنی ہے۔“

”فحشہ!“ نزہہ نے تیشی انداز میں اسے گھورا۔

”ماچھا بابا جا رہی ہوں۔ ایک تو پتا نہیں کیوں اس گھر میں سب مجھے بچہ سمجھتے ہیں اس فائزہ سے صرف چھ مہینے چھوٹی ہوں اس کی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں اور مجھے کوئی لائق ہی نہیں سمجھتا۔“ فحشہ بد بڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی تو نزہہ فائزہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

خوبصورت تو وہ ہمیشہ سے ہی تھی لیکن آج اس کے انداز میں ایک عجیب سا بانگن تھا۔

”فائزہ.....!“ اس نے پکارا۔

”ہوں.....“ نظریں جھکائے بیٹھی فائزہ کے لبوں سے صرف ایک لفظ برآمد ہوا۔

”جسمیں پتا ہے نا کہ تمہارے لیے آنٹی عباد کا پروپوزل لے کر آئی ہیں چچی

رہی ہو۔“ بھابھی خفا ہو کر بولیں۔

”کس بارے میں پوچھ رہی ہیں بھابھی؟“ نزیبہ نے ایک بار پھر تجاہل برتنا چاہا۔

”اچھا تو اب تم مجھ سے پردہ داری کرو گی چلو کرو تم اپنے بارے میں پردہ داری لیکن بلال کے بارے میں کچھ سوچا ہے؟“ بھابھی نے تپ کر اس کے ہاتھ سے چکن کی ڈش چھین کر رکھ دی۔

”کیوں کیا ہو گیا بلال کو؟“ ٹھیک ٹھاک تو ہے آج صبح سے اپنے دوستوں کی ساتھ اسٹیڈیم گیا ہوا ہے میچ ہے اس کا۔“ نزیبہ نے نظریں چرا کر کہا۔ اب وہ پیاز کی ڈکری میں سے پیاز نکال کر کاٹ رہی تھی۔

”نزی! میں یقین نہیں کر سکتی کہ اس کی آنکھوں میں لکھی داستان تمہیں نظر نہیں آئی ہو گی۔ وہ رنگ جو ایک بھابھی ہو کر میں نے پہچان لیے تمہیں بہن ہوتے ہوئے کیوں نظر نہ آئے۔“ بھابھی صدمے کی سی کیفیت میں اس سے پوچھ رہی تھیں۔

”نظر آئے تھے بھابھی! لیکن فائزہ کے چہرے پر چھائی رنگوں کی دھنک کو پہچانے لیے مجھے بلال کی محبت کے رنگوں سے نظر چرانی پڑی۔ وہ ہمارے گھر کی سب سے لاڈلی بچی ہے۔ ہم نے ہمیشہ اس کی ہر خواہش پوری کی ہے تو اب کیسے اتنی بڑی خوشی سے اسے محروم کر دیتے بلال کے لیے ابھی صدمہ نیا ہے آہستہ آہستہ سنبھل جائے گا۔“

”اور عباد! اس کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے نزی! میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ میری سب دوست کہتی ہیں میں غضب کی چہرہ شناس ہوں کیا تمہارے اور عباد کے بیچ کبھی کچھ نہیں رہا ہے؟“

بھابھی کے سوال پر نزیبہ نے ایک جھٹکے سے اپنا رخ بھابھی کی طرف موڑا تھا اور اس پل اس کی نظر تیزی سے چکن کے دروازے کی سائیڈ میں ہوتے عباد پر پڑی تھی۔ مسلسل چار دن سے وہ نزیبہ سے ملنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نزیبہ اپنی

وہ فائزہ کے ماتھے پر بوسہ دے کر اس کے کمرے سے باہر نکل گئی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے لیکن اسے ان آنسوؤں کو آنکھ سے گرنے نہیں دینا تھا۔

اپنے ماں باپ کی عزت پہچانے کے لیے اسے اپنے اور اپنے بھائی کے جذبات کی قربانی دینی ہی تھی ورنہ دنیا کیا کہتی آفتاب شیخ نے اپنی اولاد کی خوشی کے لیے یتیم بھتیجی کا دل توڑ دیا۔

اور یوں بھی اگر فائزہ کے لیے عباد کا رشتہ قبول کیا جاتا یا نہ کیا جاتا نزیبہ کو تو ہر دھمورقوں میں عباد علی سے دستبردار ہونا ہی تھا ایک ان چاہی ہستی کے طور پر تو وہ اس کے گھر میں بسنے کا خواب کبھی دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔

اسے معلوم تھا عباد یوں آسانی سے ہار نہیں مانے گا وہ اپنی والدہ اور طوطی آپا کے سامنے نزیبہ کے حق میں ڈٹ جائے گا لیکن اس کی یہ حمایت نزیبہ کے کردار کی مزید دھجیاں اڑا سکتی تھی۔

نزیبہ اپنی محبت کو بھول کر بس کسی نہ کسی طرح اپنی اور اپنے خاندان کی عزت پہچانے کی فکر میں تھی۔

☆☆☆

”یہ سب کیا ہو رہا ہے نزیبہ؟“ چکن کڑا ہی بنانے کے لیے چکن دھوئی نزیبہ سے بھابھی نے اچانک آکر پوچھا تھا۔

”چکن دھو رہی ہوں بھابھی! چکن کڑا ہی بناؤں گی۔“ بھابھی کے سوال کا نوعیت کو سمجھتی نزیبہ نے انجان بننا چاہا۔

بھابھی گزشتہ ایک ہفتے سے میکے رہنے لگی ہوئی تھیں۔ صبح دانیال بھائی نے خاص طور پر فون کر کے انہیں گھر بلوایا تھا کہ آج عباد کے گھر والے جواب لینے ان کے ہاں آنے والے تھے۔

”بند کرو یہ چکن کڑا ہی کی داستان۔ میں جو کہہ رہی ہوں تم اچھی طرح سمجھو“

پہناتا تو کیا عزت رہ جاتی اس کی وہ جتنی بے دردی سے بول رہی تھی لگتا تھا اسے محبت تو کیا دوستی کے رشتے کا بھی کچھ پاس نہیں تھا اپنے ٹوٹے دل کے ٹکڑے سنبھالتا بوجھل دل لیے عباد علی آفتاب ولا سے باہر نکل گیا تھا۔

اسے نکلنے دیکھ کر نزیہہ آفتاب جواب تک جانے برداشت کی کن منزلوں سے گزر کر سب کچھ کہہ پائی تھی بھابھی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

بھابھی جو اس اچانک افتاد پر سراسیمہ ہو گئی تھیں خود بھی اس کے سنگ مل کر رونے لگیں گھر سے باہر نکلتے عباد علی کی جھلک انہوں نے بھی دیکھ لی تھی ساتھ ہی نزیہہ کے ادا کیے ہر جملے کا مطلب بھی انہیں سمجھ میں آ گیا تھا ہمیشہ وہی کچھ سچ نہیں ہوتا جو ہمارے کان سنتے ہیں یا ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں محبت میں پانا ہی سب کچھ نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کو اپنے حصے کی خوشی اور محبت دان کر دینا انسانیت کا سب سے اونچا درجہ ہوتا ہے۔ نزیہہ نے اپنے دل کی خوشی فائزہ کے دامن میں ڈالی تھی۔ یقیناً یہ لڑکی بہت بلند تھی جو خود دکھی رہ کر بھی دوسروں کو خوشی دینے کا جذبہ اپنے دل میں رکھتی تھی۔ بھابھی اس کی جانب عقیدت سے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اسے دنیا بھر کی خوشیاں مل جانے کی دعا دے رہی تھیں۔

☆☆☆

آفتاب صاحب کے ہاں کرتے ہی دونوں طرف خوشی کے شادیاں نے بچنے لگے۔ عباد ان کا اکھوتا بیٹا تھا تو فائزہ آفتاب صاحب کے گھر کی سب سے لاڈلی بیٹی دونوں طرف ہی سے جتنا خوشی کا اظہار کیا جاتا کم تھا طوبی آپا اور عباد کی امی تو بہت زیادہ پر جوش تھیں کیونکہ عباد کا رجحان نزیہہ کی طرف دیکھ کر انہیں ڈر تھا کہ کہیں انکار ہی نہ ہو جائے چنانچہ ان کی طرف سے ہاں ہوتے ہی عباد کی امی نے شادی کی جلدی چا دی تھی عباد نہ نہ کرتے اچانک جو چپ ہو گیا تھا اس پر انہیں حیرت تو تھی لیکن ساتھ ہی اس بات کی فکر بھی تھی کہ کہیں وہ دوبارہ نہ بدک جائے اس لیے انہوں نے متغنی وغیرہ کے ہنر میں پڑنے کے بجائے ڈائریکٹ شادی کا فیصلہ کیا تھا ایک مہینے کے قلیل عرصے میں

ٹائٹ ڈیوٹیز تھکن اور پڑھائی کی آڑ لے کر ان چار دنوں میں کمرے سے باہر ہی نہیں نکل رہی تھی۔

آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو آستینوں سے صاف کرتے ہوئے اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

”اف بھابھی! آپ کی دوستوں کا اندازہ آپ کے بارے میں بالکل غلط ہے آپ کو تو بالکل بھی چہرے پڑھنا نہیں آتے تو بھجے تو سوچ سوچ کر ہنسی آرہی ہے کہ آپ میرے اور عباد کے بارے میں ایسا سوچتی ہیں آپ کے خیال میں مجھے نزیہہ آفتاب ایم بی بی ایس فرام ڈاؤ میڈیکل کالج کو پوری دنیا میں محبت کرنے کے لیے عباد علی جیسے انٹر بشکل پاس بندے کے علاوہ کوئی ملا ہی نہیں تھا اس کے لیے تو میری باتوں کا سمجھنا بھی بہت مشکل ہو گا۔ میں اتنا ٹومی کا ذکر کروں گی وہ پوچھے گا یہ کیا ہے میں ہیوٹر سرکیولیٹری سسٹم پر تجربہ کروں گی۔ وہ اپنے کھیتوں میں اگنے والے ٹنڈوں کپاس اور بھنڈی کی خصوصیات سنائے گا ہاؤ فنی بھابھی!“ وہ مسلسل قہقہے لگا رہی تھی۔

”لیکن نزی! مجھے کیوں لگتا تھا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔“ اب کے بھابھی کے لہجے میں الجھن تھی۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں اس بارے میں اگر آپ کے خیال کے مطابق اسے محبت تھی تو اس کو ایسا کرنے سے پہلے اپنی طرف ایک بار غور سے دیکھنا چاہیے تھا وہ پینڈو سا بندہ میرے پڑھے لکھے دوستوں کی گید رنگ میں فٹ ہو سکتا تھا؟“

نرم خوں نزیہہ کے لبوں سے نکلنے والے تلخ ترین الفاظ نے باہر کھڑے عباد علی کے سماعتوں کو زخم زخم کر دیا تھا وہ کتنے دنوں سے اس دشمن جان سے ملنے کو بے تاب تھا کی خاطر اپنی امی اور بہن سے لڑتا رہتا تھا اور آج جبکہ بالکل فائنل فیصلہ ہونے والا تھا بھی وہ اسے تلاش کرتا ہوا یہاں آ گیا تھا کہ اس کے ساتھ مل کر مسئلے کا کوئی حل نکالے لیکن نزیہہ یوں اس کے جذباتوں کی توہین کرے گی اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ یہ تو اہوا تھا کہ بنا سامنے گئے اس نے اس کے خیالات سن لیے تھے اگر سامنے پہنچ کر سوال

شادی کی تیاری کرنے کی فکر میں سارے گھر والے گھن چکر بن گئے تھے اس درجہ مصروفیت تھی کہ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ بھابھی سارا دن گھر داری بھاتیں مزیدہ ہاؤس جاب کے لف پیریڈ سے گزر رہی تھی فیجہ تو تھی ہی لا ابالی اسے گانے بجانے ہلاکار کرنے کے سوا کچھ آتا نہ تھا ایسے میں علیزہ اور عازہ تھیں جو بازار کے چکروں میں مصروف رہتیں دانیال بھائی کا زیادہ تر وقت ڈرائیوری کرتے گزرتا ایسے میں بلال کیا کر رہا ہے کہاں مصروف ہے اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا تھا یہاں تک کہ دادی جان جو گھر کے ہر فرد کی خبر گیری بڑی تند ہی سے کرتی تھیں وہ بھی اس کی طرف سے چوک گئیں۔

ان کا زیادہ تر وقت فائزہ کو نصیحتیں کرنے اور اس پر اپنی محبت کے خزانے لٹانے میں خرچ ہوتا تھا مزیدہ اور بھابھی اگرچہ بلال کی اندرونی حالت سے کسی حد تک باخبر تھیں لیکن مصروفیات میں گھری وہ بھی اس کے درد کا مداوا کرنے کی کوئی تدبیر نہ کر پاتیں دھماکہ تو تب ہوا تھا جب بلال نے اچانک ہی فائزہ کی مایوں سے دو دن قبل اپنے کینیڈا جانے کی اطلاع دی تھی۔

سارے گھر والے اس اطلاع کو سن کر بہت ناراض ہوئے تھے گھر کی پہلی شادی تھی اور یوں عین وقت پر بلال کا عاقب ہونا کسی کو ہضم نہیں ہو رہا تھا پاپا نے ڈاٹا دانیال بھائی نے سمجھایا۔ دادی مئی عازہ چچی نے التجائیں کیں لیکن وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ کھٹکے کو تیار نہیں ہوا پاپا نے یہاں تک کہہ دیا کہ سیٹ کینسل کروا کرو لیسے کے اگلے دن کی بکنگ کروالو لیکن اس پر تو گویا کوئی بھوت سوار تھا ایک بار جو فیصلہ کر لیا تھا اسے کر لیا تھا اب کسی بھی طرح اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی۔

باوجود شدید ناراضی کے سب اسے چھوڑنے میں پورے گئے تھے پورے گھر میں شاید صرف بھابھی اور مزیدہ ہی تھے جنہوں نے اسے کچھ نہیں کہا تھا اس کے خیال میں ان حالات میں یہی بہتر تھا کہ بلال اس ماحول سے دور ہو جائے ورنہ فائزہ کو کسی اور کا ہوتے دیکھنا شاید اس کے لیے ممکن نہ ہوتا۔

درد تو مزیدہ کا بھی اس جیسا ہی تھا لیکن اس نے اپنی کیفیت کو ضبط اور اعلیٰ ظرفی کی ردا میں چھپا لیا تھا۔

جاتے سے بلال سب سے مل کر فائزہ تک پہنچا تو وہ بے اختیار رونے لگی۔
”مت جاؤ نا بلال!“ روتے روتے اس نے التجا کی۔

اس کی آنکھوں میں مچلتے آنسو دیکھ کر ایک بار تو بلال آفتاب کا دل بھی ڈول گیا لیکن پھر خود پر قابو پاتے ہوئے اپنے سابقہ انداز میں بولا۔

”کیوں نہیں جاؤں دشمن نمبروں۔ تمہاری خاطر میں اپنا مستقبل سنوارنے کا اتنا اچھا چانس مس کر دوں خود تو تم شادی کر کے چلتی بنو گی۔ پیچھے کوئی مجھ سے جھگڑا کرنے والا بھی نہیں بچے گا۔“

پھر اچانک ہی جیسے کچھ خیال آیا اپنے سر پر ہاتھ مار کر جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالنے لگا ساتھ ساتھ بولتا بھی جا رہا تھا۔

”فائزہ! تمہیں موبائل فون کا بہت شوق تھا نا اور اب تو ضرورت بھی ہو گی ظاہر ہے میں اتنی دور جا رہا ہوں تمہارا مجھ سے بات کرنے کا دل تو چاہے گا نا اس لیے میں تمہارے لیے یہ موبائل سیٹ لایا ہوں۔“ اس نے جیب سے ایک کھلوتا موبائل نکال کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

”تم کبھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔“ فائزہ نے تمللا کر وہی موبائل اس کے سینے پر دے مارا اور پلٹ کر جانے لگی۔

”اچھا بابا معاف کر دو آخری شرارت تھی یہ میری اب تو جا رہا ہوں یہاں سے پھر پتا نہیں تم سے ملاقات ہو یا نہ ہو۔“ بلال نے زبردستی اسے روک کر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اس پل صرف ایک لمحے کو اس کی آنکھیں جھللائی تھیں لیکن وہ بڑے کمال سے اس جھللاہٹ کو چھپا گیا تھا۔

فائزہ نے مسکراتے لبوں اور برستی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک دم ہی اس کے بندھے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ وہ تو ہمیشہ اس سے دو بدولڑتا تھا اس

کایوں ہارا ہوا روپ اسے اچھا نہ لگا۔

فائزہ کے ہاتھوں کی گرفت میں بلال کے ہاتھوں میں ایک پل کو سننا ہٹ دوڑی تھی پھر جلدی سے اپنا دایاں ہاتھ چھڑا کر اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال کر باہر نکالا اور ایک بار پھر اس سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا تھا اس نے یہ سب کچھ اتنی تیزی سے کیا تھا کہ فائزہ کے علاوہ کوئی اور محسوس بھی نہ کر سکا کہ بلال کے ہاتھ سے کوئی چیز نکل کر فائزہ کی مٹھی میں قید ہو گئی تھی۔

فائزہ ابھی اس کی حرکت کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ وہ تیزی سے سب کو اللہ حافظ کہتا ہوا اندر کی طرف چل پڑا۔

فائزہ نے اپنی مٹھی آہستہ سے کھول کر دیکھی تو ہتھیلی پر رکھی نازک مگر قیمتی گینوں کی انگوٹھی اس کی نظروں کو خیرہ کر گئی۔

”پاگل ہے یہ بلال تو بالکل ہی۔“ آہستہ سے کہتے ہوئے اس نے بلال کی جانب دیکھا جواب دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔

☆☆☆

”چلو نری بیٹا! آگے آؤ انگلی پکڑائی کی رسم تمہیں ہی کرنی ہے۔“ عازرہ چچی نے عباد کے برابر سے اٹھتے ہی نزہہ کو آواز دی جو اسٹج سے نیچے نزدیک ہی کھڑی ہوئی تھی۔

”میں چچی!“ نزہہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے خیرت سے پوچھا اس کے حساب سے تو یہ رسم فیچہ کو کرنی چاہیے تھی کیونکہ روایت یہی تھی کہ چھوٹی سالی مہندی لگا کر دولہا کی چھوٹی انگلی پکڑ لیتی تھی۔

”ہاں بھی تم ہی کو کرنی ہے یہ رسم۔ دولہا میاں کی شرط ہے کہ اگر نری نے انگلی پکڑی تو ہی ننگ دوں گا ورنہ نہیں۔“ عازرہ چچی نے ہنس کر بتایا تو ایک پل کے لیے نزہہ کے چہرے پر استعجاب کے رنگ پھیل گئے کیونکہ جب سے عباد نے اس کے اور بھابھی کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تھی دوبارہ پلٹ کر اس سے ملنے نہیں آیا تھا اور

اب یہ اچانک مطالبہ حیران کن ہی تھا۔

”جائیے نازی آپلی! ذرا موصوف کی ساری جیبیں تو خالی کر دئیے پھر پتا چلے گا شرطیں رکھنے کا انجام۔“ برابر میں کھڑی فیچہ نے اسے ٹھوکا دیا۔ ناچار نزہہ اپنا جارجٹ کا پنک شرارہ سنبھالتی اسٹج کی سیڑھیوں پر چڑھ گئی۔ یہ چار سیڑھیاں چڑھنا بھی اسے حد درجے مشکل لگ رہا تھا کیونکہ بالکل سامنے دو گھورتی آنکھیں اس کے قدموں کو لڑا رہی تھیں۔

عباد کے برابر بیٹھ کے اس نے پہلے اس کا منہ بیٹھا کر دایا پھر چھٹکی پر تھوڑی سی ہندی لگا کر ہر رنگ کے چھوٹے سے ٹکونے گوٹے لگے کپڑے کو اس پر پلیٹ دیا اور انگلی پکڑ کر بیٹھ گئی۔

عباد کی طرف منہ کر کے اس سے کچھ مطالبہ کرنا سخت دشوار لگ رہا تھا اس کی آنکھوں میں جو سرخی تھی وہ سنہنے کی تاب نزہہ میں نہ تھی اس کے اندر جولاؤ بھڑک رہا تھا اس کی آج چند انچ کے فاصلے سے بیٹھی نزہہ بخوبی محسوس کر رہی تھی۔

”اپنا ہاتھ نہ سہی انگلی تھامنے پر تو میں نے تمہیں مجبور کر ہی دیا۔“

نزہہ کی طرف جھک کر عباد سرگوشی میں بولا اس کے لہجے میں موجود پیش نزہہ کی سماعتوں کو جھلسانے لگی۔

”ارے آپ دونوں کیا سربراہان مملکت کی طرح چوری چھپے مذاکرات کرنے لگے ذرا کھل کر بات کیجئے اور محترمہ! آپ بھی ذرا اپنا مطالبہ با آواز بلند پیش کیجئے تاکہ اپنے یار کا دفاع تو کر سکیں۔“ عباد کے پیچھے کھڑے ایک دوست نے ان دونوں کو رکا۔

”یہ ایک بار مانگیں تو سہی ہم تو سب کچھ انہیں دینے کو تیار ہیں۔“ عباد ذومعنی لہجہ میں بولا۔

”اوہو.....“ عباد کی کھلی آفر پر سب نے ایک معنی خیز نعرہ لگایا۔

”آدمی گھر والی کے لیے کشادہ دلی کا یہ عالم ہے تو پوری کے لیے تو شاید

حضرت دنیا فتح کرنے نکل کھڑے ہوں گے۔“ عباد کے ایک کزن نے ہنس کر فرما چست کیا۔

صورت حال نزیبہ کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ ایک لمحے میں اس جگہ سے اٹھ کھڑی ہوتی لیکن ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ اب درحقیقت اس نے عباد کی انگلی نہیں تھامی ہوئی تھی بلکہ عباد نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

اوپنی آواز سے بچتے ڈیک بلند قہقہوں اور شوخ فہروں کے درمیان کسی اور کو تو اندازہ نہیں ہوا لیکن بھابھی نزیبہ کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو محسوس کر کے اس کی دے کے لیے اس کے قریب چلی آئیں۔

”چلی بھئی عباد! اب بچی کو زیادہ تنگ مت کرو جو کچھ دینا دلانا ہے دے کر فارغ کرو۔“ انہوں نے نرمی سے اسے گھر کا۔

عباد بھی اسے اتنا ستانے کے بعد شاید کچھ دیر کو سہی پر سکون ہو گیا تھا۔ شرافت سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر جیب میں سے چیک بک نکال کر ایک چیک سائن کر کے اسے دے دیا۔

چیک پر نظر پڑتے ہی نزیبہ یکدم سن ہو گئی یہ چیک بلیٹک تھا گویا اس نے اپنے کہے کے مطابق اپنا سب کچھ اسے دے ڈالا تھا۔

☆☆☆

”آئی! مان جائیں نا۔ جس دن آپ کہیں گی اس دن کا پروگرام رکھ لیں گے

لیکن پلیز انکار مت کیجئے۔“

فائزہ پچھلے دو گھنٹے سے اس کے کان کھا رہی تھی۔ ان سب لوگوں نے مل کر کہا سائیڈ جانے کا پروگرام بنایا تھا سب لوگ بڑے پر جوش تھے لیکن نزیبہ مسلسل انکار کر رہی تھی۔

”اب کیا مشکل ہے آپ کو چلنے میں اب تو آپ کا ہاؤس جاب بھی مکمل ہو!

ہے۔ رہا کلینک..... تو وہاں سے ایک دن کی چھٹی ملنا کچھ مشکل نہیں ہے آفر آل بڑے ابو کے دوست کا کلینک ہے۔“ فائزہ اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اب نزیبہ اس سے کیا کہتی کہ ساری مشکل تو بس عباد علی تھا جس نے نزیبہ کو گھر رکھا تھا۔ فائزہ اور اس کی شادی کو دو ڈھائی مہینے ہونے کو آئے تھے لیکن اس کی آنکھوں سے جھلکتی دیوانگی اب تک نزیبہ کو دھلائے رکھتی تھی نزیبہ سامنے ہوتی تو وہ اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر رکھ کر گویا اٹھانا ہی بھول جاتا تھا۔ اپنے پہلو میں بیٹھی جی سنوری حسین و جمیل بیوی بھی جیسے اس بل اسے دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس کی دیوانگی کہیں دوسروں کو بھی اپنی طرف متوجہ نہ کر لے کہیں کسی اور پر بھی یہ بھید نہ کھل جائے اس ڈر سے نزیبہ نے اس کے سامنے آنا ہی ترک کر دیا تھا۔ فائزہ کی آمد پر زیادہ تر وہ خود کو اپنے کمرے تک ہی محدود کر لیا کرتی تھی بھابھی اس کی ہمدردی ہم ساز تھیں اس لیے بھی کچھ آسانی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کی غیر موجودگی کو وہ مختلف بہانوں سے ٹال دیا کرتی تھیں کبھی کبھی اتفاقاً ہی ان لوگوں کا اچانک سامنا ہو جاتا تو نزیبہ کچھ دیر ہی سب کے ساتھ بیٹھتی پھر فائزہ کو لے کر اپنے کمرے میں چلی جاتی یا کبھی کچن میں بھابھی کی مدد کروانے پہنچ جاتی۔

اب جو پینک کا پروگرام بن رہا تھا تو اسے اندر ہی اندر وحشت ہو رہی تھی گھر میں تو پھر جائے پناہ مل ہی جاتی تھی بہانے بھی بہت ہوتے تھے لیکن پینک پر جانے کا مطلب تھا ایک پورا دن عباد علی کی آنکھوں کے سامنے اس کی وارفتگی و دیوانگی سے لڑتے ہوئے گزارنا۔

”بس بہت ہو چکی خوشامد۔ اب اگر آپ نے میری بات نہیں مانی تو میں بتا رہی ہوں کہ میں واپس اپنے گھر نہیں جاؤں گی بلکہ یہیں آپ کے کمرے کے سامنے بیٹھ کر بھوک ہڑتال شروع کر دوں گی۔“ جب فائزہ نے دیکھا کہ اس کی ہر التجا اور دلیل رائیگاں جا رہی ہے تو بالاخر دھمکی پر اتر آئی۔ ناچار نزیبہ کو ہار ماننا پڑی۔

پینک والے دن موسم حیرت انگیز طور پر خوشگوار تھا ورنہ پچھلے پندرہ دن سے

بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔

”خود کو اتنا مختلف کیوں بنا لیا ہے کہ دوسروں سے الگ رہنا پڑتا ہے۔“ تنہا چلتے چلتے اچانک اپنے بالکل نزدیک عباد کی آواز سن کر وہ ٹھٹھک گئی۔

”نہ میں مختلف ہوں اور نہ ہی دوسروں سے الگ رہتی ہوں۔ یہ صرف تمہاری غلط فہمی ہے۔“

رکھائی سے کہہ کر اس نے اپنے آگے بڑھتے قدموں کو روک لیا اب بے اختیار ہی اس کا رخ سمندر کی طرف ہو گیا تھا اور وہ پانی میں قدم رکھے آگے بڑھ رہی تھی۔ سب لوگوں سے اتنی دور عباد کے ساتھ نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ یونہی آج اسے غلط فہمی ہو گئی تھی کہ عباد کی توجہ اس کی طرف نہیں ہے۔ وہ اسے کھیل میں مست سمجھ کر ساحل کی ٹھنڈی ہوا میں اپنے دل کو سکون دینے نکل کھڑی ہوئی تھی۔

”تم مجھ سے اتنا بھاگنے کیوں ہو زنی!“ سمندر کی منہ زور لہروں کو خاطر میں نہ لاتا وہ بھی اس کے ساتھ اندھا دھند گہرے پانیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

نزہہ نے پلٹ کر کچھ جواب دینا ہی چاہا لیکن یکدم ہی ایک تبدلہر نے اس کے قدم اکھاڑ دیے اور وہ سیدھی اپنے سے ایک قدم کے فاصلے پر کھڑے عباد سے جا لکرائی۔

عباد نے بھی بے ساختہ ہی اپنی ہانپیں پھیلا کر اسے سمیٹ لیا تھا۔ کچھ بل یونہی خاموش گزر گئے۔ عباد کے بازوؤں کے حصار میں نزہہ کا وجود کپکپا رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے نزدیک تھے کہ ایک دوسرے کی سانپوں کی گرمی اور دل کی دھڑکن تک محسوس کر سکتے تھے لیکن اس وہ ایک اقرار تھا جسے سننے کے لیے عباد ٹٹی کے کان ترس گئے تھے۔

”صرف ایک بار کہہ دو کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے۔“ عباد علی کی سرگوشی میں اتنی تڑپ تھی کہ اس کی پناہوں میں کھڑی نزہہ کے کانوں میں اگر اس کی ماں کے ہنک آمیز جھلے اور فائزہ کی معصوم چہکاریں نہ گونج رہی ہوتیں تو وہ ایک بار تو اقرار کا سکھ

سورج مسلسل آگ برسا رہا تھا یہ لوگ صبح سویرے ہی سامان سے لدے پھندے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ سفرد گاڑیوں میں کیا جا رہا تھا۔ ایک کار دانیال کی تھی جس میں بھابھی نزہہ اور فیض بیٹھے تھے جبکہ عباد کی گاڑی میں فائزہ دادی می اور عازنہ چچی بیٹھی تھیں۔ عباد کی امی تو آج کل طوبی آپا کے گھر گاؤں گئی ہوئی تھیں جبکہ آفتاب صاحب کلینک کی وجہ سے ان لوگوں کے ساتھ شامل نہیں ہوئے تھے۔ فائزہ تو خود بھی دانیال کی گاڑی میں آنے کے لیے چل رہی تھی لیکن عازنہ چچی نے اسے ڈپٹ کر عباد کی گاڑی میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

”صرف راستے ہی کی توبات ہے بیٹا! وہاں تو سب ایک ساتھ ہی ہوں گے۔ اب اچھا تو نہیں لگے گا کہ بے چارہ عباد ہم بوڑھے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر بور ہو۔“

علیہرہ بیگم نے بھی اسے نرمی سے سمجھایا تو وہ بادل خواستہ منہ بناتے ہوئے خاموشی سے عباد کے برابر آ بیٹھی۔

سمندر پر پہنچ کر فائزہ اور فیض تو دیوانوں کی طرح پانی کی طرف دوڑیں جبکہ باقی لوگ ہٹ میں سامان وغیرہ رکھنے لگے۔ سامان سیٹ کرنے کے بعد باقی بیگ پارٹی بھی باہر نکل آئی۔ علیہرہ بیگم اور عازنہ چچی ہٹ کی کھڑکیوں میں کھڑی ہو کر سمندر کا نظارہ کر رہی تھیں جبکہ دادی کو ان لوگوں نے تھوڑی دیر آرام کی غرض سے لٹا دیا تھا۔

”ایک تو یہ زنی آپنی دن بدن بور ہوتی جا رہی ہیں۔ ابھی بلال بھیا ہوتے نا انہیں بالکل ٹھیک کر دیتے۔“ فیض نے بنا کر بولی تو سب کے ہنستے کھیلنے چہروں پر بل بل کے لیے اداسی چھا گئی، نٹ کھٹ سا بلال ان لوگوں کو بھولتا ہی کب تھا لیکن ایسے موقعوں پر تو اس پر دیس جا کے بس جانے والے کی یاد کچھ زیادہ ہی ستانے لگتی تھی۔

”بحث چھوڑو بھئی، ٹیم بناؤ۔“ بھابھی نے اس افسردگی کو ختم کرنا چاہا۔

نزہہ کچھ دیر تو ان لوگوں کا کھیل دیکھتی رہی پھر اٹھ کر کنارے پر ٹپلنے لگی۔

آج ورکنگ ڈے ہونے کی وجہ سے لوگوں کا رش نہیں تھا۔ نزہہ چلتے چلتے ان لوگوں سے کافی آگے نکل آئی تھی۔ یہاں تک کہ سمندر کے شور کی آواز میں ان لوگوں کی آواز بڑ

دے کر اس کے جلتے جلتے دل پر مرہم رکھ دیتی۔

لحموں کی فوس خیزی ختم ہو چکی تھی۔ نزیبہ عباد علی کی ہانہوں کا حصار توڑ کر اس سے دور ہٹنے لگی لیکن عباد نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔

”کنارے پر پہنچا دوں تمہیں تب ہی چھوڑوں گا۔ ورنہ تم تو مجھ سے بچنے کے لیے سمندر کی خطرناک لہروں پر سوار ہو جاؤ گی کہ شاید کہیں دور دیں جا کر بس سکو۔“

وہ لوگ واپس پلٹے تو سب پریشان کھڑے تھے کہاں چلے گئے تھے آپ لوگ ہم لوگ کھیل میں لگے تھے پتا ہی نہیں چلا۔“ فائزہ بولی۔

”آپ دونوں کیا سمندر میں سوئمنگ کر رہے تھے۔“ فبیحہ نے بھی دونوں کا جائزہ لیا۔ عباد کے کپڑے سینے تک گیلیے ہو رہے تھے جبکہ نزیبہ تو سر سے پیر تک بیگی ہوئی تھی۔

”شکر کرو واپس لے آیا ہوں تمہاری بہن کو۔ محترمہ دور جا کر اکیلے ہی اکیلے سمندر کی سیر کر رہی تھیں، سمندر بھی مذکر ہے اکیلی لڑکی سمجھ کر جھپٹ پڑا۔ وہ تو میں نے بروقت جا کر اس کی خبر لی ورنہ وہ تو لے اڑا تھا تمہاری بہن کو۔“ عباد کے بتانے پر سب کے منہ کھل گئے۔

دادی نے تو خاص طور پر حکم دے دیا کہ اب کوئی پانی میں زیادہ دور تک نہیں جائے گا۔ ساتھ ہی نگرانی کے لیے علیزہ بیگم اور عازنہ چچی کو بھی اس کے ساتھ بھیج دیا تا کہ یہ لوگ قابو میں رہیں۔

نزیبہ تو واپس نیچے گئی ہی نہیں اس کے تو اپنے اندر پورا ایک سمندر موجزن تھا جس نے اس کی ہستی کو طوفانوں میں ڈھکیل رکھا تھا۔ کپڑے تو اس نے کھانے سے پہلے ہی چینج کر لیے تھے اب خاموشی سے دادی کی گود میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔ دادی ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ ان کے خیال میں بچی خوفزدہ ہو گئی تھی۔

”ڈاکٹر نزیبہ! کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

ابھی وہ آخری مریض سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ انٹرکام پر رپیشنٹ نے اطلاع دی۔

”اوکے۔ آپ انہیں بٹھائیے میں آتی ہوں۔“ اس نے رپیشنٹ کو جواب دیا اور دل ہی دل میں حیران ہوتی ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ بھلا یوں ہاسپٹل میں اس سے ملنے کے لیے کون آسکتا تھا۔

”تم.....!“ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے جیسے ہی اس کی نظر سامنے صوفے پر بیٹھے عباد علی پر پڑی تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

”السلام علیکم۔“ اس کی سراپیسگی کو دیکھتے ہوئے عباد نے بڑے دل جلانے والے انداز میں مسکراتے ہوئے اسے سلام کیا۔

نزیبہ جو حقیقتاً اسے وہاں دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

”کیسے آتا ہوا؟“ معمول کے انداز میں اسے مخاطب کر کے نزیبہ نے اس کی شوریدہ سری کے سامنے بند باندھنا چاہا۔

”کبھی چکور سے پوچھتی ہو چاند کی طرف کیوں جاتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھتا بڑی آزر دگی سے پوچھ رہا تھا۔

اسے یوں ٹوٹا بکھرا دیکھ کر نزیبہ کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ کتنا عزیز تھا اسے یہ شخص ہمیشہ اس نے اس کے دکھ بانٹے تھے اور دل میں اس کی خوشیوں کی تمنا کی تھی۔

آج وہ سامنے لٹا لٹا سا بیٹھا تھا لیکن تسلی کا ایک حرف بھی نزیبہ کے پاس نہ تھا۔

”فائزہ کیسی ہے؟“ نزیبہ نے بات کا رخ بدلنا چاہا۔

”ملتی تو ہو روز اس سے کبھی پوچھا نہیں کیسی ہے جو مجھ سے پوچھ رہی ہو۔“ اس نے چڑ کر جواب دیا تھا۔

اس کے یوں چڑنے پر وہ خاموش ہو گئی۔

”کبھی مجھ سے بھی پوچھ لیا کرو کہ عباد علی کیسے ہو۔ زندگی کے بغیر کیسے جیتے ہو جب دردِ جد سے گز جاتا ہے تو کس کے آنچل میں پناہ لیتے ہو لیکن تمہیں تو اس سب سے کچھ غرض نہیں ہے۔ مجھے روز لہروں میں ڈوبنا ابھرتا دیکھتی ہو لیکن ہاتھ بڑھا کر بچاتی نہیں ہو کبھی تمہارے گھر جاؤں تو یوں میری نظروں سے چھٹی پھرتی ہو جیسے میں کوئی بہت ناپسندیدہ ہستی ہوں تمہارے لیے۔“ وہ سامنے بیٹھا پر شکوے کیے جا رہا تھا۔

”ڈاکٹرِ نزہہ! آپ کو ڈاکٹرِ عتیق اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔“ سسٹر عطیہ نے دروازے سے جھانک کر اطلاع دی تو نزہہ جو کہ عباد کے سامنے بالکل بے بس بیٹھی تھی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اوکے عباد! میں جا کر سر کی بات سنتی ہوں تم بھی گھر جاؤ اور پلیز اپنی سوچوں کو بدلنے کی کوشش کرو۔ زندگی کے حقائق کو تسلیم کر لو گے تو زندگی سہل وہ جائے گی تمہاری بھی اور دوسرے لوگوں کی بھی۔“ کمرے سے نکلتے نکلتے وہ اسے نصیحت کرنا نہ بھولی تھی۔

ڈاکٹرِ عتیق کے کمرے میں داخل ہوئی تو نظر ان کے سامنے بیٹھے شخص پر بھی پڑی لیکن وہ سرسری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فوراً ہی ڈاکٹرِ عتیق کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”سر! آپ نے مجھے بلایا تھا۔“

”ہاں! ہاں نزہی بیٹا! بیٹھو، میں نے تمہیں یہاں ایک خاص شخصیت سے ملنے کے لیے بلوایا ہے۔“ ڈاکٹرِ عتیق اس کے پاپا کے گھرے دوستوں میں سے تھے اس لیے اکثر اسے پاپا ہی کی طرف نزہی کہہ کر پکار لیا کرتے تھے۔

اب کے نزہہ نے کرسی پر بیٹھے ہوئے اس شخص کی طرف ذرا غور سے دیکھا، کافی وجہ شخصیت کا مالک تھا وہ شخص اس پر ڈیرنگ بھی کافی سلیقے سے کی ہوئی تھی۔ بلیک پینٹ پر لائٹ گرین کلر کی شرٹ پہن رکھی تھی گلے میں بندی ٹائی بھی شرٹ کے ساتھ بہت موزوں لگ رہی تھی ٹائی کی ٹاٹ جس خوبصورتی اور سلیقے سے لگائی گئی تھی

اس سے اس کی شخصیت کے شہراؤ اور مزاج کی مردوباری کا صاف پتہ چل رہا تھا۔

”یہ ڈاکٹرِ فصیح حسن ہیں۔ میرے اسٹوڈنٹ، جن کا میں تم سے کئی بار ذکر کر چکا ہوں اور فصیح! یہ ڈاکٹرِ نزہہ آفتاب ہیں۔ میرے کولیک آفتاب شیخ کی بیٹی۔ تم ملے ہو ان سے بھی دو تین بار۔“ ڈاکٹرِ عتیق نے تعارف کی رسم بھائی تو ان دونوں نے بھی مسکرا کر ایک دوسرے کو خوش کیا۔

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ آپ کے فادر کا تو اپنا ہاسپٹل ہے پھر آپ یہاں کیوں جاب کر رہی ہیں۔“ ڈاکٹرِ فصیح نے پوچھا تو وہ مسکرا دی۔

”آپ تو جانتے ہی ہیں گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔ وہاں پاپا می اور دانیال بھائی کے ہوتے ہوئے مجھ جیسی چھوٹی موٹی ڈاکٹر کو کون پوچھتا پھر انسان زندگی میں کچھ تبدیلی بھی چاہتا ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ گھر میں رہوں ان ہی کے ساتھ جاب بھی کروں بس اس لیے میں نے یہاں جوائن کر لیا۔“

نزہہ کا جواب سن کر ڈاکٹرِ عتیق نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر فصیح کو مخاطب کر کے بلے۔

”فصیح بیٹا! ایک وجہ اور بھی ہے۔ آفتاب جتنا اچھا اور نرم خوابا ہے اتنا ہی سخت باس بھی ہے۔ دو دن گئی تھی نزہہ اس کے ہاسپٹل گھبرا کر میرے پاس بھاگ آئی۔“

ڈاکٹرِ عتیق کے بتانے پر جہاں وہ محظوظ ہو کر مسکرایا وہاں نزہہ کے چہرے پر بھی ایک شرمندہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

کافی دیر وہ تینوں بیٹھے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اتنی اچھی کمپنی ملنے پر نزہہ کے اعصاب بھی کافی حد تک پرسکون ہو گئے ورنہ ابھی عباد سے ہونے والی ملاقات نے اسے کافی نینس کر دیا تھا۔

”اچھا ذرا تم دونوں بیٹھو میں ایک راؤنڈ لگا کر آتا ہوں۔“ ڈاکٹرِ عتیق ان لوگوں کو بیٹھا چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

”بس وہ عباد گاؤں گئے ہوئے ہیں تو میں نے سوچا میں کچھ دن یہاں رہنے آجاؤں۔“ فائزہ نے بے نیازی سے کہتے ہوئے لا پروا نظر آنے کی کوشش کی نزیہہ کا چاول کی ڈش کی طرف بڑھتا ہاتھ اس اطلاع پر بیچ میں ہی رک گیا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تو وہ اس سے ہاسپٹل میں ملا تھا لیکن اس نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔

”تو تم کیوں نہیں چلی گئیں اس کے ساتھ گاؤں؟“

نزیہہ نے پلیٹ سامنے سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

”چلی تو جاتی میں ان کے ساتھ لیکن وہ اپنے کسی پروگرام کی مجھے خبر تو ہونے دیں۔ بس اچانک گھر آئے منٹوں میں سامان پیک کیا اور یہ جاہ جا۔ میں تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اتنا غصہ آیا کہ بتا نہیں سکتی اس لیے میں بھی اپنا سامان لے کر یہاں رہنے آگئی ہوں۔“

فائزہ کے منہ پھلا کر بتانے پر نزیہہ کے چہرے پر تشویش پھیل گئی۔

”فائزہ! تم میرے کمرے میں چل کر بیٹھنا میں ابھی آتی ہوں۔“

”ہاں! اب بولو کیا مسئلہ ہے۔“ پانچ منٹ بعد ہی نزیہہ اس کے سامنے بیٹھی پوچھ رہی تھی۔

”کیا بولوں آپ! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ عباد کا رویہ میرے ساتھ عجیب سا ہے۔ شروع شروع میں تو میں یہی سمجھتی رہی کہ وہ سنجیدہ مزاج ہیں پھر ہم دونوں کے درمیان عمر کا فرق بھی ہے تو شاید ان کو میرے ساتھ بے تکلف ہونے میں وقت لگ رہا ہے۔ ان کی تو ہمیشہ آپ سے اور دانیال بھائی سے دوستی تھی۔ اتنے سنجیدہ لوگوں کی کمپنی جھوٹ کر مجھ جیسی اینٹیپور لڑکی کے ساتھ سیٹ ہونے میں کچھ وقت لگے گا لیکن ان کی نظر میں تو لگتا ہے میری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ نہ اپنی کوئی بات مجھ سے شیئر کرتے ہیں نہ کسی معاملے میں میری رائے لیتے ہیں اور تو اور مجھے میرا حق بھی یوں دیتے ہیں جیسے کوئی مجبوری ہو۔ کتنا ہی بن سنور لوں کتنی ہی اچھی ڈش بناؤں کان ان سے تعریف کا ایک لفظ سننے کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ شادی ان کی مرضی کے خلاف

”کب تک ہیں آپ یہاں کراچی میں؟“ نزیہہ نے پوچھا۔ یہ تو اسے گفتگو کے دوران پتا ہی چل گیا تھا کہ وہ اندرون سندھ کسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ میڈیکل کی تعلیم یہاں کراچی سے حاصل کی تھی پھر واپس اپنے گاؤں جا کر خدمت خلق کر رہا تھا۔

”بس آج رات رکوں گا یہاں ڈاکٹر عتیق کے گھر پھر کل صبح ہی نکل جاؤں گا۔ اصل میں میں یہاں ہاسپٹل کے لیے کچھ ضروری اشیاء کی خریداری کے لیے آیا تھا۔ کچھ ضروری آلات اور مشینری وغیرہ کا آرڈر دینا تھا۔ سوچا سر سے ملاقات بھی ہو جائے گا ساتھ ہی ان کے تجربے سے فائدہ بھی اٹھالوں گا۔ سر کے کافی تعلقات ہیں یہاں کا میں آسانی ہو جاتی ہے میرے پاس تو اتنا وقت نہیں ہے کہ یہاں لمبا عرصہ رک سکوں وہاں گاؤں میں ہاسپٹل کو بھی دیکھنا ہوتا ہے۔ زیادہ بڑا اسٹاف نہیں ہے ہمارے پاس ڈاکٹر تو میرے علاوہ صرف ایک ہی ہیں لیڈی ڈاکٹر ہیں اس لیے ان پر اتنا زیادہ بوجھ ڈالا بھی نہیں جاسکتا بلکہ میں سوچ رہا ہوں کہ ایک اور لیڈی ڈاکٹر کا بندوبست کرلو کیونکہ عموماً خواتین اور بچوں کے ہی زیادہ مسائل ہوتے ہیں اور اگر ایسے میں ڈاکٹر نہ ہو گھر جانا پڑا جائے تو کافی پر اہم ہو جاتی ہے۔“ اس کے چھوٹے سے سوال کا انہوں نے کافی تفصیلی جواب دیا تھا۔

ڈاکٹر عتیق کی آمد تک وہ دونوں ایسی ہی چھوٹی موٹی باتیں کرتے رہے پھر اٹھ کر اپنے روم میں واپس چلی گئی۔ یوں بھی اس کا ڈیوٹی ٹائم ختم ہونے والا تھا۔ تین چکے تھے۔ وہ واپس آ کر اپنی چیزیں سیٹھنے لگی۔

☆☆☆

گھر واپس آئی تو اس کی ملاقات فائزہ سے ہو گئی۔ پتا نہیں اس کا وہم و گہمت اسے فائزہ کچھ بھی سمجھی ہی دکھائی دی۔

”خیریت! آج اس وقت کیسے دکھائی دے رہی ہو؟“ نزیہہ نے اسے کر جابا۔ یوں بھی وہ عموماً رات آٹھ نو بجے تک ہی یہاں آیا کرتی تھی۔ کبھی اکیلی اور کبھی کے ساتھ۔

نظریں جھکائے وہ اسے عباد کی ایک بات بتا رہی تھی۔

نزہہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر فائزہ کو گلے لگاتے ہوئے اس کی پیشانی پر محبت سے ایک بوسہ دیا۔

”گڑیا! تم بے فکر رہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہیں کوئی الٹی سیدھی بات سوچنے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی اپنے گھر کو چھوڑ کر یہاں ناراض ہو کر بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا ہے تمہاری شادی کو تمہارے مزاجوں میں فرق ہے۔ اس لیے ایک دوسرے کو سمجھنے میں وقت لگے گا۔ تم اس پر توجہ دو اس کا خیال رکھو اس کی پسند ناپسند کو سمجھو پھر دیکھنا کیسے وہ تمہارے قابو میں آتا ہے۔ اگر کچھ الٹی سیدھی بات کرے تو آٹنی سے اس کی شکایت کر دیا کرو۔ ایک بار ڈانٹ پلائیں گی تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا لیکن پلیز عائرہ چچی یا دادی جان کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کرنا، ورنہ انہیں بہت دکھ پہنچے گا تمہاری تکلیف سے۔ میں ہوں نا تمہاری آپنی تمہارے ساتھ۔“

بولتے بولتے نزہہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

”ہیلو السلام علیکم سرا میں نزہہ بات کر رہی ہوں۔ کیا میں ڈاکٹر فصیح سے بات

کر سکتی ہوں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ آج رات وہ آپ کے گھر رکیں گے۔“

”ہاں بالکل کر سکتی ہو۔ ایک منٹ ہولڈ کرو میں بلاتا ہوں اسے۔“

نزہہ کے یوں فون کر کے ڈاکٹر فصیح سے بات کرنے کی خواہش پر ڈاکٹر عتیق حیران تو ہوئے تھے لیکن انہوں نے بنا کوئی سوال کیے ڈاکٹر فصیح کو فون کی اطلاع دی۔

ڈاکٹر عتیق کی طرح وہ بھی اس کے یوں اچانک فون کا سن کر چونک گئے۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر عتیق کے ساتھ گھر پہنچے تھے اور اس وقت بڑے ریلیکس موڈ میں بیٹھے ان کی وائف سے باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر عتیق کی کوئی اولاد نہیں تھی لیکن وہ خود اور ان کی بیگم دونوں ہی اپنے اسٹوڈنٹس کو اولاد کی طرح ہی عزیز رکھتے تھے۔

”لیس ڈاکٹر فصیح اسپتالنگ۔“ انہوں نے ریسیور اٹھاتے ہوئے ایک نظر گھڑی

پر ڈالی جو اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہی تھی۔

”معذرت چاہتی ہوں ڈاکٹر فصیح! آپ کو اس وقت ڈسٹرب کرنے پر لیکن مجھے اندازہ تھا کہ آپ اپنے جن کاموں کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں انہیں انجام دے کر گھر پہنچنے تک اتنا ٹائم ہو ہی جائے گا۔“ دوسری طرف سے وہ بڑے مہذب لہجے میں بول رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں، ہم ڈاکٹر زکی زندگی اور روٹین کے حساب سے یہ کوئی اتنا زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ کہیے ایسا کیا کام پڑ گیا مجھ سے جو آپ کو زحمت کرنی پڑی۔“

”اصل میں آپ دوپہر میں ذکر کر رہے تھے کہ آپ کو اپنے ہاسپٹل کے لیے ایک لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت ہے تو میں نے سوچا کیوں نا میں اپلائی کر کے دیکھوں۔“

ان کے پوچھنے پر اس نے بھی فوراً ہی مدعا بیان کر دیا۔ جب سے اس کی فائزہ سے بات ہوئی تھی۔ وہ اسی فکر میں تھی کہ کسی طرح یہ مسئلہ حل ہو جائے، بہت سوچنے پر اس کے ذہن میں یہی ترکیب آئی تھی کہ وہ ان لوگوں کی زندگی سے دور چلی جائے، جب وہ سامنے نہیں ہوئی تو عباد کا رخ خود بخود ہی فائزہ کی طرف ہو جائے گا۔ ابھی تو نزہہ کا بار بار نظر آنا اس کے زخموں پر کھرٹ جھنے ہی نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی انہیں کال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسری طرف وہ کہہ رہے تھے۔

”آپ نے کال کر لی سمجھیں آپ کو یہ جاب مل گئی یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ آپ ہمارے لیے کام کریں۔ ڈاکٹر آفتاب کی بیٹی اور ڈاکٹر عتیق کے ہاسپٹل میں جاب کرنے والی لڑکی کی قابلیت پر تو مجھے کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ آپ ایک بار اچھی طرح سوچ لیجئے کہ کراچی جیسے بارونق شہر کو چھوڑ کر آپ اتنی دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہ سکیں گی؟ پھر یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں جاب کرنے والوں کو اتنی زیادہ مراعات بھی نہیں دے پاتے کیونکہ ہاسپٹل ڈاکٹر زکی آسائشات سے زیادہ مریضوں کی ضروریات کو

”اس سب کی آپ بالکل فکر نہیں کیجئے۔ مجھے سیلری یا دیگر مراعات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ بس مجھے تو آپ کے ہاں جاب کرنی ہے۔“ وہ جلدی سے بولی کہ مبادا وہ کہیں گھما پھرا کر اسے انکار ہی نہ کر دیں۔

”او کے پھر آپ جب چاہیں جوائن کر لیں۔ آنے سے پہلے اطلاع کر دیجئے گا تا کہ کوئی شخص آپ کو اسٹیشن پر لینے آجائے۔“ ساتھ ہی انہوں نے اسے تفصیل سے اپنا ایڈریس سمجھا کر ٹیلی فون نمبر بھی لکھوا دیا۔

ٹیلی فون بند کرتے وقت ان دونوں افراد کے احساسات ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے ایک کو اطمینان تھا کہ زندگی کسی سیدھے راستے پر چل نکلے گی جبکہ دوسرا الجھن میں مبتلا تھا کہ آخر ایک اچھی خاصی زندگی جاب اپنا گھر اور فیملی چھوڑ کر ایک لڑکی اتنی مشکل زندگی کا انتخاب کیوں کر رہی ہے۔۔

”بس مجھے تو آپ کے ہاں جاب کرنی ہے۔“ اس کا جملہ ذہن میں گونجا تو پیشانی پر شکنیں سی پڑ گئیں۔ وہ بہت وجہ تھے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا اسٹوڈنٹ لائف سے لے کر آج تک وہ جہاں چلے جاتے تھے لڑکیاں ان پر فدا ہو جاتی تھیں لیکن نزیہہ آفتاب بھی ایسی ہی لڑکی ہوگی۔ انہیں معمولی سا گمان تک نہ گزرا تھا۔

☆☆☆

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ کوئی تک ہفتی ہے لڑکی ذات کے یوں گھر سے دور تمہارے ہی کی اگر سوشل ورک کا اتنا ہی شوق ہو رہا ہے تو یہاں بھی بہت موقع ہیں بہت سی کچی بستیاں ہیں شہر میں۔ جہاں لوگوں کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے تم وہاں اپنا ٹیکہ کھول کر بیٹھ جاؤ۔ اپنے پاپا کے ہاسپٹل کو وقت دو پھر تمہیں خود بھی پتا چل جائے گا کہ یہاں پر رہ کر بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔“ می نہایت غصے سے بول رہی تھیں جبکہ وہ سر جھکائے چپ چاپ سب کے درمیان بیٹھی تھی۔

دو دن نہایت خاموشی سے اپنے جانے کی تیاری کرنے کے بعد ابھی اچانک

ہی سب کو اپنی صبح روانگی کی اطلاع دی تھی۔

”تم نے سوچ کیسے لیا کہ تم بغیر ہماری اجازت کے جو چاہے فیصلہ کر لوگی جہاں جانا چاہو گی چلی جاؤ گی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے تمہاری نظر میں گھر کے بڑوں کی اس گھر میں تو لگتا ہے اولاد نے ماں باپ کو دکھ دینے کا ہی فیصلہ کر رکھا ہے۔ پہلے وہ بلال چلا گیا اچانک لیکن وہ زیادہ اچھے مستقبل کے لیے جا رہا تھا اس لیے برداشت کر لیا لیکن تم..... تم کیا کرنے جا رہی ہو نزی! ابھی تمہیں پریکٹس کرتے عرصہ ہی کتنا گزرا ہے۔ تمہیں تو یہاں ہم لوگوں کے ساتھ رہ کر کچھ سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے کسی فیلڈ میں اسپشلائزیشن کرنی چاہیے اور تم جاری ہو ایک گاؤں میں بھلا وہاں جا کر تم کیا سیکھو گی۔ اور کیا ترقی کرو گی۔“

می کا لیکچر مسلسل جاری تھا۔ باقی سب لوگوں کو بھی اس کی اس خود سری پر کافی شک لگا تھا۔

”میں کچھ نہیں جانتی مجھے جانا ہے۔ میں نہ صرف کل صبح کی ٹرین سے بنگلہ کروا چکی ہوں بلکہ وہاں پر اپنے آنے کی اطلاع بھی دے چکی ہوں۔“ نہایت گستاخی سے کہتی وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

دانیال بھائی نے اس کے پیچھے جانا چاہا لیکن پاپا کی آواز نے ان کے قدم روک لیے۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کو اس سے بات کرنے کی جو لڑکی اپنے والدین اور بزرگوں کی بات ماننا تو دور کی بات ان سے مشورہ تک کرنا گوارا نہ کرے میں خود بھی اسے اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔ جانے دو جہاں جانا چاہتی ہے بلکہ سب نوگ کان کھول کر میری بات سن لیں۔ اگر کسی نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی یا اس سے کوئی تعلق رکھا تو پھر مجھ سے اپنا ہر تعلق ختم کر لے۔“

ہمیشہ کے نرم خو، محبت کرنے والے آفتاب شیخ اس قدر تلخ لہجے اور بلند آواز میں بول رہے تھے کہ ہر شخص اپنی جگہ ساکت ہو گیا اپنے کمرے میں بیٹھی نزیہہ نے بھی

ان کا ہر لفظ بخوبی سنا تھا۔

”دیکھ لو عباد! تمہاری محبت میری راہ میں نہ جانے اور کتنے کا نئے بچائے گی۔ شہر تو میں چھوڑ کر جا ہی رہی تھی گھر والوں نے دل سے بھی نکال دیا۔“ بے تحاشا آنسو بہاتی وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھی جس کی جنوں خیزی نے اس سے آج ایسا کٹھن فیصلہ کروایا تھا۔

بارہ گھنٹے کا طویل سفر طے کر کے جب وہ ڈاکٹر فصیح کے گاؤں پہنچی تو اسٹیشن پر رات اتر آئی تھی قلی سے سامان اتروا کر وہ ابھی ارد گرد کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ اس کی نظر اپنی طرف قدم بڑھاتے ڈاکٹر فصیح پر پڑی۔

”السلام علیکم“ دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو سلام کیا پھر قلی کو اشارہ کرتے اسے اپنے ساتھ لیے سفید رنگ کی ہائی روف کی طرف بڑھ گئے۔

”تشریف رکھیے۔“ اس کا سامان پیچھے رکھوا کر انہوں نے اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا۔

”تھینک یو۔“ شکریہ ادا کرتی وہ بیٹھی تو انہوں نے بھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

”ہاسپٹل کی گاڑی ہے یہ ڈرائیور اس وقت موجود نہیں تھا اس لیے میں خود آپ کو لینے آ گیا۔ آپ کیسے راستہ کیسے کٹنا آرام سے پہنچ گئیں آپ یہاں۔“ انہوں نے گاڑی کے اندر جلتی لائٹس کی روشنی میں گہری نظروں سے اس کی سوچی ہوئی آنکھوں اور سرخ ناک کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی..... آرام سے آئی ہوں پہلے سے بنگلہ کروالی تھی اسی لیے کوئی مشکل نہیں ہوئی البتہ ٹرین میں اتنے لمبے سفر کی عادت نہیں ہے اس لیے کچھ سر میں درد ہو گیا ہے۔ تھوڑا سا قلو بھی ہو رہا ہے مجھے۔“ اسے اندازہ تھا کہ رات بھر جاگنے اور مسلسل رونے کی وجہ سے اس کے چہرے کی حالت کیسی ہو رہی ہے، اس لیے فوراً انہیں مطمئن کرنے کے لیے وضاحت دے دی۔

”اوکے، ہاسپٹل پہنچ کر میں آپ کو کوئی میڈیسن دے دوں گا، کھانا کھا کر لے لیجئے گا، انشاء اللہ صبح تک بالکل فریش ہو جائیں گی۔“ انہوں نے بھی جیسے اس کی وضاحت کو قبول کر لیا۔

تقریباً دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ لوگ ہاسپٹل پہنچ گئے تھے اسے اس کا رہائشی کمرہ دکھا کر وہ فوراً ہی واپس پلٹ گئے تھے البتہ کچھ ہی دیر میں ایک ملازمہ کھانے کی ٹرے لے کر پہنچ گئی تھی۔ ساتھ ہی کچھ دوائیں بھی تھیں۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ میں کھالوں گی کھانا ابھی ظہر کر برتن صبح میں لے جانا۔“ اس سے پہلے کہ ملازمہ جو شاید ہاسپٹل کی آیا تھی اس سے انٹرویو شروع کرتی اس نے اسے چلتا کیا۔ وہ بے چاری کچھ بولنے کے لیے منہ کھول کر ہی رہ گئی۔

رات بھر جاگنے اور دن بھر کے سفر نے اسے بے انتہا ٹھکا ڈالا تھا۔ سامنے نظر آتے اٹیچڈ باتھ کو دیکھ کر اس کے دل میں شاور لینے کی شدید خواہش پیدا ہوئی اور وہ کھانے کو فی الحال نظر انداز کر کے اندر گھس گئی۔ ٹل کھولا تو پتہ چلا کہ پانی کافی ٹھنڈا ہے اور گیزر کا کوئی انتظام نہیں ناچا اس نے ٹھنڈے پانی سے ہی غسل تو کر لیا لیکن جب وہ واپس کمرے میں آئی تو اس کے باقاعدہ دانت بخ رہے تھے۔ ایک تو موسم ہی کافی خنک تھا اس پر ٹھنڈے پانی سے غسل نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اپنی غیر ہوتی حالت کے سبب اس کا دھیان کھانے یا دوا کی طرف بالکل نہیں گیا۔ بالوں کو تو لیے میں لپیٹ کر بیگ سے چادر نکالی اور اسے سینے تک تان کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس بل ایک انجان جگہ پر انہوں سے دور تنہا بیمار حالت میں ہونے پر اس کا دل بھر آیا۔ آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر نیکے میں جذب ہونے لگے۔ بیماری میں سب کتنا خیال رکھتے تھے اس کا وہ ڈاکٹر ہوتے ہوئے خود دوا کھانے کی چور تھی اس لیے کوئی نہ کوئی اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ اسے اپنی نگرانی میں پابندی سے دوا کھلائے، ورنہ سب جانتے تھے کہ وہ خود سے کبھی دوا نہیں لے گی، اس وقت بھی وہ روتے روتے جانے کب غنودگی میں چلی گئی تھی۔

صبح ملازمہ ناشتے کا معلوم کرنے آئی تھی لیکن اسے بستر پر بخار سے نڈھال نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا دیکھ کر اٹلے قدموں لوٹ گئی۔

”ڈاکٹر صاحب! وہ جو نئی ڈاکٹر نی آئی ہیں جی ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بے ہوش پڑی ہیں اپنے کمرے میں سارا بدن جل رہا ہے بخار سے۔“ اس کے اطلاع دینے پر دین محمد کا چیک اپ کرتے ڈاکٹر فصیح فوراً ہی اس کے پیچھے زہیہ کے کمرے کی طرف چل پڑے۔

الماری سے کبل نکال کر ڈالوان کے اوپر۔ انہوں نے ایک نظر میں ہی ساری صورت حال کا جائزہ لے لیا تھا کھانے کی ٹرے اور دو انکس جوں کی توں سائیڈ ٹیبل پر دھری تھیں رات غسل کے بعد شاید وہ بال خشک کیے بغیر ہی سو گئی تھی کیونکہ نیکے پر پڑا گیلا تولیہ اور چہرے کے گرد پھیلے الجھے الجھے بال دور سے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ چہرہ جو کل ہی کافی سرخ ہو رہا تھا اس وقت بخار کی شدت سے دھک رہا تھا۔

”آئے ہائے۔ رات ڈاکٹر نی صاحبہ نے ٹھنڈے پانی سے ہی نہا لیا۔“ الماری سے کبل نکال کر اس پر ڈالنی ملازمہ نے شاید اب غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”تم سے کہا نہیں تھا میں نے ڈاکٹر صاحبہ سے ان کی ہر ضرورت کا پوچھ لینا پھر تم نے انہیں پانی گرم کر کے کیوں نہیں دیا؟“ اس کی کلائی پکڑے نبض چیک کرتے ڈاکٹر فصیح جھنجھلا اٹھے۔

”جی میں نے پوچھنا چاہا تھا لیکن انہوں نے مجھے بات کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں دیا۔ میں بھی ڈر کر باہر نکل گئی۔“ وہ گھبرا کر وضاحت دے رہی تھی۔

”اچھا تم ایسا کرو فوراً ڈاکٹر نائلہ کو بلا کر نافہاں۔“ ان کے انداز میں تشویش در آئی تھی۔

”ڈاکٹر نائلہ فوراً ہی ان کا بلاواسطہ کر دوڑی آئی تھیں۔“

”پلیز ڈاکٹر نائلہ! آپ ماسی خیراں کے ساتھ مل کر ذرا ان کو دیکھیں ان کے بیک میں سے کوئی موٹے کپڑے وغیرہ دیکھ کر پہنائیں، میں اسٹریچر بھجواتا ہوں۔ انہیں

وارڈ میں شفٹ کرنا ہو گا۔ ان کی کنڈیشن کافی خراب ہے۔ میرا خیال ہے کہ نمویے کا ایک ہوا ہے۔“

ڈاکٹر نائلہ کو ہدایات دینے کے بعد وہ جلجت میں کمرے سے نکل کر ہسپتال کی بلڈنگ کی طرف بڑھ گئے تھے۔

☆☆☆

”اف تم نے تو ہم سب کو پریشان ہی کر ڈالا۔ سوچا تھا تم آؤ گی تو کام کا لوڈ کم ہو جائے گا۔ ساتھ ایک دوست بھی مل جائے گی لیکن تم نے تو آتے ہی اپنی خدمت کروانا شروع کر دی۔ سارے مریض بھی پریشان ہیں کہ جو ڈاکٹر آتے ہی خود بیمار پڑ گئی ہمارا علاج کیسے کرے گی۔“ ڈاکٹر نائلہ اس کا بی پی چیک کرتے ہوئے ساتھ ساتھ بولتی جا رہی تھیں۔

اور وہ خود بجائے کوئی جواب دینے کے بس مسکرا رہی تھی۔ گزشتہ ایک ہفتے میں سے ان کے مزاج کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا وہ بولتی بہت تھیں لیکن کام اس سے بھی زیادہ کرتی تھیں اس ایک ہفتے میں انہوں نے اس کا بے انتہا خیال رکھا تھا۔ نہ صرف ہری توجہ سے اس کا علاج کیا تھا بلکہ بھرپور کمپنی بھی دی تھی اس کے دوا کھانے سے بچنے کی عادت تو یوں بھی ان سب پر عیاں ہو گئی تھی اس لیے بطور خاص وہ اسے اپنی نگرانی میں دوائیں کھلاتی تھیں۔

”السلام علیکم! کیا حال چال ہیں ڈاکٹر پلس مریض کے۔“ اسی وقت ڈاکٹر فصیح کی نٹ کھٹ سی چھوٹی بہن مریم نے ان کے ساتھ کمرے میں انٹری دی۔

”حال کیا ہونے ہیں بالکل فٹ فاٹ ہے۔ آخر ہم ہی ماہر ڈاکٹر ملی ہے علاج کرنے کے لیے۔“ ڈاکٹر نائلہ زہیہ سے پہلے خود شرارتی لہجے میں بولیں۔

”چلیں لے لیں میرے بھیا کا سارا کریڈٹ آپ خود لیکن اس سوپ کی داد تو کرف مجھ ہی کو ملے گی جو میں گھر سے بنا کر لائی ہوں۔“ گرم گرم سوپ پیالے میں نکال کر زہیہ کو پیش کرتی مریم نے ہنس کر کہا تو ڈاکٹر نائلہ بھی ہنستے ہوئے اسے ایک

چیت لگاتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

”شکریہ، آپ سب کا، آپ لوگوں نے میرا بہت خیال رکھا۔“

اس نے سنجیدگی سے چیجر پر بیٹھے ڈاکٹر فصیح کو مخاطب کر کے کہا درحقیقت وہ ان سب کی تہہ دل سے مشکور تھی۔ جنہوں نے اسے اپنوں سے دروی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ ہاسپٹل کے اسٹاف کے علاوہ ڈاکٹر فصیح کی والدہ اور بہن نے بھی اس کا پورا خیال رکھا تھا تقریباً روز ہی وہ ہاسپٹل آتی تھیں ساتھ ہی اس کے لیے پرہیزی کھانا بھی ہوتا تھا۔

”آپ کا خیال رکھنا ہم سب کا فرض تھا۔ ہم یہاں صرف کو لیکز نہیں بلکہ ایک خاندان کے افراد کی طرح رہتے ہیں۔ آپ کی جگہ کوئی بھی اس صورتحال سے دوچار ہوتا ہم اس کا ایسے ہی خیال رکھتے لیکن آپ بتائیے کہ آپ نے کیا خودکشی کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنے کی کوشش کی تھی۔“ سنجیدگی سے بولتے ہوئے ان کی آنکھوں میں شرارت کی ایک رمت سی ابھری تھی لیکن لہجہ اور انداز ہنوز سنجیدہ ہی تھا۔

نزیبہ نے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اپنا رخ مریم کی طرف موڑ لیا جو اس سے نہ جانے کیا پوچھ رہی تھی۔

☆☆☆

”نزی شہر چھوڑ کر چلی گئی۔ مگر کیوں؟“ ایک ہفتہ گاؤں میں گزار کر آنے کے بعد جیسے ہی عباد کو یہ اطلاع ملی اسے شدید شاک لگا۔

لیکن اگلے ہی بل اسے اس کیوں کا جواب اپنے اندر سے مل گیا۔

”وہ یقیناً مجھ سے فرار چاہتی ہے۔“ اس سوچ نے اس کے اندر وحشت کا بھردی تھی۔

”کہاں گئی ہے وہ؟“ اس نے کڑے تیوروں سے فائزہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت اسے فائزہ کی صورت سے چڑ ہو رہی تھی۔ یہ تو اس نے شادی کے شروع دنوں میں ہی بھانپ لیا تھا کہ فائزہ اس سے محبت کرتی ہے اور شاید نزیبہ بھی۔

حقیقت جان گئی تھی جو اس نے عباد کو خود سے بدگمان کر کے فائزہ کے لیے راہ ہموار کر دی ان دنوں تو شاید جذباتی ہیجان اور صدمے کے تحت وہ فائزہ کو قبول کر بیٹھا تھا۔ لیکن شادی کے بعد جب اس نے کڑی سے کڑی ملانی شروع کی تو ہر بات اس کی سمجھ میں آتی چلی گئی۔

”مجھے تو خود نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئی ہیں۔ بلکہ گھر میں کسی کے پاس بھی ان کا ایڈریس نہیں ہے۔ اصل میں بڑے ابو اور بڑی امی بہت ناراض ہیں ان کے اس طرح جانے سے بڑے ابو کے ڈر سے کسی نے جانے سے پہلے ان سے بات تک نہیں کی مجھے تو ان کے جانے کے بعد پتا چلا۔ اگر مل کر جاتیں تو شاید میں ہی ان سے ایڈریس لے لیتی۔“ فائزہ روہانسی ہو کر اسے تفصیل بتا رہی تھی۔

تفصیلات سن کر عباد کی آنکھیں لہو رنگ ہو گئیں۔ غصے میں جھنجھلا تا راتے میں آئی ہر چیز کو ٹھوکر مارتا وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ جب کہ فائزہ اس کے اتنے شدید رد عمل کو تعجب سے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

نزیبہ نے بہت جلد ہی اپنی ڈیوٹی سنبھال لی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ اس ماحول میں ایڈجسٹ ہوتی جا رہی تھی۔ ویسے بھی جس طرح وہ اپنے پیچھے سب راتے بند کر کے آئی تھی اسے اپنے آپ کو یہاں ایڈجسٹ کرنا ہی تھا۔ گھر والوں کی یادخون کے آنسو رلائی تھی۔

ڈاکٹر فصیح یوں تو ابتدا میں اس کے صرف ایک جملے سے اس کی طرف سے مشکوک ہو گئے تھے لیکن اب کافی حد تک مطمئن تھے جس بے نیازی کے ساتھ وہ ان سے پیش آتی تھی اسے دیکھتے ہوئے وہ اتنا تو سمجھ ہی چکے تھے کہ یہاں آنے کا فیصلہ اس نے ان کی ذات کے پیش نظر نہیں کیا تھا بلکہ وہ تو ہر لمحہ اپنے ہی کسی دھیان گیان میں گم رہتی تھی۔ یہ نہیں کہ وہ ان سے بے اعتنائی برتی ہو بلکہ اس کا انداز ان کے ساتھ بالکل ویسا ہی تھا جیسے ڈاکٹر نائلہ، اماں جی، مریم اور اسٹاف کے دیگر لوگوں کے ساتھ کام میں

بھی اس کی لگن بہت زیادہ تھی۔ ہسپتال آنے والی کتنی ہی خواتین اور بچے اس سے متاثر تھے۔ خود مریم ہر وقت اس کے گن گاتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ اسپتال کے مالک احمد عثمانی صاحب تک اس سے بہت متاثر تھے خود ڈاکٹر فصیح جو عمر کے پینتیس سال گزر جانے کے بعد بھی اماں اور مریم کی ہزار خواہش کے باوجود اب تک شادی کے لیے تیار نہیں ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کے سحر کا شکار ہوتے جا رہے تھے۔ وہ جو ہمیشہ سوچتے تھے کہ شادی انہیں ان کی ذمہ داریوں سے دور کر دے گی اب آنکھوں میں کچھ خواب سجانے لگے۔ کیونکہ انہیں لگتا تھا کہ نزیبہ ہی وہ لڑکی ہے جو ان کے مشن میں ان ہی کی طرف بے غرض ہو کر ان کا ہاتھ بٹا سکتی ہے۔ لیکن خود اس کے اپنے دل میں کیا ہے وہ کبھی نہ جان سکے تھے۔ یوں تو وہ بڑی سادہ لگتی تھی لیکن انہیں اس کی ذات کے چند بند راستوں کو دیکھ کر بڑی الجھن ہوتی تھی۔

☆☆☆

”ہوں.....“ ساری تفصیلات جان کر ڈاکٹر فصیح نے ایک ہنکارا بھرا وہ اس کے ساتھ نہر کے کنارے بیٹھے تھے لیکن انہوں نے یہیں بیٹھے بیٹھے تصور کی آنکھ سے اس کے ساتھ اس کے ماضی کا سفر کیا تھا۔ ایک تھکن سی تھی جو ان کے روم روم میں اتر آئی تھی کیا تھا جو قدرت اس پیاری لڑکی کو اس کی محبت عطا کر دیتی اور کیا تھا جو خدا ان کے بجز دل کو اب بھی یوں ہی بجز رکھتا اس میں یوں کسی کی محبت کا پھول نہ کھلاتا دل زندگی میں پہلی بار کسی کی رفاقت کا تمنائی ہوا تھا لیکن وہاں تو جیسے کسی کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ جو سامنے بیٹھا تھا وہ اسے دکھائی ہی نہیں دیتا تھا اور جو دور تھا وہ نظر سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔

ایک گہری سانس لے کر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے جو ہونٹ بھیجنے تک پانی پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔

”ہو سکتا ہے۔ اپنے حالات کے مطابق آپ نے صحیح فیصلہ کیا ہو لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنے گھر والوں کی رضا مندی سے یہ قدم اٹھانا چاہیے تھا ٹھیک ہے

آپ یہاں رہیں جاب کرتیں لیکن ان سب کی خوشی سے آخر آپ ایک شخص کی وجہ سے کب تک ان سب کے بغیر رہیں گی اور پھر کیوں۔ آپ کا اور اس کا جو رشتہ بن چکا ہے اسے آپ دونوں ہی کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کتنی سکی ہوئی ہوگی آپ کے والدین اور گھر والوں کی آپ کے اس اقدام سے آپ نے تو ان کی عمر بھر کی چاہت کو یکسر رد کر دیا۔“ وہ اسے نرم لہجے میں ملاہٹ کر رہے تھے۔

”آپ نہیں سمجھ سکتے میری مجبوری کو عباد کو دل سے نکالنا اگر میرے اختیار میں نہیں ہے تو اس کی وحشت اور جنون کے آگے بند باندھنا بھی حد سے زیادہ مشکل ہے۔ آپ خود سوچیے کہ باوجود اس کے کہ گھر کے کسی فرد کے پاس میرا ایڈریس نہیں ہے۔ اس نے مجھے تلاش کیا ہے اور کیا اس کے بھیجے کارڈ پر لکھی نظمی آپ نے نہیں پڑھی تھی وہ اب بھی میرے ہی انتظار میں جی رہا ہے۔ اس کے دل سے میری طلب لگی ہی نہیں ہے۔ ایسے میں اگر میں اس کے آس پاس رہتی تو یہ تیل اور آگ کا کھیل ہوتا جس میں وہ سب کچھ جلا کر جسم کر ڈالتا۔ فائزہ کے ارمان عازرہ چچی کی خوشیاں می پاپا کا سکون اور ہمارے گھر کی عزت سب برباد ہو جائے تو کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ ان سب کے بجائے نزیبہ آفتاب ہی برباد ہو جائے۔“

☆☆☆

ڈاکٹر روم میں داخل ہوتے ہی نزیبہ کو کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا تھا۔ روم میں ڈاکٹر فصیح اور ڈاکٹر نائلہ دونوں موجود تھے۔ اور دونوں ہی کے چہروں پر حد درجہ سنجیدگی طاری تھی۔

”خیریت“ آپ نوگ ایسے کیوں بیٹھے ہیں؟“ اس نے دونوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ابھی تقریباً پندرہ منٹ پہلے ڈاکٹر عتیق کا فون آیا تھا۔ تمہاری کزن فائزہ پھلانگ رہی ہیں۔“ انہوں نے دھیرے سے اسے مطلع کیا۔

”لیکن کیوں وہ تو.....؟“ بے یقینی سے اس کی آنکھیں ایک پل کو پھیلی تھیں۔

”کیوں ہوا اس کے ساتھ ایسا یقیناً تم نے کچھ کہا ہوگا، آپریشن کی نوبت کیوں آئی تم لوگ یقیناً مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔“ یکدم ہی اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا تھا۔ فائزہ کی اچانک یہ حالت..... سب کے جامد و ساکت چہرے اس کے کان مائیں سائیں کرنے لگے تھے بھابھی تھوڑی دیر پہلے گھر گئی تھیں۔ وہ سب کو نظر انداز کر کے نیکی کے ذریعے گھر پہنچ گئی۔

”بھابی! مجھے سب سچ بتائیں۔ آپ کو میری قسم مجھے کیوں لگ رہا ہے جیسے کچھ غلط ہوا ہے آپ لوگ اس طرح ری ایکٹ کیوں کر رہے ہیں بتائیں نا!“ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اسے دیکھنے لگیں۔ کتنا کچھ برداشت کیا تھا اس نے پھر بھی اس کی ہر ریاضت رائیگاں گئی تھی۔

نزی! فائزہ نے سلیپنگ پلیز لے لی تھیں۔“ انہوں نے گویا دھماکہ کیا تھا۔“ تو فوری طور پر پتا چل گیا ورنہ دونوں جان سے جاتے اور اس کی تو کوشش بھی یہ ہی تھی۔ عباد ہی اسے ہاسپٹل لے کر بھاگا۔“

”مگر کیوں.....“ وہ چیخ ہی پڑی۔

”یہ تو اللہ جانتا ہے یا وہ..... کوئی تو بات ہوگی تا جس نے اسے اس حال تک پہنچایا اور ویسے بھی اس کی جذباتیت سے تم واقف ہو۔“ انہوں نے رساں سے کہا اور وہ لگے ہارے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی آئی جہاں کی ہر چیز جوں کی توں لڑی تھی ہاں مگر سائیڈ ٹیبل پر پیرڈیٹ کے نیچے وبادہ تہہ کیا ہوا کاغذ جیسے ابھی کسی نے لکھا ہو۔ اس نے ذرا سا جھک کر اسے اٹھا لیا۔

”ڈیر زنی آئی!“

آپ کو میرا آخری سلام۔

کتنا درد دیا ہے آپ نے اپنی فائزہ کو۔ اپنی اور بلال کی خوشیاں میرے دامن لڑال کر مجھے خوش رکھنے کی جو کوشش آپ نے کی تھی وہ کتنی ناکام رہی یہ تو آپ جان مائیں گی کتنی محبت تھی آپ لوگوں کے دل میں میرے لیے جو آپ لوگ ساری زندگی

ڈاکٹر فصیح اس کے قریب چلے آئے وہ جانتے تھے کہ اس کے لیے یہ خبر بہت زیادہ شاکنگ ہوگی۔ وہ فائزہ کے لیے کس قدر حساس تھی اس کے چہرے کی بدلتی رنگت سے عیاں تھا۔

”نزیہ! پلیز ہمت سے کام لیجئے ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی۔ ابھی ہمیں کراچی پہنچنا ہے اگر آپ کی یہی حالت رہی تو اتنا لمبا سفر کیسے طے کریں گی۔ ڈاکٹر عتیق کہہ رہے تھے کہ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے دراصل کسی پیچیدگی کے باعث ان کے ہاں وقت سے پہلے بچگی کی ولادت ہوئی ہے آپ کو تو پتا ہے ہمارے ہاں اس طرح کے کیسز عام ہیں۔“ وہ اسے سمجھا رہے تھے اور نزیہ بخوبی سمجھ رہی تھی کہ فائزہ کے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہوگا ناز و نعم میں پٹی فائزہ کو کیا معلوم کہ بے اعتنائی بے رخی کا درد کیا ہوتا ہے۔ ان لمحوں میں وہ دونوں جانتے تھے کہ فائزہ کی یہ حالت عباد علی کے کسی رویے کی وجہ سے ہی ہو سکتی ہے۔ ورنہ وہ ہر لحاظ سے صحت مند اور خوش باش لڑکی تھی۔

وہ دوڑتی بھاگتی ہاسپٹل پہنچی تھی آٹھ گھنٹے کا طویل سفر اس کے لیے عذاب مسلسل کی طرح تھا اس کے دھیان میں بار بار فائزہ کی صورت آ رہی تھی جانے کس حالت میں تھی اور اس کی اس حالت کا ذمہ دار عباد علی تھا۔ یہ بات اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔

”آپ لوگوں نے اس کا خیال کیوں نہیں رکھا اگر اسے کچھ ہو جاتا تو.....“ وہ ماں اور بچی دونوں کو انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں مشینوں میں جکڑے دیکھ کر بلک بلک کر رو دی۔

”اللہ کے ہر کام میں کوئی مصلحت ہوتی ہے ہم نے تو کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ پھر بھی پتا نہیں کیسے ہو گیا۔“ دادو اسے سمجھا رہی تھیں۔ ان لمحوں میں سب اس سے ناراضی کو یکسر فراموش کر چکے تھے۔ عباد علی بھی ایک کونے میں مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

حزن و ملال کی تصویر بنی وہ اس کے پاس چلی آئی۔

بس مجھے دیتے ہی چلے گئے۔ کتنا کتر کر دیا آپ لوگوں نے مجھے ہمیشہ دیا ہی دیا کبھی کمر مانگا نہیں یہاں تک کہ اپنی اور بلال کی خوشیاں بھی۔

عباد کی محبت شاید میری نوعمری کی وہ حماقت تھی جس نے آپ کی ایک عمر کی دوستی اور محبت میں دراڑ ڈال دی میں حیران تو ہوئی تھی آپ کے اور عباد کے رویوں پر لیکن کبھی اصل وجہ نہیں جان پائی۔ اور شاید ساری عمر یوں ہی آپ کی قربانیوں اور مہربانیوں کے بوجھ تلے دبی رہتی۔ جو اگر آپ کے اچانک شہر چھوڑ جانے پر عباد کو پاگل ہوتے نہ دیکھتی۔

مجھ سے بیگانے تو وہ ہمیشہ ہی تھے۔ لیکن اتنا جنون پہلے کبھی ان کے اندر نہ اترتا تھا۔ سارا وقت گاؤں میں گزارتے یا پھر یہاں ہوتے تو بھی گھر میں نہ رہتے۔ یہاں تک کہ میری طرف سے ملنے والی خوشخبری بھی انہیں نہ بدل پائی میں نے بہت کوشش کی کہ آپ کی ہدایات پر عمل کروں ان کے قریب جانے کی کوشش کروں لیکن ہر بار ہی میں ناکام ہو گئی۔ ان کے پاس میرے لیے سرد مہری اور اجنبیت کے سوا کچھ تھا ہی نہیں میں جتنا ان کے قریب جانے کی کوشش کرتی وہ اتنا ہی فاصلوں کو بڑھاتے چلے جاتے میں نے کبھی کسی کو ان کی اس بیگانگی کی خبر نہیں ہونے دی ان کے بار بار گھر سے غائب ہو جانے کو بھی مصروفیت کا نام دے کر چھپایا۔ لیکن کئی مہینوں کی لا حاصل جدوجہد کے بعد آخر ایک دن تھک کر آئی سے ان کے رویوں کا شکوہ کر بیٹھی۔

جواب میں انہوں نے اپنے بیٹے کا دفاع کرتے ہوئے سارا الزام آپ کے سر تھوپ دیا۔ وہ بہت کچھ کہتی رہیں آپ کے خلاف لیکن میں نے اصلیت کو پایا۔ آپ لوگ جو ساری زندگی مجھے نوازتے رہے، زندگی کے اس موڑ پر بھی مجھے قرض دار کر گئے۔ میں ہمیشہ عباد سے آپ سے سارے گھر والوں سے محبت کا دعویٰ کرتی رہی لیکن محبت کیسے کی جاتی ہے یہ میں نے اب جانا ہے بڑے ابو اور بڑی امی کی اولاد کو آپ کی اور بلال کی طرح ہی ہونا تھا لیکن کیا فائزہ مہتاب جو ان کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے ان سے قربانی کا کوئی درس نہیں سیکھ پائی؟ اس سوال نے مجھے اتنا ستایا کہ میں

نے فیصلہ کر لیا آپ سب کی راہوں کو آسان بنانے کا۔

جب ماضی کا سفر کرنے بیٹھی تو اپنے اس شریر سے کرن بلال کو یاد کر کے بہت روئی جس کی ہر شرارت میں میرے لیے محبت ہوتی تھی لیکن میں ہی نادان تھی جو سمجھ نہ پائی اور صرف میری وجہ سے وہ اپنوں کو چھوڑ کر دور دیس جا بسا لیکن اب آپ لوگ فکر مت کیجئے میں نے اسے فون کر کے پاکستان واپس بلالیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات کبھی نہیں ٹالے گا۔

عباد سے میری طرف سے معافی مانگ لیجئے گا کہ ان کی اولاد کو بغیر ان کی اجازت کے اپنے ساتھ لیے جا رہی ہوں لیکن میرے پاس بھی تو قبر کی گہرائی میں ان سے دوران کی کوئی نشانی ہونا چاہیے یہ نہیں کہوں گی کہ میری می کا خیال رکھیے گا۔ کیونکہ آپ لوگ تو ایسا میرے کہے بغیر بھی کریں گے۔

فقط آپ کی فائزہ

خط کے الفاظ پڑھتے ہوئے نزہہ کی آنکھوں سے آنسو ایک تسلسل سے بہہ رہے تھے۔

”یہ کیا کیا تم نے میری گڑیا!“

ہر ایک لمحہ میں سوچتا ہوں
تمہاری ہستی کے تابع رہ کر
نہ جانے کیا کیا ستم کروں گا
نہ جانے کن کن کو اتا کی خاطر
میں شب کی ظلمت میں لوٹ لوں گا

عباد کی لکھی نظم کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجے تو نفرت سے مٹھیاں بھیجنے لگیں سچ تھا کہ اس نے اپنی اتا کی خاطر فائزہ کے سارے ارمانوں کو لوٹ لیا تھا۔

وہ گم سم بیٹھی خط کی تحریر میں فائزہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے ہوئے اسے کافی دیر ہو گئی تھی جب بھابھی نے عباد کے آنے کی اطلاع دی۔ ”وہ

یہاں گیوں آیا ہے۔“ اس کے ارد گرد دھماکے سے ہونے لگے تھے۔

”نزی“ چند لمحوں بعد دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ عباد کی پکار پر اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”نزی میں“ عباد نے کچھ کہنا چاہا لیکن نزیہ نے روک دیا۔

”پہلے اسے پڑھ لو پھر کچھ بولنا۔“ فائزہ کا خط اسے تھماتے ہوئے وہ سرد

لہجے میں بولی۔

عباد جوں جوں خط پڑھتا گیا۔ اس کے چہرے پر اذیت کی لکیر پھیلتی گئی۔

”یقین کرو۔ میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا۔ نزیہ کے سنگلاخ چہرے کی طرف

دیکھتے ہوئے اس نے وضاحت کرنا چاہی۔

”تم نے کبھی ایسا چاہا نہیں عباد علی! صبح کہتے ہو۔ تم نے تو اسے مجبور کر دیا کہ

وہ یہ دنیا چھوڑ جائے۔ لیکن تم نے تو اسے پل پل مارا ہے۔ جیتی جاگتی جذبوں سے

بھر پور زندگی سے محبت کرنے والی لڑکی تمہارے حوالے کی تھی ہم نے اور تم نے اس کے

اندر سے جینے کی امنگ ہی ختم کر دی۔ وہ جو کائنات جینے کی معمولی تکلیف برداشت نہ

کر پاتی تھی تم نے اس کے پورے وجود کو زخم زخم کر ڈالا۔“ وہ چیخ ہی تو پڑی تھی۔

”مت دوسرے مجھے الزام۔ کیوں اتنا بوجھ ڈال دیا تھا مجھ پر تم نے کہ میں

سہار نہ سکوں۔ میں نے کہا تھا کہ میری نظر کے آگے اور پیچھے صرف ایک چہرہ رہتا ہے جو

نزیہ آفتاب کا ہے میری زندگی کے جن راستوں پر تمہارا قدم پڑ چکا تھا وہاں سے کسی

فائزہ کے گزرنے کی جگہ نہیں تھی۔“ جواباً وہ بھی چیخ اٹھا۔

”آج بھی تم اتنے ہی اتنا پرست اور خود غرض ہو عباد! جتنے پہلے تھے اب بھی

تمہیں فائزہ کی تکلیف کا احساس نہیں ہے۔“ اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

”کول ڈاؤن نزی! آج میں تم سے یہ ہی کہنے آیا تھا کہ اب تمہیں مجھ سے

کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ میں یہ جذبہ کبھی دل سے

نہال نہیں پاؤں گا۔ لیکن میں اپنے دل کو یہ بات تو سمجھا سکتا ہوں تاکہ اس سارے قصے

میں فائزہ کا کوئی قصور نہیں۔ میں اسے ساری محبت تو نہیں دے سکتا لیکن اس کی محبت کا

جواب تو محبت سے دے سکتا ہوں۔“ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور لہجہ بہت ٹوٹا بکھرا

تھا۔

”محبت کبھی نہیں مرتی ہاں کبھی کبھی اس کی صورت بدل جاتی ہے۔“ وہ ٹھہر ٹھہر

کر بولی تھی۔

”میں بھی محبت کو مرنے نہیں دوں گا تم میرا یقین کر لو۔“ اس کے لہجے میں

بہت سادہ تھا اور ایک آخری بات تم اپنے لیے کوئی ساتھی جن لو شاید ہم دونوں کے

حق میں یہ ہی بہتر ہے۔“ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور تھکے تھکے قدموں سے

باہر نکل گیا۔

”اب جو جینا ہے تو اس لیے کہ ہم سب اپنی زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کر سکیں۔“

عباد علی کے قدموں کی چاپ مدہم ہوتے ہوتے کہیں گم ہو گئی تھی۔

آج فائزہ کو روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا وہ اس سے مل کر آئی تھی۔ اس کے

چہرے پر ملال تھا اور کچھ کھودینے کا شدید احساس۔

اس دن وہ چپ چاپ اس زرد چہرہ دیکھتی رہی تھی کہتی بھی تو کیا۔

فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔ دوسری طرف ڈاکٹر فصیح تھے وہ روزانہ فون کر

کے فائزہ کی خیریت پوچھتے تھے نزیہ کو بھی ان کی آواز سننے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

”نزیہ! گاؤں میں سب آپ کو بہت یاد کرتے ہیں میری اماں اور مریم سب

کی خواہش ہے کہ آپ ہمیشہ کے لیے یہاں آجائیں۔“ پتا نہیں کیا بات کرتے ہوئے

ان کی زبان سے یہ سب پھسل گیا تھا۔

وہ ایک گہری سانس نے کر رہ گئی۔“ اسے پتا تھا یہ بات کبھی تو ہوگی ہی۔

”ڈاکٹر فصیح! مجھے تھوڑا ٹائم چاہیے۔“ بہت دھیمے سے کہہ کر اس نے جواب کا

انتظار بھی نہیں کیا اور فون بند کر دیا۔

ابھی کچھ دن لگیں گے

دل ایسے شہر کے پامال ہو جانے کا منظر بھولنے میں ابھی کچھ دن لگیں گے
جہان رنگ کے سارے خس و خاشاک سب صنوبر
بھولنے میں ابھی کچھ دن لگیں گے
تھکے ہارے خوابوں کے ساحل پر.....

اور نزیہہ آفتاب سوچ رہی تھی ضروری تو نہیں کہ دل کی لوح محفوظ پر رات ہی
اترے ہو سکتا ہے کسی دن کسی کی محبت صبح کی پہلی کرن کی طرح اس کے دل کے ایوانوں
کو منور کر دے ہاں بس اتنا ہے کہ
”ابھی کچھ دن لگیں گے“

☆☆☆

دست آزما

شاہدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے وہ دھیرے دھیرے اسے سہلا رہا تھا اس کی
نظریں گرد و پیش سے بے خبر شاہدہ کے ہاتھ پر نکلی تھیں۔ گلابی رنگت اور مخروٹلی انگلیوں والا
بھرا بھرا ہاتھ جس کی درمیانی انگلی میں زمرہ کی خوبصورت انگٹھی تھی۔ شاہدہ کے ناخن
نہایت نفاست سے ترشے ہوئے تھے اور ان پر گلابی چمکدار نیل پالش لگی ہوئی تھی جس
سے اس کے ہاتھ کی دلکشی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ پہلی بار کب وہ اس
کے ہاتھوں کی خوبصورتی سے متاثر ہوا تھا۔

وہ شاہدہ کے بڑے بھائی کی شادی کا موقع تھا۔ شاہدہ دلہن والوں کے گھر
برات لے جانے والی بڑی بس میں بیٹھی تھی اس کے اپنے پاس ذاتی سواری موجود تھی
اس لیے وہ براتیوں کی اس بس میں بیٹھنے کے بجائے بس کے باہر کھڑا لوگوں کے سوار
ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ بس کی کھلی کھڑکی سے شاہدہ کا خوبصورت چہرہ اور لہراتے بال
واضح نظر آرہے تھے لیکن اس نے توجہ نہیں دی کیونکہ خصوصی تیار یوں کے ساتھ آج تو
تقریباً تمام خواتین ہی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ اسے اس وقت صرف اس بات سے
دلچسپی تھی کہ برات جو پہلے ہی ایک گھنٹہ لیٹ ہو چکی ہے کسی طرح روانہ ہو جائے وہ
قدرے بیزار سا کھڑا تھا کہ شاہدہ کے والد نے اسے آواز دے کر چابیوں کا ایک گچھا
تھماتے ہوئے شاہدہ کو پہچاننے کی ہدایت کی۔ وہ چابیوں کا گچھا لے کر بس کی کھڑکی کے

کھولنے پر مجبور کیا۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے ٹیبل کلاک کی طرف دیکھا جو اس وقت پانچ بج رہا تھا اور قریب پڑا موبائل ہاتھ بڑھا کر اٹھالیا۔ موبائل فون کی اسکرین پر کاشف میر کا نام جگمگا رہا تھا۔

”خیریت یار! اس وقت کیسے فون کیا؟“ ریسو کا بٹن پریس کر کے وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔

”خیریت نہیں ہے سکندر! تم فوراً سول ہاسپٹل پہنچو۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ کاشف میر کی آواز میں پریشانی نمایاں تھی۔

”میں پہنچتا ہوں لیکن تم کچھ تو بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“

”تم یہاں پہنچو، تب ہی میں کچھ بتا سکوں گا۔“

”اوکے! میں بس پندرہ منٹ میں آ رہا ہوں۔“ کاشف میر کے گریز پر سکندر علی نے مزید اصرار نہیں کیا اور اسے اپنے پہنچنے کی یقین دہانی کرواتے ہوئے فون آف کر کے تیزی سے تیار ہونے لگا وعدے کے مطابق وہ ٹھیک پندرہ منٹ بعد سول ہاسپٹل پہنچ چکا تھا۔

”کیا ہو؟ کہیں کوئی ایکسیڈنٹ وغیرہ تو نہیں کر دیا۔“ کاشف میر سے سامنا ہوتے ہی اس کی پریشان صورت دیکھ کر اس نے اعزازہ لگانے کی کوشش کی۔

”مسئلہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔“ کاشف کے چہرے کے تاثرات بے حد گہمیر تھے۔ وہ اسے ساتھ لیے آئی سی یو کی طرف جا رہا تھا جہاں کارڈیور میں کاشف میر کے گھر کے تقریباً تمام افراد موجود تھے۔

”کون ایڈمٹ ہے یہاں؟“ سکندر علی نے ٹھٹک کر پوچھا۔

”شاہدہ!“ کاشف میر نے جواب دیا۔

”اسے کیا ہوا؟“ سکندر علی نے بے تابی سے سوال کیا۔

”کچھ سمجھ نہیں آ رہا تمہیں کیا بتاؤں کل رات ہم تمام گھر والے ایک شادی میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے تمہیں معلوم ہے میرے دادا جان معذوری کی وجہ سے

قریب پہنچا اور شاہدہ کو آہستہ سے پکار کر چابیاں لینے کو کہا۔ شاہدہ نے اپنا دایاں ہاتھ کھڑکی سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو وہ اس کے جادوئی ہاتھ کی خوبصورتی میں الجھ کر رہ گیا اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی عورت کے اتنے خوبصورت ہاتھ نہیں دیکھے تھے۔ شاہدہ نے اس روز بھی اپنے ہاتھ پر گلابی نیل پالش لگا رکھی تھی۔ اس کی کلائی میں گلابی اور سنہری چوڑیاں تھیں جو ہاتھ کے حرکت کرنے پر بڑے سر میں کھٹکنائی تھیں۔ چوڑیوں کی کھٹکناہٹ یاد آنے پر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے شاہدہ کے ہاتھ کا جائزہ لیا۔ آج اس کی کلائی سونی تھی۔

”میں کل ہی تمہارے لیے ڈھیر ساری چوڑیاں لاؤں گا۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے شاہدہ کے ہاتھ کو اپنے سامنے موجود میز پر رکھا۔ میز پر شیشے کے چھ بڑے جار رکھے تھے۔ ان جارز میں بالترتیب ٹین، تھرنٹی، ہفتی، سیونٹی، ناکیٹی اور ہنڈرڈ پرسنٹ الیکٹل موجود تھی۔ شاہدہ کے ہاتھ کے حصول کے ساتھ اس کا تحفظ بھی بہت ضروری تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اسے محفوظ کرنے کا بندوبست نہ کیا تو یہ ہاتھ جلد ہی گلنا سڑنا شروع ہو جائے گا اور وہ اتنی مشکلوں سے ہاتھ آئی نعت کو یوں ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنے سامنے موجود جارز میں سے ٹین پرسنٹ الیکٹل والے جار کا ڈھکن ہٹایا اور کہنی سے ذرا نیچے سے کاٹا گیا شاہدہ کا ہاتھ احتیاط سے اس میں ڈال دیا۔ اس سے پہلے وہ شاہدہ کے ہاتھ کی درمیانی انگلی سے زمر کی انگلی اٹارتا نہیں بھولا تھا۔ انگلی اس نے ٹیبل کی دائیں طرف بنی درازوں میں سے ایک میں ڈال دی تھی اور خود کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ایک ٹک شاہدہ کے ہاتھ والے مرتبان کی طرف دیکھتا رہا۔ مخصوص وقت گزر جانے کے بعد اسے اس ہاتھ کو تھرنٹی پرسنٹ الیکٹل والے مرتبان میں ڈالنا تھا اور پھر اس کے بعد ہفتی، سیونٹی، ناکیٹی اور ہنڈرڈ میں، اسے یقین تھا کہ وہ صبح ہونے سے پہلے اپنے کام سے فارغ ہو جائے گا۔

انسپکٹر سکندر علی نے پرسوج انداز میں پوچھا۔

”کم سے کم بھی شام تک یوں تو وہ آؤٹ آف ڈیوٹی ہے لیکن تکلیف کی شدت کو کم کرنے کے لیے ہم نے اسے جو پین کلرزدی ہیں اس کے اثر سے وہ کئی گھنٹوں تک غنودگی میں رہے گی۔“

”تھینک یو ڈاکٹر!“ سکندر علی، ڈاکٹر سے تفصیلات لے کر اس روم کی طرف بڑھ گیا جہاں شاہدہ کو شفٹ کیا گیا تھا۔

☆☆☆

”شاہدہ پلیز! جو کچھ تمہارے ساتھ بیٹا ہے بتا دو۔ ہم تمہارے ساتھ ظلم کرنے والے کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کریں گے۔ اسے اپنے کیے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا لیکن اس کے لیے تمہارا تعاون بہت ضروری ہے۔ اگر تم سکندر کو اپنا بیان نہیں لکھواؤ گی تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔“ کاشف میر زار و قطار روتی شاہدہ کے سر ہانے بیٹھا اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ایک طرف آصف میر چہرے پر شدید ڈکھ کے تاثرات لیے کھڑے تھے جبکہ انسپکٹر سکندر علی شاہدہ کے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر کاغذ قلم لیے بیٹھا تھا۔

”انہیں پانی پلاؤ۔“ سکندر علی نے کاشف میر سے کہا پانی پی کر شاہدہ کی حالت قدرے سنبھال گئی تھی۔

”میں رات ساڑھے گیارہ بجے کے قریب دادا جان کو دوا دے کر اپنے کمرے میں جا رہی تھی کہ مجھے دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی میں نے آواز دے کر آنے والے کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کوئی فقیر ہے اور روٹی مانگ رہا ہے۔ میں نے سوچا کوئی بہت ہی بھوکا شخص ہو گا جو مجبور ہو کر رات کو اس وقت مانگنے نکلا ہے۔ کچن سے کھانے کا سامان ایک پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر میں واپس دروازے پر آئی اور دروازہ کھول کر تھیلی فقیر کو دینی چاہی لیکن اسی وقت میرے چہرے پر کسی چیز کی پھوار پڑی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا جب میری آنکھ کھلی تو میں یہاں ہاسپٹل میں تھی۔“ شاہدہ نے انسپکٹر

کہیں آجائیں سکتے ان کی وجہ سے کسی ایک فرد کو لازماً گھر پر رکنا پڑتا ہے۔ کل شاہدہ نے شادی میں جانے سے انکار کر کے گھر پر رکنے کو ترجیح دی۔ ابھی ہم سب تقریب میں موجود ہی تھے کہ کسی نے میرے موبال پر کال کر کے مجھے شاہدہ کے سول ہاسپٹل میں ہونے کی اطلاع دے کر فون بند کر دیا۔ ہم سب بھاگتے دوڑتے یہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ شاہدہ ایمرجنسی میں ہے انتظامیہ سے معلوم کرنے پر صرف اتنا پتا چلا کہ کوئی اسے ہاسپٹل کے دروازے پر ڈال گیا تھا عملے کی نظر پڑی تو وہ لوگ اسے اندر لے آئے ڈاکٹروں کے مطابق اب شاہدہ خطرے سے باہر ہے اور وہ لوگ اسے روم میں شفٹ کرنے والے ہیں۔ اتنا بڑا حادثہ کیوں اور کیسے ہوا میری سمجھ سے باہر ہے۔ اوپر سے پولیس والوں کے سوال جواب آصف بھائی نے مجھے مشورہ دیا کہ تمہیں بلوالوں اس لیے میں نے تمہیں فون کیا تھا۔“ کاشف میر کی بتائی گئی تفصیلات میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں تھا کہ شاہدہ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے سکندر علی نے پوچھنے کے لیے منہ کھولنا ہی چاہا کہ آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور اسٹریچر پر شاہدہ کو باہر لایا جانے لگا۔ گھر کے جملہ افراد کاشف سمیت اس طرف دوڑ گئے۔ سکندر علی گہرا سانس لے کر ڈاکٹر کی طرف بڑھا اور اس سے شاہدہ کے بارے میں پوچھنے لگا۔

”کسی تیز دھا آلے کی مدد سے لڑکی کا ہاتھ کہنی کے نیچے سے کاٹ کر مکمل طور پر الگ کر دیا گیا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ لڑکی کو نقصان نہ پہنچ سکے، وہ زندہ رہے اسی لیے اس نے ہاتھ کاٹنے سے پہلے باقاعدہ اسے بے ہوش کیا اور طبی امداد کے طور پر بڑی مہارت سے خون کے اخراج کو کم سے کم کرنے کے بھی اقدامات کیے لڑکی یہاں لائی گئی تو اس کے کٹے ہوئے ہاتھ پر باقاعدہ بینڈج بندھی ہوئی تھی۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ہمارے لیے اس کی جان بچانا مشکل ہو جاتا۔“ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی تفصیلات سے واضح تھا کہ شاہدہ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ باقاعدہ ہو منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔

”آپ کے خیال میں وہ کتنی دیر بعد بیان دینے کے قابل ہو جائے گی۔“

سکندر علی کو بتایا اور آٹھ سو ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے جاری ہو گئے۔

”ان ساری تفصیلات کو جان کر اور جائے وقوعہ کا معائنہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجرم کوئی بہت ہی قریبی شخص ہے جسے تمہارے گھر کے تمام حالات کا بہت اچھی طرح علم ہے۔ وہ واقف تھا کہ شاہدہ کے علاوہ تم سب شادی کی تقریب میں گئے ہوئے ہو جب ہی وہ اس وقت پر آیا اور اس نے تمہارے ہی گھر میں مکمل اطمینان کے ساتھ پوری کارروائی کی اور پھر شاہدہ کو ہسپتال کے سامنے ڈال کر فرار ہو گیا۔“ سکندر علی نے پرسوج لہجے میں کاشف میر سے کہا۔

”اصل مسئلہ یہی تو ہے کہ ہمارے جاننے والوں میں سے آخر کون ایسا ہو سکتا ہے جو اتنی بھیاں ک کارروائی کر سکے۔“ کاشف میر نے بے بسی سے اپنی ہتھیلی پر مکا مارا۔

”ذہن پر زور دو اور سوچو کوئی ایسا شخص جس کی تم سے دشمنی ہو اور وہ تمہیں نچا دکھانا چاہتا ہو کیونکہ میں اس واقعے میں ایک خاص قسم کی تنبیہ محسوس کر رہا ہوں۔ اگر وہ کوئی غیر متعلقہ شخص یا عام چور ڈاکو ہوتا تو تمہارے گھر سے کوئی قیمتی چیز چرانے کی کوشش کرتا لیکن تم بتا چکے ہو کہ گھر کی کسی شے کو چھوا تک نہیں گیا۔ اس نے پورے اطمینان سے کارپیت پر پلاسٹک شیٹ بچھا کر شاہدہ کو اس پر لٹانے کے بعد اس کا ہاتھ کاٹا اور بڑی مہارت سے اسے طبی امداد بھی دی کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ تم لوگوں کو باد کر وانا چاہتا تھا کہ وہ کتنا با اختیار ہے۔ جب چاہے کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ انسپکٹر سکندر علی بہت جوش سے بول رہا تھا۔

”لیکن میں تمہیں بتا چکا ہوں ہماری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہم لوگ بہت سیدھے سادے لوگ ہیں ہمارا چھوٹا سا کاروبار ہے نہ ہمارا مارکیٹ میں کسی سے مقابلہ ہے اور نہ لین دین کے معاملے میں کسی شخص سے جھگڑا گھر کے کسی فرد کی ایسی کوئی ایکٹیوٹی نہیں ہے جسے متنازع قرار دیا جاسکے۔“

”تو پھر دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کسی شخص کی براہ راست شاہدہ سے دشمنی

ہے۔“ کاشف میر کے جواب پر انسپکٹر سکندر علی نے شاہدہ کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”یہ کیسے ممکن ہے۔ ہماری شاہدہ تو بہت ملفسار اور تمیز دار لڑکی ہے۔ پھر اس کا ہمارے بغیر کہیں آنا جانا بھی نہیں۔ کالج میں خود اسے چھوڑنے اور لینے جاتا ہوں۔ دوستوں کے گھر بھی یہ ہم بھائیوں میں سے کسی کے ساتھ جاتی ہے اور اس کی ساری سہیلیاں بہت اچھی فیملیز کی لڑکیاں ہیں۔“ آصف میر نے فوراً ہی سکندر علی کے خیال کی تردید کی۔

”رشتے وغیرہ کے سلسلے میں کسی کوئی جھگڑا؟ ہو سکتا ہے شاہدہ کے لیے کوئی رشتہ آیا ہو اور آپ لوگوں نے اسے ریجیکٹ کر دیا ہو اور وہ لوگ آپ کے انکار کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہوئے انتقام پر اتر آئے ہوں۔“ سکندر علی معاملے کے ہر پہلو کو سامنے لا رہا تھا۔

”ایک منٹ سکندر! مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔ میرا خیال ہے میں اس شخص کو پہچان گیا ہوں۔“ اچانک ہی کاشف میر اٹھا کر اسے بولنے سے روکا۔

”کون؟ کون ہے وہ شخص؟“ آصف میر بے تاب سے پوچھنے لگے۔

”سوری بھائی جان! میں وہ نام صرف سکندر کو بتانا چاہتا ہوں۔ تصدیق ہو جانے کی صورت میں آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا۔“ کاشف میر نے اپنے بڑے بھائی کو قدرے روکھے لہجے میں جواب دیا اور سکندر علی کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

”ہوں! مجھے تمہاری بات میں وزن لگتا ہے اور سب سے زیادہ اس کا میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہونا اسے مشکوک بنا رہا ہے تم نے اچھا کیا کہ آصف بھائی کے سامنے نام نہیں لیا۔ فنگر پرنٹس کی رپورٹ آنے کے بعد ایک ہی بار اس پر پکا ہاتھ ڈالوں گا۔ فی الحال تم یہ کوشش کرو کہ اس بات کو گھر سے نکلنے نہ دو۔“ کاشف میر نے جو نام سکندر علی کو بتایا اسے سن کر اس نے ہکا را بھرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”سمجھو گے سب سمجھو گے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ پرسوں رات تم اس کے گھر کیا کر رہے تھے۔“ انسپٹر سکندر علی نے سختی سے پوچھا۔

ندیم کے چہرے پر حیرت چھا گئی مگر اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ سے کس نے کہا کہ میں پرسوں رات شاہدہ کے گھر تھا؟“

”کسی کے کہنے کی کیا ضرورت؟ ہمارے پاس کچے ثبوت ہیں۔ ایس ٹری۔ میں پڑے سگریٹ کے ٹکڑے چائے کی پیالی اور ڈرائنگ روم سے ہم نے تمہارے فنگر پرنس لیے ہیں۔“ انسپٹر سکندر علی کی بات پر ندیم اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔

”کیوں بچو! پکڑے گئے نا؟“ انسپٹر سکندر علی نے فخر سے کہا۔

”ہاں اور اب میں آپ کو بھی پہچان گیا ہوں۔ آپ کاشف بھائی کے دوست انسپٹر سکندر علی ہیں۔ میں نے ناہید باجی اور آصف بھائی کی شادی کے دنوں میں آپ کو دیکھا تھا۔“

”کینے، کتے! تجھے جرات کیسے ہوئی میری بہن کو ہاتھ لگانے کی۔“ ندیم کی زبان سے اعتراف سنتے ہی برابر کے کمرے میں موجود کاشف میر بھمبر کر سامنے آیا اور اس پر تابو توڑ حملے کرنے لگا۔

”ہم نے تیرے رشتے سے انکار کیا اور تو یہ سوچے بغیر کہ تیری بہن ہمارے گھر ہے ہمارے ساتھ گیم کھیل گیا۔“ کاشف میر کے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ زبان بھی چل رہی تھی سکندر علی کے اشارے پر بڑی مشکوں سے دوکانسٹیلو نے اسے قابو کر کے ندیم سے دور ہٹایا مگر وہ اس دوران میں اس کی اچھی خاصی درگت بنا چکا تھا۔

”تم گھر جاؤ کاشف! اسے میں خود دیکھ لوں گا۔“ سکندر علی نے کاشف کے شانے پکڑتے ہوئے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔

”اسے بچتا نہیں چاہیے سکندر!“ کاشف میر نے جاتے جاتے ندیم کو کینہ تو نظروں سے گھورتے ہوئے سکندر علی سے کہا۔

”ڈونٹ یووری یار! میں ہوں ناں۔“ سکندر اسے تسلی دے کر اپنی سیٹ پر

”معاملہ نازک رشتے داری کا ہے اس لیے میں نے وقت سے پہلے بھائی جان کے سامنے اس کا نام لیجے۔ گریز کیا لیکن واقعی اگر وہ مجرم ہے تو میں اسے سزا دلانے میں کسی لحاظ مروت سے کام نہیں لوں گا۔“ کاشف میر کے چہرے پر غصے کی سرخی تھی۔

”ریلیکس یار! میں ہوں ناں! سنبھال لوں گا سب کچھ۔“ سکندر علی نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے تسلی دی۔

☆☆☆

وہ شدید پریشانی کے عام میں تھانے کے اس خالی کمرے میں کھروری بیچ پر بیٹھا پہلو بد رہا تھا ایک گھنٹا قبل جب وہ میڈیکل کالج سے نکل رہا تھا تو دو پولیس والوں نے اسے گھیر کر پولیس موبائل میں بٹھا دیا تھا۔ اس اچانک کارروائی پر اس نے احتجاج کرنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں اسے ان کی تواضع بھگتنا پڑی تھی۔ اس کی قیمتی کتائیں اور اسٹیتھو اسکوپ بھی وہیں کہیں گر گئے تھے۔

”مجھے میرا جرم تو بتاؤ۔“ وہ چلایا تھا۔

”صبر سے بیٹھو۔ صاحب آئیں گے تو خود پتا لگ جائے گا۔“ اس کے منہ پر تھپڑ جڑتے ہوئے اسے حکم دیا گیا تھا اور جب سے وہ صاحب کے انتظار میں بیٹھا خوار ہو رہا تھا۔

”ہاں بھی ندیم صاحب! بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جا رہے ہیں۔“ ڈیڑھ گھنٹے کے انتظار کے بعد جو شخص یونیفارم میں لمبوس کمرے میں داخل ہوا اسے دیکھ کر ندیم کو ہلکی سی شناسائی کا احساس ہوا لیکن سامنے والے کے انداز بالکل اجنبی تھے۔

”آپ کن کارناموں کی بات کر رہے ہیں سر! میں سمجھا نہیں۔“

”اچھا..... اگر میں شاہدہ کا نام لوں تب بھی نہیں سمجھو گے۔“ اس نے خشونت سے کہتے ہوئے ندیم کو گھورا۔ ندیم شاہدہ کا نام سن کر اچھل پڑا تھا۔

”م.....م..... میں اب بھی نہیں سمجھا سر!“ وہ ہکلا یا تھا۔

”میں وہاں جانے اور سگریٹ اور چائے پینے کا اعتراف کرتا ہوں لیکن جو گھناؤنا الزام آپ مجھ پر لگا رہے ہیں اسے ہرگز ماننے کو تیار نہیں۔“

”تم سے جرم قبول کروانا ہماری ذمہ داری ہے۔ دو دن لاگ آپ میں رہو گے تو خود ہی فر فر بول اٹھو گے۔“ انسپٹر سکندر علی نے کھٹی کاٹن دباتے ہوئے کہا فوراً ہی ایک کانشیل اندر داخل ہوا۔

”فرید! اس کو ذرا حوالات کی ہوا تو کھلاؤ۔ اس کی یادداشت گم ہو گئی ہے۔ آدھی باتیں یاد ہیں باقی آدھی بھول گیا ہے علاج ہو جائے تو میرے پاس لانا۔“ انسپٹر سکندر علی کے حکم پر فرید نامی کانشیل اسے کھینچتے ہوئے لاگ آپ تک لے گیا تھا۔

☆☆☆

ندیم زخمی وجود کے ساتھ لاگ آپ کے منگے فرش پر پڑا خود پر گزرنے والے آلات کا تجزیہ کر رہا تھا۔ اسے جس الزام میں گرفتار کیا گیا تھا اور وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا شاہدہ اس کی محبت تھی، وہ اپنی محبت کو خود اپنے ہاتھوں سے کیسے تکلیف پہنچا لیا تھا بلکہ اس وقت بھی اسے اپنے جسم پر لگے ہوئے زخموں سے زیادہ شاہدہ کی تکلیف و سوچ کراذیت ہو رہی تھی۔

شاہدہ کو پہلی بار اس نے اپنی بہن ناہید اور آصف میر کی منگنی کے موقع پر دیکھا تھا اور اسے وہ پہلی ہی نظر میں بہت اچھی لگی تھی ندیم کے اظہار محبت پر شاہدہ نے بھی اس کی پذیرائی کی تھی ناہید اور آصف میر کی شادی کی تقریبات میں ان دونوں کو خوب ایک دوسرے سے گھٹنے ملنے کا موقع ملا تھا۔ بہن کی شادی کے بعد ندیم نے ماں کو شاہدہ کا رشتہ مانگنے اس کے گھر بھیجا تھا لیکن شاہدہ کے والد عارف میر نے اگلے بدلے کے رشتے کو نامناسب قرار دیتے ہوئے ندیم کے لیے انکار کر دیا تھا ان کے اس فیصلے پر ندیم اور شاہدہ دونوں ہی کو بہت دکھ ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو تسلیاں دیتے کسی مناسب وقت کے انتظار میں تھے، ندیم کا خیال تھا کہ اس معاملے میں اس وقت تک صبر کیا جائے جب تک وہ مکمل ڈاکٹر نہیں بن جاتا، شاہدہ بھی اس سے متفق تھی لیکن دونوں

”یہ تمہارا اعتراف نامہ ہے۔ اس پر دستخط کرو۔“ انسپٹر سکندر علی نے ایک پہر اس کی طرف بڑھایا۔

”آپ مجھ سے دستخط کروا کر بھی کچھ نہیں کر پائیں گے۔ میں نے کون سا وہاں ڈاکا مارا ہے جس کی قانون مجھے سزا دے گا۔“ ندیم نے جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے پیپر لے کر پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ پڑھتا گیا اس کے چہرے پر حیرت پھیلتی گئی۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے!“ اس نے پورا بیان پڑھنے کے بعد پیپر انسپٹر سکندر علی کی طرف واپس پھینکا۔

”بے ہودگی نہیں یہ صرف اس بات کا اعتراف ہے کہ میر فیملی کی طرف سے شاہدہ میر کے لیے تمہارے رشتے سے انکار پر تم نے انتقامی کارروائی کرتے ہوئے وحشیانہ طور پر شاہدہ میر کا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا کہ وہ کہیں بھی شادی کے لائق نہ رہ سکے۔“ سکندر علی نے مسکرا کر کہا۔

”مگر یہ جھوٹ ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں شاہدہ سے پیار کرتا ہوں اور اسے کوئی تکلیف پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“ ندیم خود پر لگنے والے الزامات پر چلا اٹھا۔

”تمام ثبوت اور حالات تمہارے خلاف ہیں۔ میں نے مکمل تحقیقات کرنے کے بعد ہی تم پر ہاتھ ڈالا ہے۔“

”کیسے ثبوت اور حالات؟ میں آپ کے کسی ثبوت کو نہیں مانتا۔“ ندیم سکندر علی کی بات پر بھرا۔

”کیوں تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو کہ تم پرسوں رات شاہدہ کے گھر گئے تھے جہاں تم نے چائے اور سگریٹ پینے کے بعد اسے بے ہوش کر کے اپنے انتقام کا نشانہ بنایا۔“

کی چاہت انہیں اکساتی تھی کہ ایک دوسرے کے روبرو بیٹھ کر حال دل سنائیں ٹیلی فون پر اکثر بات تو ہو جاتی تھی اور ندیم کے بہن کے گھر آنے پر کبھی کبھار سامنا بھی ہو جاتا تھا لیکن دو چاہنے والوں کے لیے یہ ادھوری ادھوری سی ملاقاتیں کافی نہیں تھیں۔ شاہدہ اکیلی گھر سے باہر بھی نہیں جاتی تھی کہ کسی بہانے وہ دونوں کہیں اور ملاقات کر سکتے ایسے میں جب شاہدہ نے اسے فون پر تمام گھر والوں کی شادی میں شرکت اور اپنی گھر پر تھا موجودگی سے باخبر کیا تو وہ خود کو روک نہ سکا اور شاہدہ کے گھر پہنچ گیا۔ شاہدہ اسے سامنے پا کر فطرتاً سے اس کے سینے سے لگ گئی تھی، خود ندیم اس ملاقات پر بہت ایکساٹڈ تھا۔ بہت دنوں سے اس نے شاہدہ کے لیے زبردستی ایک انگوٹھی خرید رکھی تھی جسے وہ فوراً شوق میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے بہت محبت سے وہ انگوٹھی شاہدہ کی انگلی میں پہنائی تھی۔ محبت کے یہ لمحے ان دونوں کے لیے لازوال تھے لیکن شاہدہ کو ڈر تھا کہ کہیں کوئی آنہ جائے، خود ندیم بھی بہن کی سسرال ہونے کی وجہ سے بہت محتاط تھا اس لیے صرف آدھے گھنٹے میں وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

شاہدہ سے ملاقات کی خوشی میں اس کا ایک ایک جھوم رہا تھا۔ سو وہ گھر واپس جانے کے بجائے یونہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا لیکن اب اسے یہ سوچ کر ندامت ہو رہی تھی کہ وہ جن لمحات میں شاہدہ سے ملاقات کی خوشی مناتا پھر رہا تھا شاہدہ عین اکا وقت دردناک اذیت سے گزر رہی تھی، وہ ہاتھ جسے بہت محبت سے تھام کر اس نے شاہدہ کی انگلی میں انگوٹھی پہنائی تھی اس کے وجود سے الگ کیا جا چکا تھا۔

”اے اٹھو! تمہاری ملاقات آئی ہے۔“ کانٹیل کے پکارنے پر اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کر اس کے پیچھے چل پڑا۔

”اوہ مائی گاڈ! ان لوگوں نے تمہارا کیا حال کر دیا ہے۔“ اس کا جگری دوست عامر مرزا اپنے والد ایڈووکیٹ باہر مرزا کے ساتھ ملاقات کے کمرے میں بیٹھا تھا۔

”تم یہاں کیسے پہنچے؟“ ندیم نے مسکرانے کی کوشش کر کے پوچھا۔

”میں نے ان لوگوں کو تمہیں موبائل میں ڈال کر لے جاتے دیکھا تھا۔ جب

ہی سے میں ڈیڈی کی مدد سے مسلسل تمہیں ٹریس کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بڑی مشکل سے تمہاری یہاں موجودگی کا پتا چلا۔“ عامر مرزا نے اسے بتایا۔

”تھینک یو یار! ورنہ یہ لوگ تو مجھے ایک ٹیلی فون کال تک کرنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ یوں لگتا ہے جیسے میری ان سے کوئی ذاتی دشمنی ہو۔“ ہونٹوں سے رستے خون کو صاف کر کے ندیم نے کہا۔

”انسپکٹر سکندر علی کب تک پہنچیں گے۔ مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔“ باہر مرزا نے دونوں دوستوں کی باتوں سے قطع نظر رست واج میں ٹائم دیکھتے ہوئے ہیڈ محرر سے پوچھا۔

”بس جناب آتے ہی ہوں گے۔ ہم نے آپ کی آمد کی اطلاع انہیں دے دی ہے۔“ ہیڈ محرر باہر مرزا کی حیثیت سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے خوشامدی لہجے میں بولا۔

”ارے باہر مرزا صاحب! آپ نے کیوں زحمت کی۔ ہمیں صرف ایک فون کر دیا ہوتا۔“ تھوڑی دیر بعد سکندر علی وہاں پہنچا تو باہر مرزا سے ہاتھ ملاتے ہوئے خوش دلی سے کہنے لگا۔

”بس سکندر صاحب! بیٹے کے دوست کا معاملہ تھا اس لیے آنا پڑا۔ آپ اس بچے کو جلدی سے ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دیں تو میں بھی اپنے کام دھندوں کو دیکھوں۔“ باہر مرزا نے اپنا مدعا بیان کیا۔

”معذرت چاہتا ہوں مرزا صاحب! اس لڑکے کے تو وارنٹ ہی ناقابل ضمانت نکلے ہیں۔ ہم جلد ہی اسے عدالت میں پیش کر دیں گے۔ اب اسے صرف ضمانت کی نہیں باقاعدہ وکیل کی ضرورت ہے۔“ سکندر علی نے صاف جواب دیا۔

”اوکے! میں اس لڑکے کا وکیل ہوں اور تمہائی میں اپنے کلائنٹ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ باہر مرزا کا افسرانہ لہجہ میں پل بھر میں بدل گیا تھا۔

تمہارے فنگر پرنٹس کا میراؤس میں پایا جانا اور واردات کا انداز جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مجرم کا تعلق یقینی طور پر میڈیکل کی فیلڈ سے ہے تمہیں مسلسل مجرم ثابت کر رہا ہے۔“
 باہر مرزا نے عدالتی کارروائی ختم ہونے کے بعد ندیم کے ساتھ چلتے ہوئے اس سے کہا۔
 ”میں کیا کروں۔ میرا کسی طرح شاہدہ سے رابطہ ہی نہیں ہو پارہا۔ ان لوگوں نے ناہید باجی کو بھی اپنے گھر سے نکال دیا ہے ورنہ وہ ہی میرے لیے کچھ کرتیں۔“ ندیم کے لہجے میں بے بسی تھی۔

”اچھا تم فکر نہ کرو۔ میں کوئی کوشش کرتا ہوں۔“ باہر مرزا نے اسے تسلی دی۔
 وہ ان کے بیٹے کا بچپن کا دوست تھا اور انہیں یقین تھا کہ وہ اس وحشیانہ جرم میں ہرگز ملوث نہیں ہو سکتا۔

☆☆☆

”عائشہ! تم میرا یہ چھوٹا سا کام کرو دو میں ساری زندگی تمہاری احسان مند رہوں گی۔“ ناہید ہاتھ جوڑے عائشہ کے سامنے بیٹھی تھی۔
 ”بھابھی پلیز! ایسا مت کریں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ شاہدہ تک آپ کا پیغام ضرور پہنچاؤں گی۔ آگے اس کی مرضی کہ وہ کیا کرتی ہے۔“ باہر مرزا کے مشورے پر ناہید نے شاہدہ کی قریبی دوست عائشہ کا گھر معلوم کر کے اسے شاہدہ تک پیغام پہنچانے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ ایسی صورت میں جبکہ اس کو میراؤس سے نکالا جا چکا تھا اور شاہدہ سے ٹیلی فون پر بھی کوئی رابطہ نہیں ہو پارہا تھا۔ عائشہ رابطے کی زنجیر بن سکتی تھی۔
 عائشہ نے بھی یہ ذمہ داری صرف اس لیے اٹھالی کہ وہ شاہدہ اور ندیم کی محبت کے راز سے واقف تھی۔

شاہدہ نے جب عائشہ کی زبانی حالات سنے تو دنگ رہ گئی۔ وہ تو ابھی تک خود کو معذور بنائے جانے کا سوگ منا رہی تھی اسے باپ بھائیوں کی میٹنگز بھادج کو گھرے نکالے جانے کے اسباب اور عدالتی کاغذات پر لیے جانے والے اپنے دستخطوں کے بارے میں کچھ جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ تو اس نے اب جانا تھا کہ یہ سب اس

”یورآئر! گواہوں کے بیان فنگر پرنٹس کی رپورٹ اور واقعات کے تال میل سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ملزم ندیم احمد ہی شاہدہ میر کے ہاتھ کاٹنے کی مذموم حرکت کا مرتکب ہوا ہے اس لیے میری اس معزز عدالت سے درخواست ہے کہ ملزم کو اس کے جرم کی سخت سے سخت سزا دی جائے۔“ وکیل استغاثہ نے بحث کو سمیٹتے ہوئے پر جوش انداز میں عدالت سے مطالبہ کیا۔

”آنجیکشن می لارڈ! وکیل استغاثہ کا مطالبہ سراسر انصاف کے اصولوں کے منافی ہے۔ اس کیس کی اہم ترین فریق مسماۃ شاہدہ میر ہیں اور ان کی غیر موجودگی میں اس کیس کا فیصلہ ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔ میرا منوکل بے شک حادثے کے وقت جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی کو ثابت نہیں کر سکا لیکن عدالت عالیہ اگر میرے منوکل کے بیان پر غور کرے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ شاہدہ میر کے گھر اس کی مرضی سے اس کے بلاوے پر گیا تھا اور جب وہ وہاں سے لوٹا تو شاہدہ میر بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں تھی۔ اس بات کی گواہی شاہدہ میر خود دے گی اس لیے میری معزز عدالت سے درخواست ہے کہ وہ فاضل وکیل کو شاہدہ میر کو عدالت میں پیش کرنے کا حکم دے تاکہ اس کیس کا درست فیصلہ کیا جاسکے۔“ باہر مرزا نے وکیل استغاثہ کے مطالبے پر اعتراض کیا۔

”عدالت وکیل صفائی کے آنجیکشن کو قبول کرتی ہے اور حکم دیتی ہے کہ اگلی پیش پر مسماۃ شاہدہ میر کو عدالت کے سامنے پیش کیا جائے۔“ جج نے حکم دیتے ہوئے عدالت برخاست ہونے کا اعلان کیا۔

”تمہاری بچائی کو ثابت کرنے کے لیے شاہدہ کی گواہی بہت ضروری ہے لیکن یہ لوگ ہر بار میڈیکل رپورٹ دکھا کر عدالت میں شاہدہ کو پیش کرنے سے معذرت کر لیتے ہیں۔ اگر شاہدہ نے عدالت میں آکر تمہارے حق میں بیان نہیں دیا تو تمہارا کیس یونہی لٹکا رہے گا۔ سارے ثبوت واقعات اور دلائل تمہارے خلاف ہیں۔ تم چوبیس تاریخ کو رات دس بجے سے ایک بجے تک اپنی کہیں بھی موجودگی کو ثابت نہیں کر سکتے۔ اس پر

دیا جائے۔

☆☆☆

”کتنے دن ہو گئے میں تمہیں صحیح سے دیکھ نہیں پایا تم سمجھتی ہوں گی کہ میں جھوٹا ہوں تم سے وعدہ کر کے بھول گیا لیکن دیکھو آج میں تمہارے لیے کتنی ڈھیر ساری چوڑیاں لایا ہوں گلابی اور سنہری چوڑیاں۔ یہ رنگ تمہارے ہاتھوں میں خوب کھلتا ہے۔ لاؤ میں اپنے ہاتھ سے تمہیں یہ چوڑیاں پہناؤں۔“ وہ شاہدہ کا ہاتھ سامنے رکھے اس کے خیالی پیکر نے محو گفتگو تھا۔ اکھل میں محفوظ کیے گئے ہاتھ کا گلابی پن ختم ہو چکا تھا لیکن اس کی نظروں میں پہلے والا ہی اشتیاق تھا۔ وہ ہاتھ کے اوپری حصے سے اس میں کانچ کی چوڑیاں چڑھا رہا تھا۔ چوڑیاں چڑھانے کے بعد اس نے گلابی نیل پالش کی شیشی کھول کر ناخنوں پر لگانا شروع کی۔ ماہرانہ انداز میں اس کام کو مکمل کر کے اس نے بھر پر نظروں سے ہاتھ کا جائزہ لیا۔ اسے اب بھی وہاں کوئی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی وہ ہونٹ سیکنر کر سوچنے لگا اس چیز کے بارے میں جس کے نہ ہونے سے شاہدہ کا ہاتھ اسے نامکمل لگ رہا تھا۔ یکدم ہی اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اسے زمر کی وہ انگلی یاد آگئی تھی۔ جو اس نے پہلی رات شاہدہ کی انگلی سے اتار کر اپنی ٹیبل کی دراز میں رکھی تھی۔ اس نے چابی کی مدد سے دراز کا قفل کھولا اور دراز کا جائزہ لینے لگا۔ دراز میں چاندی کی ایک پازیب پڑی تھی جس کی رنگت یقیناً کبھی سلور رہی ہوگی لیکن اب وہ سیاہ پڑ چکی تھی۔ اس پازیب کی بھی اس کی زندگی میں بہت اہمیت تھی لیکن اس وقت اسے شاہدہ کی انگلی کی تلاش تھی جو اسے دراز میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے قدرے پریشانی کا احساس ہوا لیکن اس نے اپنے اعصاب پر قابو رکھتے ہوئے انگلی کی تلاش جاری رکھی۔ ٹیبل کی ایک ایک دراز چھان لینے کے بعد اس نے کمرے کی باقی اشیاء کو الٹ پلٹ کر انگلی کی تلاش کیا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اب بس ایک آخری جگہ رہ گئی تھی جہاں انگلی کے پائے جانے کا امکان ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنی خصوصی الماری کھول کر اس کا باریک بینی سے جائزہ لینا شروع کیا۔ الماری میں مختلف کیمیکلز کی بوتلیں،

کے ندیم کو مجرم ثابت کر کے سزا دلانے کی کوششوں کا سلسلہ تھا۔ وہ جیسے کسی خواب غفلت سے جاگ کر اپنے بھائیوں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”اباجی! یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ آپ ندیم کو کس بات کی سزا دلوا رہے ہیں۔“

”بیٹا جی! تم ان معاملات میں نہ پڑو۔ میں اور تمہارے بھائی مل کر اس معاملے سے نمٹ لیں گے۔“ عارف میر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے کہا۔

”میرا بولنا بہت ضروری ہے۔ اباجی! ورنہ آپ لوگ کسی بے گناہ کو سزا دلوا دیں گے اور میرا مجرم آزاد گھومتا رہے گا۔“ شاہدہ نے زور دے کر کہا تو وہ سب لوگ اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔

”ندیم صحیح کہتا ہے اباجی! وہ میرے بلانے پر یہاں آیا تھا اور آدھے گھنٹے میں واپس بھی چلا گیا تھا۔ بعد میں جو شخص فقیر کے بھیس میں آیا وہ کون تھا اور اسے مجھ سے کیا دشمنی تھی، میں نہیں جانتی لیکن یہ بات یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ ندیم نہیں تھا۔ وہ کوئی ایسا شخص تھا جسے میری اور ندیم کی محبت سے نفرت تھی اور اس نے اپنی نفرت کا بدلہ مجھے معذور بنا کر اور اس کا الزام ندیم کے سر لگا کر لیا اور اگر اب بھی مجھے حالات کا علم نہیں ہوتا تو وہ شخص اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔“ شاہدہ نے ذرا توقف سے بات دوبارہ شروع کی۔ ”آپ لوگ چاہے ندیم کو بے قصور مانیں یا نہ مانیں لیکن وہ بے قصور ہے اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ میں اگلی پیشی پر عدالت جا کر اس کے حق میں گواہی ضرور دوں گی۔“ شاہدہ ٹھوس لہجے میں کہہ کر وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

”کاشف! وکیل سے کہو اپنی درخواست واپس لے لے ہم یہ کیس ختم کر رہے ہیں اور آصف بیٹا! تم بھی بہو کو میکے سے واپس لے کر آ جاؤ۔ کہنا اس کے بغیر گھر بہت سونا سونا لگتا ہے۔“ عارف میر نے اپنے دونوں بیٹوں کو ہدایات دے کر آنکھیں موند لیں۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اب آرام کرنا چاہ رہے ہیں اس لیے انہیں تنہا چھوڑ

احساس ہوا تو وہ بدک پیچھے ہٹی۔

”معاف کر دینا بی بی! مجھے دھیان نہیں رہا تھا۔“ شاہدہ کے اپنی طرف گھور کر دیکھنے پر اس نے شرمندگی سے کہا۔

”اپنا ہاتھ سامنے کرو۔“ شاہدہ نے حکم دیا تو ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے پشت پر چھپایا ہاتھ آگے کیا۔ اس کے سانولے بے رونق ہاتھ میں زمرود کی خوبصورت انگلی جگمگا رہی تھی۔

”یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟“ شاہدہ نے انگلی سے انگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ جی میرا گھر والا لایا تھا میرے لیے اچھی ہے ناں؟“ ملازمہ نے بتانے کے ساتھ اس کے رائے بھی جانتی چاہی۔

”تمہارے گھر والے کو یہ کہاں سے ملی؟“ شاہدہ نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے سختی سے پوچھا۔

”ملنی کہاں سے ہے جی۔ اس نے آپ خریدی ہوگی۔ اسے بڑا شوق ہے میرے لیے ہار بندے انگلی لانے کا۔“ ملازمہ نے قدرے برامان کر جواب دیا۔

”اس انگلی کی قیمت جانتی ہو؟ یہ کوئی سو پچاس کی چیز نہیں جو تمہارا گھر والا شوق ہی شوق میں تمہیں لا کر دے دے۔“ شاہدہ نے ملازمہ کو گھر کا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ جھپٹ کر اس کی انگلی سے انگلی اتار لے ملازمہ اس کے یوں بگڑنے پر حیران سی کھڑی تھی اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور ناہید نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر اندر جھانکتے ہوئے ملازمہ کو پکارا۔

”شانو! جلدی سے باہر آ، تیرا گھر والا باہر آیا کھڑا ہے کہتا ہے کوئی ضروری کام ہے۔“

”اس کے گھر والے کو یہیں بھیج دیں بھابی!“ ملازمہ کے بجائے شاہدہ نے ناہید کو جواب دیا۔

میڈ۔سنز، آلات جراحی وغیرہ ترتیب سے رکھے ہوئے تھے وہ ایک ایک چیز ہٹا کر انگلی تلاش کرتا رہا تلاش کے دوران اس کے ہاتھ میں شیشے کا ایک بڑا جار آیا جسے دیکھ کر وہ کچھ لمحوں کے لیے اپنا کام بھول گیا، جار میں ٹخنے کے اوپر سے کاٹا گیا ایک نسوانی پاؤں موجود تھا، شاہدہ کے ہاتھ کی طرح اس پاؤں کی خوبصورتی نے بھی کبھی اسے بے حد متاثر کیا تھا اور اس کے حصول کے لیے بھی اس نے بڑی جدوجہد کی تھی۔ اس پاؤں میں پڑی چاندی کی پازیب نج بج کر اسے متوجہ کرتی تھی پازیب کا خیال آتے ہی اسے انگلی کی گمشدگی کا خیال آیا اور وہ جار کو واپس اس کی جگہ رکھ کر انگلی کی تلاش میں مصروف ہو گیا لیکن اس کی یہ تلاش لا حاصل ہی رہی انگلی اسے پورے کمرے میں کہیں نہیں ملی تھی اس کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال پھیل گیا ذرا سی دیر میں وہ نتیجہ اخذ کر چکا تھا کہ انگلی کی گمشدگی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے اس کے علاوہ اس کمرے میں صرف ایک شخص آیا کرتا تھا اس شخص سے باز پرس کے لیے اسے لازماً صبح کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

”تم یہ چوڑیاں اتار کر کام نہیں کر سکتیں۔ شو چا چا کر سر میں درد کر دیا ہے۔“ شاہدہ نے کمرے میں ڈسٹنگ کرتی ملازمہ کو جھنجھلا کر ڈانٹا۔ وہ اس وقت رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق کر رہی تھی۔ اپنا دایاں ہاتھ گنوانے کے بعد اسے ایک بار پھر نئے سرے سے بہت کچھ سیکھنا پڑ رہا تھا۔ اس صورت حال پر وہ بعض اوقات چڑچڑی ہو جاتی تھی اور معمولی باتوں پر جھنجھلانے لگتی تھی۔

”میرے گھر والے کو میرے ہاتھ میں چوڑیاں بہت اچھی لگتی ہیں اس لیے پہنتی ہوں۔ اگر آپ ناراض ہوتی ہیں تو اتار دیتی ہوں۔“ ملازمہ قالین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور چوڑیاں اتارنے کی کوشش کرنے لگی۔

”لیس جی، یہ تو اترتی ہیں نہیں مارے (ہمارے) ہاتھ بھی تو گھر گھر کام کر کے لکڑی کی طرح سخت ہو گئے ہیں۔ ایسا کریں بی بی آپ انہیں اتار دیں۔“ ملازمہ بولتی ہوئی شاہدہ کے قریب آئی اور اپنا ہاتھ اس کے آگے کیا مگر جیسے ہی اسے اپنی غلطی کا

”یہاں! مگر کس لیے؟“ ناہید حیران ہوئی۔

”آپ سمجھیں تو ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔“ شاہدہ کے لہجے میں سنجیدگی کو محسوس کر کے ناہید اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے واپس پلٹ گئی جبکہ ملازمہ کسی انہونی کے خیال سے تھر تھرا کانپ رہی تھی۔

”بہت نخرے ہو گئے ہیں تیرے شانو! باہر آنے کی بجائے صاحب لوگوں کی طرح آرڈر دے کر اندر بلوا رہی ہے۔“ شانو کا شوہر اندر آ کر بنا ادھر ادھر دیکھے اس پر بگڑا تھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟ یہاں بیٹھ جاؤ۔ تمہیں اندر شانو نے نہیں بلوایا ہے۔“ شاہدہ نے اسے ڈپٹا۔

”معاف کیجئے گا بی بی! مجھے معلوم نہیں تھا، جلدی میں آپ کو دیکھ نہیں سکا۔“ اس نے فوراً ہی معذرت کی لیکن بیٹھا نہیں۔

”میں نے تم سے تمہارا نام پوچھا تھا۔“ شاہدہ نے اس کی معذرت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

”جی غفورا نام ہے میرا۔“ اس نے شاہدہ کے سوال کا جواب دیا لیکن غلٹ اس کے ہر انداز سے ظاہر تھی۔

”غفورے! مجھے تم سے اس انگوٹھی کے بارے میں پوچھنا تھا، جو شانو نے اپنی انگلی میں پہن رکھی ہے۔ شانو بتا رہی تھی کہ یہ تم اس کے لیے خرید کر لائے تھے، کہاں سے اور کتنے میں خریدی تھی کیا تم مجھے بتا سکتے ہو؟“ شاہدہ کے پوچھنے پر غفورا گھٹنوں کے بل کارپیٹ پر گر پڑا۔

”یہ سالی انگوٹھی میرے لیے عذاب بن گئی ہے۔ زندگی میں پہلی بار چوری کی تو سارے شہر کو خبر ہو گئی۔ لوگ اتنا کچھ کرتے ہیں کبھی پکڑے نہیں جاتے۔“ وہ بہ آواز بلند بڑبڑا رہا تھا۔

”کہاں سے چرائی تھی تم نے یہ انگوٹھی؟“ شاہدہ نے غلٹ سے پوچھا۔

”جہاں میں کام کرتا ہوں وہاں صفائی کرتے ہوئے فرش پر پڑی ملی تھی۔ مجھے اچھی لگی سوچا اپنی شانو کے لیے لے جاؤں۔ شروع شروع میں ڈرا بھی کہ کہیں صاحب کو معلوم نہ ہو جائے اس لیے بہت دن تک شانو کو دینے کے بجائے اپنے ہی پاس چھپا کر رکھی لیکن جب بہت دنوں تک صاحب نے نہیں پوچھا تو میں سمجھا وہ اسے بھول گئے ہیں مگر آج جیسے ہی میں کام پر پہنچا تو صاحب نے میری گردن پکڑ کر انگوٹھی کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ میں ایک گھنٹے میں انگوٹھی کے ساتھ واپس آنے کا وعدہ کر کے آیا ہوں اور اب آپ نے اس کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کر دی۔“ غفورا رونے والا ہو رہا تھا جبکہ اس کی بیوی شانو آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

”شانو! انگوٹھی اتار کر غفورے کو دے دو۔“ شاہدہ نے ملازمہ کو حکم دیا۔

”یہ لے مر! مجھے چاہیے بھی نہیں ایسی چوری کی چیز۔“ شانو نے غصے سے انگوٹھی اتار کر غفورے کے منہ پر پھینکی۔

”غفورے! تمہارے صاحب کا نام کیا ہے؟“ دونوں میاں بیوی کے معاملے میں دخل دیے بغیر شاہدہ نے غفورے سے پوچھا۔ جو اب غفورے نے جو نام لیا وہ اسے سن کر دنگ رہ گئی۔

”ٹھیک ہے غفورے! تم یہ انگوٹھی لے جا کر اپنے صاحب کو دے دو لیکن خبردار! یہاں جو کچھ ہوا اس کے بارے میں کچھ مت بتانا بلکہ اسے یہ بھی مت بتانا کہ شانو ہمارے گھر کام کرتی ہے۔ تمہاری زبان بند رہے اس لیے ہم شانو کو یہیں اپنے پاس رکھیں گے۔ اگر تم نے ہمارا راز کھولنے کی کوشش کی تو شانو کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ملے گی۔“ شاہدہ بے حد خوفناک لہجے میں غفورے کو دھمکا رہی تھی۔ اس نے ایک چھوٹا سا پسٹل بھی دراز سے نکال کر اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

”اس انگوٹھی کا کیا پتہ ہے سمجھ نہیں آ رہا لیکن اپنی شانو کی خاطر اپن وعدہ کرتا ہے کہ صاحب کو کچھ بھی نہیں بتائے گا۔“ غفورا شاہدہ کی حرکت سے بے حد ڈر گیا تھا اس لیے جھٹ پٹ وعدہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

”منہ بند رکھو گے اسی میں عقل مندی ہوگی ورنہ یاد رکھنا پولیس بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“ شاہدہ نے اس سے باہر نکلنے سے پہلے ایک بار پھر اسے دھمکایا تھا۔

”یہ سب کیا ہے شاہدہ! میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا۔“ بہت دیر سے خاموش تماشائی بنی ناہید نے غفور سے کہنے کے جانے کے بعد شاہدہ سے پوچھا۔

”ابھی بتاتی ہوں بھائی! پہلے آپ اس شانو کی بچی کو کسی کمرے میں بند کر دیں اور ہاں اس کا منہ بھی کسی کپڑے وغیرہ سے بند کر دیجئے گا ورنہ یہ شوچا کر ہمارے لیے مصیبت پیدا کر سکتی ہے۔“ شاہدہ کے کہنے پر ناہید نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے دوپٹے سے شانو کا منہ مضبوطی سے بند کر دیا۔ پستل کی موجودگی کے سبب شانو نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی تھی۔

”اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“ شانو کو اسٹور روم میں بند کر کے آنے کے بعد ناہید نے ٹیلی فون پر نمبر ڈائل کرتی شاہدہ سے بے تابی سے پوچھا۔ اس وقت شاہدہ کے ضعیف اور معذور دادا جان کے سوا کوئی مرد گھر میں نہیں تھا اس پر شاہدہ کا پراسرار رویہ ناہید کو خوفزدہ کر رہا تھا۔

”وہ انگوٹھی جو غفور شانو سے لے کر گیا ہے ندیم نے اس رات میرے کٹ جانے والے ہاتھ میں پہنائی تھی۔“ شاہدہ کا یقیناً اپنے مطلوبہ نمبر سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا اس لیے وہ ریسپور اپنے کان اور کندھے کے درمیان پھنسائے بائیں ہاتھ سے بار بار رری ڈائل کا ٹن دبا رہی تھی۔

”اس کا مطلب ہے تمہارا مجرم غفور سے کا صاحب“ ناہید نے منہ پر ہاتھ رکھتے جملہ ادھورا چھوڑا۔ اس کی آنکھوں میں شدید بے یقینی تھی۔

شاہدہ کو دوسری طرف رتنگ ٹون سنائی دے رہی تھی اس لیے اس نے ناہید کو جواب دینے کے بجائے اپنی توجہ فون کی طرف مبذول کر لی۔

”ہیلو ندیم! میں شاہدہ بول رہی ہوں۔“ ندیم کے کال ریسپور کرتے ہی وہ فوراً

بولی۔

”شاہدہ تم! اچھا ہوا تم نے فون کر لیا۔ میں خود بھی تمہیں فون کر کے ایک اہم بات بتانے والا تھا۔ میرے دوست عامر مرزا کو تو تم جانتی ہو۔ اس کے انکل ایک اخبار میں کرائم رپورٹر ہیں۔ عامر نے ان کے سامنے تمہارے کیس کا ذکر کیا تو انہوں نے دو سال پہلے کا ایک واقعہ سنایا، اس کیس میں بھی لڑکی کو تمہارے طرح بے ہوش کرنے کے بعد اس کا ایک پیر کاٹ لیا گیا تھا۔ تمہارے گھر والوں کی طرح اس لڑکی کے گھر والوں نے بھی بہت کوشش کی مگر مجرم کا پتا نہیں چل سکا۔ واردات کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مجرم ایک ہی شخص ہے۔ میں اور عامر کوشش کر رہے ہیں کہ اس لڑکی کے گھر والوں سے مل کر معلومات حاصل کریں ہو سکتا ہے۔ وہاں سے ہمیں کوئی ایسا کلیو مل جائے کہ ہم مجرم کو بے نقاب کر سکیں۔“ ندیم بہت خوشی سے بتا رہا تھا۔

”اب اس کی ضرورت نہیں رہی ندیم! میں مجرم کا نام جان چکی ہوں۔“ شاہدہ کے سپاٹ لہجے پر ندیم بل بھر کو چپ رہ گیا۔

”کون ہے وہ؟“ بالآخر اس نے پوچھا۔

شاہدہ نے جو نام لیا اسے سن کر ندیم کے پاس مزید کچھ پوچھنے کی گنجائش نہیں

رہی۔

☆☆☆

اس نے گاڑی ٹیلی فون ایکیچنج کے آگے روکی اور سیل فون کے ذریعے مطلوبہ شخص کو اپنی آمد کی اطلاع دے کر انتظار کرنے لگا تھوڑی ہی دیر میں اسے ایک شخص ایکیچنج کی بلڈنگ سے نکلتا دکھائی دیا۔ اس نے ہارن بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”سلام صاحب! اس بار دو دن اوپر لگا دیے۔“

اس شخص نے بائیں چہرے اس سے پوچھا۔

”ہاں کچھ مصروف تھا۔ تم کہو تمام ریکارڈنگز موجود ہیں؟“

اس نے رعونت سے جواب دیتے ہوئے سوال کیا۔

”بالکل جناب! پیر سے آج تک کے سارے ٹپس موجود ہیں۔“

اس نے یقین دہانی کراتے ہوئے اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھمایا۔ جواباً اس نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر اسے دیا جسے پا کر وہ شخص خوشی خوشی سلام کرتا واپس پلٹ گیا۔

اس نے گاڑی اشارت کرنے سے پہلے ایک کیسٹ نکال کر ٹیپ میں لگایا اور گاڑی آگے بڑھا دی، اس کی توجہ سڑک پر رواں دواں ٹریفک کے ساتھ ریکارڈ آوازوں کی طرف بھی تھی اس کی انگلیاں بار بار فارورڈ کا بٹن دبا رہی تھیں وہ صرف شاہدہ میر کی آواز سننے کا متنی تھا۔ اس کیسٹ کو سنتے ہوئے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاہدہ میر نے اس پورے ہفتے بہت کم کسی سے ٹیلی فون پر گفتگو کی تھی۔ گھر کے سامنے پہنچنے تک وہ تقریباً تمام ٹپس سن چکا تھا۔ صرف آج کے دن کی باقی تھی۔ اس نے کیسٹ جیب میں ڈالا اور تالا کھول کر گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر معمول کی طرح خالی تھا۔ غفورا اپنے کام انجام دے کر واپس جا چکا تھا۔ اس نے اپنے بیڈ روم میں جا کر جوتے اتارے اور وارڈ روم کھول کر کپڑے سلیکٹ کرنے لگا وہ کھانے سے پہلے نہا کر فریش ہونا چاہتا تھا کپڑے نکال کر جسم پر پہنی شرٹ اتارنے کے لیے اس نے بٹن کھولنے شروع کیا تو اس کی توجہ جیب میں رکھی کیسٹ کی طرف ہوئی۔ اس نے کیسٹ جیب سے نکال کر ٹیپ ریکارڈر میں لگایا وہ نہانے سے پہلے یہ آخری ٹیپ بھی سن لینا چاہتا تھا۔ شروع کی تین چار کالز کاشف میر اور آصف میر کی کاروباری نوعیت کی تھیں۔ کیسٹ فارورڈ کرنے ہی لگا تھا کہ شاہدہ میر کی آواز سن کر چونک گیا وہ ندیم سے بات کر رہی تھی۔ وہ غور سے اس کی اور ندیم کی گفتگو سننے لگا ندیم نے شاہدہ پر جو انکشاف کیا وہ بہت سنسنی خیز تھا اسے حیرت تھی کہ کس طرح پاؤں کاٹنے والا معاملہ ندیم کے علم میں آیا لیکن پھر جو انکشاف شاہدہ میر نے کیا اس نے اسے اچھل کر کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ غفورے سے انگوٹھی واپس حاصل کرنے کے بعد اسے دو چار تھپڑ مار کر مطمئن ہو گیا تھا لیکن اب پتا چلا تھا کہ غفورے کی غلطی اس کے گلے کا پھندا بننے جا رہی ہے۔ وہ تیزی سے اپنے بچاؤ کی ترکیب سوچنے لگا سب سے ضروری کام اپنے خلاف تمام ثبوت کو مٹانا تھا، اس نے اپنی

خصوصی الماری کا قفل کھول کر اس میں سے جار نکال کر باہر رکھے شروع کیے وہ جلد از جلد ان سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

”اب یہ ساری بھاگ دوڑ بیکار ہے۔ گیم تمہارے ہاتھوں سے نکل چکا۔“ کمرے میں گونجنے والی آواز نے اسے اچھل کر مڑنے پر مجبور کیا تھا۔ ندیم ریوالور لیے اس کے پیچھے کھڑا تھا اس کے عقب میں ہاتھ روم کا دروازہ کھلا تھا یقیناً وہ اس کی غیر موجودگی میں وہاں آ کر چھپ گیا تھا۔

”تم وہ شخص ہو جس پر ہم میں سے کوئی شخص شک کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تم نے اتنی چالاکی سے سارا کھیل کھیلا کہ تم اس گیم میں کہیں نظر ہی نہیں آئے تمہارا پکڑا جانا محض ایک اتفاق ہے۔ شاہدہ کو تحفہ دی گئی انگوٹھی تمہیں پھسانے کا سبب بن گئی۔“

ندیم کے کہنے پر وہ مسکرایا اور اطمینان سے چلتا ہوا اپنے بیڈ پر جا بیٹھا۔

”تم سمجھتے ہو کہ تم سا اناڑی محض ایک ریوالور کے بل بوتے پر مجھ پر قابو پاسکتا ہے۔“

”نہیں میں تمہاری طرح خوش فہم نہیں ہوں۔ میں مکمل انتظام کے ساتھ یہاں آیا ہوں اسپیشل کرائم برانچ کے بندے تمہارے گھر کی چھت پر اور ارد گرد موجود ہیں۔ تم نے فرار ہونے کی کوشش کی تو کامیاب نہیں ہو سکو گے۔“

ندیم نے اسے صورت حال کا احساس دلانا چاہا لیکن اس کے اطمینان میں پھر بھی فرق نہیں آیا۔ وہ سامنے پڑے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر لائٹر کی مدد سے سلگاتے ہوئے بولا۔

”جب کوئی جانے کی ٹھان لے تو کوئی بھی اسے نہیں روک سکتا۔“

”میرے خیال میں تمہیں اب صرف جیل جانے کے بارے میں سوچنا چاہیے، ویسے تمہیں زیادہ فرق نہیں پڑے گا بس اتنا ہے کہ پہلے تم وہاں لائے جانے والوں پر مشق ستم کرتے تھے اور اب تمہارے بھائی بند تمہاری پھینٹی لگایا کریں گے۔“

سکندر علی کے سامنے زبان نہ کھولے ورنہ سکندر علی ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ہوشیار ہو جاتا۔“

ندیم نے شاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے فخر سے کہا۔
 ”مگر سوال وہی ہے کہ سکندر علی کے جرم کا سبب کیا تھا۔ لڑکیوں کے اعضا کاٹ کر انہیں اپنے پاس محفوظ کرنے سے اسے کیا ملتا تھا۔“
 ناہید نے الجھ کر پوچھا۔

”یہ ایک لمبی کہانی ہے جس کے تانے بانے سکندر علی کی زندگی کا جائزہ لینے پر سلجھتے ہیں۔ سکندر علی کے والدین اس کے بچپن میں ایک حادثے میں مر گئے تھے، وہ اپنے بل بوتے پر اپنے قدموں پر کھڑا ہوا۔ اس نے فارمی میں گریجویشن کیا لیکن اس فیلڈ میں طبع آزمائی کرنے کے بجائے پولیس میں آ گیا۔ شاید ماں باپ کی عدم موجودگی میں اس نے جو غیر محفوظ سی زندگی گزار تھی وہ اس کے ازالے کے لیے پاور فل بننا چاہتا تھا مگر اس کی بد قسمتی کہ اپنی جاب کے ابتدائی عرصے میں ہی ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ اس حادثے میں اس کی ہڈیاں تو سلامت رہیں لیکن اس کا آدھا چہرہ جھلس گیا اور اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ ایکسٹنٹ میں اس کے نازک اعضا متاثر ہوئے سکندر علی کے سامان میں سے ملنے والی میڈیکل رپورٹ کے مطابق وہ اپنا اصل جوہر کھو چکا تھا۔ اور یہیں سے اس کی نفسیاتی بیماری کا آغاز ہوا۔ پوری زندگی محرومیوں میں گزارنے کے بعد وہ اتنی بڑی محرومی برداشت نہیں کر پار ہا تھا۔ اس کی عمر کا فطری تقاضا تھا کہ وہ کسی صنف نازک کا ساتھ چاہتا تھا۔ اول تو اس کی بد صورتی کی وجہ سے کوئی لڑکی اس کی طرف راغب نہیں ہوتی تھی۔ دوسرے اسے خود بھی معلوم تھا کہ وہ کسی لڑکی کا شریک حیات بننے کا اہل نہیں ہے اس شش و پنج کے عالم میں اس کی زندگی میں شائستہ آئی شائستہ میراثیوں کے خاندان سے تعلق رکھی تھی۔ اسے کلاسیکل ڈانس میں مہارت حاصل تھی، سکندر علی اس کا ڈانس دیکھنے شوق سے جاتا تھا۔ شائستہ کے ڈانس کے دوران سکندر علی کی نظریں اس کے خوبصورت پیروں پر جمی رہتی تھیں۔ ان پیروں کی خوبصورتی نے سکندر علی کے جذبات کو

دیے وہ بڑا دلچسپ منظر ہو گا جب انسپکٹر سکندر علی جیل کی روٹیاں کھائے گا اور وہ بھی اگر قسمت سے قید کی سزا ملے تب ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو محصوم لڑکیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرنے کے جرم میں تمہیں سیدھا پھانسی کے پھندے پر ہی لٹکا دیا جائے۔“

ندیم سکندر علی کے اطمینان پر چڑ کر بولا تھا۔
 ”مجھے افسوس ہے دوست! تمہارے یہ سارے خواب خواب ہی رہیں گے۔“
 سکندر علی نے دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ ندیم کو جواب دیا اور یکدم ہی اپنی سیٹ میں اڑسا ہوار یو اور کھینچ کر نکال لیا۔
 ”اے خبردار! اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو جج نہیں سکو گے۔“
 ندیم نے چلا کر اسے روکنا چاہا۔

”میں بچتا چاہتا بھی نہیں۔“
 سکندر علی نے ہاتھ میں پکڑے ریو اور کی نال اپنی کینٹی پر رکھتے ہی ٹریگر دبا دیا۔ ندیم بے بس سا کھڑا اسے قانون کی گرفت سے بچ کر جاتا دیکھتا رہا۔ کرائم برانچ کے افراد گولی چلنے کی آواز پر کمرے میں آئے تو سکندر علی وہاں نہیں تھا۔

☆☆☆

”سکندر علی نے یہ سب کیوں کیا میری سمجھ سے باہر ہے۔“
 کاشف میرا اپنے گھر کے ہال کمرے میں موجود افراد کی طرف دیکھتے ہوئے پریشانی سے بولا سکندر علی اس کے گھر تک اس کے حوالے سے پہنچا تھا اس لیے کاشف قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی نادم تھا۔

”میں نے عامر کے انکل اور ڈیڈی کے ساتھ مل کر اس سلسلے میں بہت اچھی طرح چھان بین کی ہے لیکن اصل کارنامہ شاہدہ کا تھا، اگر وہ شانو کے ہاتھ میں موجود انگوٹھی کو پہنچانے کے بعد عقل مندی سے کام نہ لیتی تو سکندر علی فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا۔ شاہدہ نے نقلی پستل کے زور پر شانو کو یہاں روک کر غصے کو مجبور کر دیا کہ وہ

نے تمہیں کڑی سزا دلوانے کی ٹھان لی تھی۔“

آصف میر نے گہرا سانس لیتے ہوئے شکر ادا کیا۔

”مگر تمہیں اتنی تفصیل سے ہر بات کیسے معلوم ہوئی؟“

ناہید نے اپنے بھائی کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”بہت کچھ تو سکندر علی کے حالات اور ایک کے بعد ایک ملنے والے ثبوت

سے میں نے خود اخذ کر لیا تھا لیکن اصل معلومات سکندر کی ڈائری سے ملیں۔ وہ جس

تنہائی کا شکار تھا اسے اپنی باتیں اور احساسات شہیر کرنے کے لیے ڈائری کا سہارا لینا پڑتا

تھا۔ اس کی ڈائری نے ہر سوال کا جواب دے دیا۔“

ندیم نے بتایا۔

”جو کچھ بھی ہو سکندر علی کے جنون اور اندھی خواہش نے دو جیتی جاگتی لڑکیوں

کی زندگی تباہ کر دی۔“

عارف میر نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے آزر دگی سے کہا۔

”اگر آپ برانہ مانیں بھائی صاحب تو میں آج بھی اپنے ندیم کے لیے شاہدہ

کی طلب گار ہوں۔“

بہت دیر سے خاموش بیٹھی ندیم کی والدہ نے اچانک ہی کہا تو عارف میر

سمیت ان کے دونوں بیٹے بھی حیران رہ گئے۔

”اب حالات بالکل مختلف ہیں بہن جی اب ہم انکار کرنے کی پوزیشن میں

نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ پہلے کویم سے پوچھ لیں، کیا وہ اب بھی شاہدہ

کے لیے تیار ہے۔“

عارف میر کی آواز پر جھکا ہوا تھا۔

میں ندیم کی خواہش پر آپ کے سامنے دوبارہ سوال کرنے کی جرأت کر رہی

ہوں۔“

ندیم کی والدہ نے اپنے بیٹے کو محبت سے دیکھا۔

اتنا بھڑکایا کہ وہ شائستہ کے حصول کے لیے دیوانہ ہو گیا مگر وہ جانتا تھا کہ اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی اس لیے اس نے اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے ایک انوکھا طریقہ اپنایا اس نے موقع ملتے ہی شائستہ کا پاؤں کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ فارمیسی میں گریجویٹ ہونے کی وجہ سے وہ ایسے بہت سے طریقوں سے واقف تھا۔ اس کے علاوہ اسے پولیس ٹریننگ کے دوران فرسٹ ایڈ کی تربیت بھی دی گئی تھی۔ اسے خود بھی میڈیکل میں خاصی دلچسپی تھی اس کا اندازہ اس کے گھر سے ملنے والی میڈیکل کی کتابوں کو دیکھ کر ہوتا ہے بہر حال شائستہ کا پاؤں حاصل کر کے اس نے اپنی زخمی انا کی تسکین کا سامان کر لیا۔ شائستہ اور اس کے گھر والے مجرم ہاتھ نہ آنے پر روپیٹ کر خاموش ہو گئے۔ سکندر علی ٹرانسفر ہو کر یہاں آ گیا جہاں اس کی کاشف بھائی سے دوستی ہو گئی۔“

”اور پھر اس نے شاہدہ کو اپنے اگلے شکار کے طور پر منتخب کر لیا۔ اوہ میرے

خدا! میں کبھی جان ہی نہیں سکا کہ میں دوست کی صورت میں اپنی آستین میں زہریلا

سانپ پال رہا ہوں۔“

کاشف میر نے ندیم کی بات درمیان سے کاٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں اس کی نظر شاہدہ پر آصف بھائی کی شادی میں پڑی۔ وہ خاموشی سے

اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس دوران اسے میرے اور شاہدہ کے تعلق کا اندازہ ہوا۔ وہ ایک

نہایت شاطر شخص تھا وہ جانتا تھا کہ شاہدہ کا تنہا اپنے گھر سے باہر آنا جانا نہیں اس لیے

اس نے ہم دونوں کی محبت سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے آپ کی ٹیلی فون پر آبرویشن

لگوا دی۔ ایک پیچ میں اس کا خاص آدمی موجود تھا جو اسے خاموشی سے آپ کے گھر کے

فون ریکارڈ کر کے پہنچاتا تھا اور آخر کار ایک روز اسے وہ موقع مل گیا جس کی اسے تلاش

تھی۔ اس نے میری اور شاہدہ کی گفتگو سن کر وہ منصوبہ بنایا تھا جس سے آپ سب ہی

واقف ہیں۔“

”واقعی وہ ایک شاطر انسان تھا جس نے جرم خود کیا اور الزام تمہارے سر

ڈالنے کی کوشش کی۔ اگر اس وقت شاہدہ ہمت کر کے ہمیں اصلیت نہ بتاتی تو ہم لوگوں

”پھر بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مجھے تو پہلے بھی ندیم میں کوئی خامی نہیں نظر آئی تھی صرف وٹے سٹے کا رشتہ کرتے گھبراتا تھا کہ میری بے ماں کی اکلوتی بچی رشتوں کی پیچیدگیوں میں الجھ کر نہ رہ جائے لیکن آپ نے ان حالات میں شاہدہ کا ہاتھ مانگ کر ثابت کر دیا کہ آپ ایک عظیم خاتون ہیں اور میری بچی آپ کے گھر سدا سکھی رہے گی۔“

عارف میر کے ہامی بھرتے ہی کمرے کی فضا مبارک سلامت کے شور۔۔۔ گونجنے لگی۔ شاہدہ میر نے سب سے نظریں بچا کر شرکیں نظروں سے ندیم کی طرف دیکھا۔ اب اسے اپنی محرومی کا کوئی شکوہ نہیں تھا کیونکہ ندیم کی نگاہیں اسے یقین دلا رہی تھیں۔ کہ وہ ہمیشہ اس کا بازو بن کر رہے گا۔

☆☆☆

لگوادی۔ ایجنج میں اس فون ریکارڈ کر کے پہنچاتا تھا اور آخر کار ایک روہ تھی۔ اس نے میری اور شاہدہ کی گفتگو سن کر وہ منصوبہ بنایا تھا واقف ہیں۔“

”واقعی وہ ایک شاطر انسان تھا جس نے جرم خود کیا اور الزام تمہارے سر ڈالنے کی کوشش کی۔ اگر اس وقت شاہدہ ہمت کر کے ہمیں اصلیت نہ بتاتی تو ہم لوگوں